#

Done

Cat by Th

انا مدینة العلم و علی بابها

OSMANIA UNIVERSITY

جامعۂ عثمانیہ

مبادی عمرانیات

سلسلۂ نصابیات علمیہ جامعۂ عثمانیہ

مبادی عمرانیات

تصنیف

فرینک ڈبلیو بلیکمار، پی ایچ۔ڈی۔

ترجمہ

ڈاکٹر سیّد عابد حسین، پی۔ایچ۔ڈی۔

۱۳۵۱ھ م ۱۳۴۱ف م ۱۹۳۲ء

دار الطبع جامعۂ عثمانیہ سرکار عالی حیدرآباد دکن

فہرست مضامین

"مبادی عمرانیات"

مضامین	ابواب

حصہ اوّل

صفحات ۱ تا ۵۴

عمرانیات کی ماہیت اور اہمیت

حصہ دوم

صفحات ۵۵ تا ۱۸۲

معاشرے کی ارتقاء

ابواب	مضامین
باب اوّل	معاشرے کے مقاصد
باب دوم	حکومت کے نصب العین
باب سوم	جبری نظم و ضبط
باب چہارم	تعلیمی طریقے
باب پنجم	معاشرتی عدم مساوات
باب ششم	انصاف پر مبنی حکومت
باب ہفتم	ترقی کا معیار

حصۂ پنجم

صفحات ۲۸۷ تا ۳۴۸

معاشرتی مرضیات

حصہ ششم

صفحات ۳۴۹ تا ۳۶۰

عمرانی تحقیقات کے منہاج

حصۂ اول

عمرانیات کی ماہیت اور اہمیت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب اوّل

عام اجتماعی زندگی

۱۔ فرد کی وابستگی جماعت سے

دنیا میں فرد جماعت سے الگ ہو کر کچھ نہیں کر سکتا گو ہر ذی شعور اپنے افعال واعمال سے ظاہر یہی کرتا ہے کہ مجھے اپنی زندگی پر پورا اختیار ہے اور اپنی مرضی سے جو چاہوں کر سکتا ہوں۔ اُس کا ہر فعل اِس خیال پر مبنی ہوتا ہے کہ میں فاعلِ مختار ہوں اور دوسروں کے جذبات وخیالات کا لحاظ کئے بغیر اپنے مقاصد حاصل کر سکتا ہوں۔ وہ اپنے دل میں سمجھتا ہے میرا کام بس اتنا ہے کہ اگر مادی مشکلات پیش آئیں تو انھیں دُور کردوں۔ ان کو دور کرنے کی قوت ہی میری کامیابی کا معیار ہے۔ اسی طرح اگر میرے بنی نوع میری تدبیروں میں رکاوٹ ڈالنا چاہیں تو انھیں راہ سے ہٹادوں۔ یہ ہو گیا تو پھر میرا مقصد پورا ہونے میں کوئی دقت نہیں۔ انسان کا نفسِ ذاتی جو اپنا مستقل وجود رکھتا ہے اور اثباتِ خودی کے درپے رہتا ہے، اسے ہمیشہ یہ سبق پڑھایا کرتا ہے کہ تو جو طرزِ عمل اختیار کر محض اپنی رائے سے کر۔ انسان جب سوچتا ہے یہی سوچتا ہے "میں یہ کروں یا وہ کروں" یا "میں فلاں کام کروں گا" یا "مجھے سب سے بڑھ کر فلاں چیز سے نفع پہنچے گا" گویا اُسکی زندگی

کے کل معاملات کا آخری فیصلہ اُسی کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ نفس شعوری مدتوں کی عادت یا قدیم خیالات کی بنا پر اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے یا جان بوجھ کر جھوٹے سچے دعوے کرتا ہے، کیونکہ سچ پوچھیے تو کوئی شخص بھی ایسا نہیں جس کے افعال دوسروں کے اثرات سے آزاد ہوں۔ جہاں دیکھیے یہی نظر آتا ہے کہ اجتماعی زندگی انفرادی عمل کی حد بندی کرتی ہے اور اس پر بہت کچھ اثر ڈالتی ہے۔ حکومت ہو یا مذہب، یا صنعت وحرفت، یا تعلیم، یا تدبیر منزل غرض جدید زندگی کے ہر شعبے میں لوگ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کرتے ہیں۔ وہ مخصوص اغراض کے لیئے اتحادِ عمل، باہمی شرکت اور تنظیم سے کام لیتے ہیں اور کوئی شخص محض اپنی ذات کے لیئے زندگی بسر نہیں کرتا۔ اسی سعی اور عمل کے اتحاد سے معاشرہ بنتا ہے۔

۲۔ معاشرتی اتحادِ عمل کی مختلف صورتیں

اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہو کہ میں اپنا کام خود چلاتا ہوں دوسروں کو اس میں کوئی دخل نہیں تو اُسے چاہیئے کہ کبھی بیٹھ کر سوچے کہ میرے کاروبار میں کن کن لوگوں کی بلاواسطہ مدد کی ضرورت پڑتی ہے۔ مثلاً اُس کا یہ دعوے ہے کہ میں ایک آزاد کسان ہوں مگر اصل میں وہ اپنے اوزاروں کے لیئے کان کھودنے والوں، اوزار بنانے والوں، سوداگروں اور باربرداری کا اہتمام کرنے والوں کا محتاج ہے۔ اپنے گھربار کی حفاظت اپنے بچوں کی تعلیم، سڑکوں کی تعمیر اور نظامِ معاشرت کی تشکیل کے لیئے دوسرے شہریوں کے اتحادِ عمل کا پابند ہے۔ اُس کے گھر کا ساز وسامان اور اُس کا لباس زیادہ تر دوسروں کی محنت کا نتیجہ ہے۔ اُس کی ساری زائد دولت کا دارومدار اِس پر ہے کہ اُس کی بنائی ہوئی چیزوں کو دوسرے استعمال کریں۔ اگر وہ یہ کہے کہ میرا مذہب جو سب سے زیادہ قابلِ احترام قوتِ محرکہ ہے، ایسی چیز ہے جو صرف میری ذات سے تعلق رکھتی ہے، تو یہاں بھی یہ نظر آتا ہے کہ وہ دوسروں کے ساتھ مل کر عبادت گاہ تعمیر کرتا ہے اور چندہ کر کے دینیات کا معلم رکھتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ عبادت

بھی جماعت کے ساتھ کرتا ہے۔ وہ اُن عقائد و رسوم کا پابند ہوتا ہے جو خود اُس کے وضع کیے ہوئے نہیں ہیں۔ ان کی تشکیل بلاواسطہ یا بالواسطہ ان ہزاروں لاکھوں آدمیوں کے ہاتھوں ہوئی ہے جو اُس سے پہلے گزر چکے ہیں خود اُسے اُن کی نشو و نما میں کوئی دخل نہیں۔

اگر وہ دعوے کرے کہ "میں اپنی تعلیم خود کروں گا" تو اِس کی حقیقت بھی ظاہر ہو جاتی ہے۔ پہلے ہی دن سے اُسے وہ کتابیں پڑھنا پڑتی ہیں جو دوسروں کی لکھی ہوئی ہیں، جن میں بنی نوع انسان کا صدیوں کا علم محفوظ ہے یا وہ مدرسے میں داخل ہوتا ہے جو ہزاروں آدمیوں کے چندے سے چلتا ہے۔ اِس معاملے میں انسان کا عزم، ارادہ، نفسِ ذاتی بڑی اہمیت رکھتا ہے، مگر وہ ہر طرف سے اجتماعی زندگی سے گھرا ہوا ہے۔ جدھر دیکھیئے جلی حروف میں لکھا ہے "کھلے میدان سے الگ رہو، اُسی راہ پر چلو جس پر سب چلتے ہیں" جہاں نظر ڈالیئے یہ تنبیہ موجود ہے "اگر تم اجتماعی زندگی کے حقوق سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہو تو اُس کے فرائض ادا کرو"۔

فرض کیجئے مغربی امریکہ کا ایک کسان شکاگو[1] میں کسی شخص کا مقروض ہے۔ اب وہ یہ نوکرتا نہیں کہ اپنی محنت کی پیداوار یعنی غلہ یا گائے کا گوشت پیٹھ پر لاد کر پیدل شکاگو جائے اور قرضخواہ کے حوالے کرے بلکہ وہ اپنا غلہ یا اپنے مویشی کسی دوسرے کے ہاتھ بیچتا ہے اور اُس کے معاوضے میں زرِ قبول کرتا ہے جو ہزاروں آدمیوں کے متحدہ عمل سے حاصل کیا گیا ہے۔ اب اِس کے بعد قرض ادا کرنے کی ایک صورت یہ ہے کہ وہ سونے کے سکے لے کر ریل پر جسے دوسروں نے بنایا ہے اور دوسرے چلاتے ہیں، شکاگو جائے۔ مگر وہ اِس کی بجائے دوسری صورت اختیار کرتا ہے یعنی ایک بینک میں جاتا ہے، جو دوسروں کے اتحادِ عمل سے چلتا ہے، وہاں سے ہنڈی خریدتا ہے اور اسے ایکسپریس کمپنی یا ڈاکخانے کے ذریعے بھیجتا ہے اور یہ دونوں اجتماعی اتحادِ عمل

[1] Chicago ۱ھ

کی مثالیں ہیں۔ غرض جدھر دیکھئے انفرادی نفس کو ایک برتر نفس سے سابقہ پڑتا ہے جس پر اُسے کوئی ذاتی اختیار نہیں۔ یوں کہنے کو وہ آزاد ہو مگر اصل میں وہی کرتا ہے جو دوسرے کرتے ہیں، وہی سوچتا ہے جو دوسرے سوچتے ہیں۔ اُسے دوسروں کے ساتھ شعوری یا غیر شعوری طور پر زندگی کے کاموں میں تعاون کرنا پڑتا ہے اور اکثر ایک نفسِ عامہ کے آگے جو معاشرہ کہلاتا ہے سر جھکانا پڑتا ہے یا اُس کے احکام کی تعمیل کرنی پڑتی ہے۔ وہ اُس سے بچنا چاہے تو سوائے اس کے کوئی صورت نہیں کہ کوئی غیر آباد جزیرہ ڈھونڈے اور دوسروں کے بنائے ہوئے جہازوں میں جاکر اپنی عمرِ طبیعی کا بقیہ حصہ تنہائی میں بسر کرے۔ اس کا انجام یہ ہوگا کہ اُس کی زندگی اور اُس کا کام اُس کے مرنے کے ساتھ ہی ختم ہو جائے گا۔

۳۔ معاشرے کی خصوصیات

جسمِ مادّی کو ہم اُس کے طبعی خواص اور صفات سے پہچانتے ہیں اور جسمِ حیوانی کو اُس کے عمل سے۔ مثلاً ہم درخت یا گھوڑے کی شکل اور نشو و نما سے اتنی اچھی طرح واقف ہوتے ہیں کہ اُسے دوسرے اجسام سے تمیز کرنے کے لئے کچھ بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ مگر جسمِ اجتماعی کا پہچاننا اِس سے زیادہ دشوار ہے کیونکہ گو ہم اُس کے وجود کو محسوس کرتے ہیں مگر اُس کی امتیازی خصوصیات یا اس کے اعمال کا صحیح تعیّن کرنا آسان نہیں ہے۔ لیکن اِس کے بغیر علمی حیثیت سے معاشرے کا مفہوم ذہن میں نہیں آسکتا۔ اُس لئے یہ سوال بہت اہم ہے کہ معاشرہ کیونکر پہچانا جاسکتا ہے؟ آیا اپنی صورت سے اپنے وظائف سے یا دونوں چیزوں سے یا یہ محض ایک مجردِ عام اصطلاح ہے جو انسانوں کے بہت سے اور گونا گوں مشترکہ افعال کو ظاہر کرنے کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ لوگوں کی ایک منظم جماعت کی سب سے نمایاں خصوصیّات منظم سیاسی جماعت میں، جو ریاست کہلاتی ہے پائی جاتی ہیں۔ ہم ریاست کو اُس کے مختلف اداروں کی ہیئت اور اُس کے وظائف سے پہچانتے ہیں

مجالس انتظامی، مجالس وضع قوانین اور عدالتیں سیاسی نظم وضبط کے خاص خاص وظائف کو پورا کرتی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک بہت سے افراد کی نمائندگی کرتی ہے اور یہ سب مل کر گویا ملک کے تمام باشندوں کی قائم مقام ہوتی ہیں اور انھیں مدافعت، انصاف اور ترقی کی خاطر ایک ایسی جماعت میں متحد کر دیتی ہیں جس کے تمام اجزا ایک دوسرے سے وابستہ ہوتے ہیں۔ امین بلدیہ، پولس کانسٹیبل اور مجسٹریٹ سے لیکر مجلسِ وضعِ قوانین، مجلس وزرا اور ممبر مجلس عدالت العالیہ تک افراد کا سلسلہ نظر آتا ہے جن کے باہمی تعلقات معین ہیں۔ یہ سب لوگ کسی فردِ واحد کی مرضی کے پابند نہیں بلکہ جمہور کے ارادۂ اجتماعی کی تعمیل کرتے ہیں۔ اُن کے طرزِ عمل کی باقاعدگی اور تنظیم کی ہمہ گیری سے اِس بات کا قطعی ثبوت ملتا ہے کہ ساری جماعت مُعیّنہ رابطوں میں مربوط ہے اور اس کے اجزا ایک دوسرے کے پابند ہیں۔

۴۔ معاشی زندگی

جب سے انسانی معاشرے کی بنیاد پڑی ہے انسان ہمیشہ غذا، امن اور مادّی راحت کی تلاش میں دوسروں سے تعاون کرتا آیا ہے۔ اِسی کو معاشی زندگی کہتے ہیں۔ شاید معاشرے کے اتحادِ عمل کا اِس سے زیادہ محسوس ثبوت کہیں نہیں ملتا جو مادی ضرورتوں کو پورا کرنے کی مُنظّم کوششوں میں پایا جاتا ہے۔ ایک طرف انسانوں کی جماعتیں زراعت میں مشغول نظر آتی ہیں جو دوسری جماعتوں کی مدد کرتی ہیں اور اُن سے مدد پاتی ہیں۔ دوسری طرف مادّی اشیا بڑے پیمانے پر تیار کرنے کے لئے بڑی بڑی صنعتی شرکتیں ہیں۔ ایک طرف آدمیوں کی اور مال کی حمل ونقل کے لئے وسیع ادارے ہیں، ایک طرف عظیم الشان تجارتی کوٹھیاں اور بینک ہیں۔ اُن سے متعلق اور اُن کی بدولت وجود میں آنے والی مزدوروں کی انجمنیں ہیں جو انھوں نے اپنے مشترکہ اغراض کے تحفظ اور اپنی مشترکہ فلاح کے لئے قائم کی ہیں۔ ایسی صورت میں وہ فرد جو جماعت سے الگ ہوکر کسی کام کی کوشش کرتا ہے محض بےکس اور بےبس ہے اور جوں جوں صنعتی

تنظیم مکمل ہوتی جاتی ہے اُس کی یہ بے بسی بڑھتی جاتی ہے۔ جو شخص بے روزگار ہوا ہے صنعتی زندگی کی تنظیم، مختلف جماعتوں کی باہمی پابندی، فرد کی کل جماعت سے وابستگی فوراً محسوس ہوتی ہے۔ اگر ہم انسانوں کے اجتماعی اعمال پر ایک اور نظر ڈالیں تو یہ دیکھیں گے کہ بہت سے افراد اپنی خوشی سے مل جل کر مخصوص مقاصد کے لئے انجمنیں قائم کرتے ہیں۔ انہیں اداروں سے مجموعی معاشرے کی ہیئت اور ساخت کا تعیّن ہوتا ہے اور اِن کے مخصوص دائرہ ہائے عمل وجود میں آتے ہیں بمثال کے طور پر گرجے کی انجمنوں، دینی برادریوں، خیراتی جماعتوں اور سوشل کلب وغیرہ کو دیکھئے۔ اِن کا تعلق مجموعی معاشرے سے اِسقدر واضح اور متعین نہیں ہوتا جتنا سیاسی اداروں کا ہوتا ہے اور ان کے ماتحت کل جماعت کا محض ایک جزو ہوتا ہے۔ پھر بھی اِن میں سے ہر ایک جماعت اپنا مخصوص کام انجام دیتی ہے، بہت سے انسانوں کی نمائندگی کرتی ہے جو مِل جل کر سعی و عمل اور غور و فکر کیا کرتے ہیں۔

۵۔ تعلیمی انجمنیں

تعلیم کے عمل کو نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود اور ترقی سے بہت گہرا تعلق ہے۔ ہمارے مدارس کا نظام ابتدائی منزل سے لے کر جامعہ تک معاشرے کی حیاتِ نامیہ کا ایک جداگانہ شعبہ ہے۔ اِس نظام کا مقصد یہ ہے کہ بچے کو ایک علیحدہ فرد کی حیثیت سے نہیں بلکہ معاشرے کے رکن کی حیثیت سے تعلیم دی جائے۔ اِس نظام کی مالی امداد وہ سب شہری کرتے ہیں جو صاحبِ جائداد ہیں بلکہ بعض صورتوں میں تو جو کوئی ذراسی آمدنی بھی رکھتا ہے وہ اِس کی امداد میں حصہ لیتا ہے۔ بعض بڑے اوقاف وغیرہ کے غیر سرکاری مدارس بھی ہیں جن کا انتظام ایسی انجمنیں کرتی ہیں جن کی رکنیت اختیاری ہے۔ ان کا دائرۂ اثر اس قدر وسیع نہیں جتنا مدارسِ عامہ کا ہے مگر ان کا وجود بھی منظم جماعت کے لئے ضروری ہے اور ان میں اور کل معاشرے کی زندگی میں مضبوط رابطے قائم ہیں۔ اِن کے علاوہ علمی انجمنیں ہیں جن کا اصل مقصد نوعِ انسانی کی فلاح

وبہبودھ ہے لیکن وہ اجتماعی نظم وضبط اور اجتماعی اتحاد میں بھی بہت مفید قوتیں ثابت ہوتی ہیں۔ یہ انجمنیں بلکہ کل تعلیمی ادارے معاشرے کی تشکیل کرتے ہیں، اُس کے اندر عصبیت پیدا کرتے ہیں اور اُسے موجودہ ضرورتوں اور آیندہ ترقیوں کی تدبیریں سوچنے میں مدد دیتے ہیں۔

۶۔ ذرائع خبررسانی

تعلیمی، سیاسی، مذہبی، معاشی اور معاشرتی اِداروں کے ہم رنگ اور ان سب کو تقویت پہنچانے والے اور ان کی مدد کرنے والے مختلف ذرائع خبررسانی مثلاً ڈاک، ٹیلیفون اور تار ہیں۔ انھوں نے افراد کو ایک دوسرے سے قریب کر دیا ہے اور اُن پر پوری طرح ثابت کر دیا ہے کہ وہ ہر روز بلکہ ہر گھڑی ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ جدید زندگی کی کسی اور چیز نے معاشرے کی جد وجہد کو اتنا فروغ نہیں دیا اور اغراض ومقاصد کے اتحاد، اور خیالی احساس اور ارادے کے اشتراک میں اتنا حصہ نہیں لیا جتنا اِن خبررسانی کے ذریعوں نے۔

۷۔ خاندان

اِس زمرے میں گھریلو زندگی کا ذکر بھی لازمی ہے۔ یہی وہ مرکز ہے جس سے معاشرتی زندگی کی تمام تحریکیں اٹھتی ہیں۔ اسی پر نسل انسانی کی بقا کا دار و مدار ہے۔ یہ بجائے خود ایک چھوٹی سی معاشرتی دنیا ہے جس میں سیاست، صنعت، تعلیم، مذہب اور خدمتِ خلق کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ یہ تاریخی ارتقا کی منزلوں سے گزر چکا ہے اور نظامِ اجتماعی کے واضح اور مستحکم ضوابط کے سلسلے میں مربوط ہے۔ یہ سب سے مکمل اور نہایت منظم جماعت ہے اور زندگی کے تمام نرم اور لطیف جذبات کا منبع ہے۔ یہی وسیع تر انسانی برادری کی بنیاد ہے۔

۸۔ معاشرتی نظام کی پیچیدگی

کیا اِس پیچ در پیچ معاشرتی نظام میں ایسی مستقل قوتیں دریافت کی جاسکتی ہیں

جن کی بدولت اِس نظام کی تعمیر ہوئی ہے؟ کیا ایسے عام قوانین بتائے جا سکتے ہیں جو معاشرے کے نظم وضبط میں کارفرما ہیں؟ اسی پیچیدہ معاشرتی نظام کا مطالعہ عمرانیات کا سب سے اہم مقصد ہے۔ بعض معاشرتی مظاہر بار بار نظر آتے ہیں اور اِن میں کم وبیش باقاعدگی پائی جاتی ہے۔ اِس لئے اُن کا مطالعہ کرنا اور ان میں تقسیم وترتیب سے کام لینا ممکن ہے۔ ظاہر ہے کہ معاشرتی زندگی کی تعمیر کسی نظام کے مطابق ہوئی ہوگی۔ یہ سارا کارخانہ محض اتفاق پر مبنی تو نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اِس کی نیرنگیوں میں ایک مستقل مقصد اور مستقل معاشرتی رجحان نظر آتا ہے۔ کچھ ایسے قوانین موجود ہیں جن پر انسانی معاشرے کے نظم وضبط کا دارومدار ہے۔ کچھ ایسی قوتیں ہمیشہ کارفرما رہتی ہیں جو اُسے ایک مخصوص اور معیّن راہ پر چلاتی ہیں۔ بے شمار مظاہر ہیں جن میں تقسیم اور ترتیب پیدا کی جا سکتی ہے۔

۹۔ علمی حیثیت سے مطالعہ کرنے کی ضرورت

گو عمرانی زندگی کے واقعات جو ہمیں اپنے گردوپیش نظر آتے ہیں دیکھنے میں بالکل معمولی ہیں لیکن اِن کی ماہیت کا معلوم کرنا اور انھیں ایک نظام میں ترتیب دینا مشکل کام ہے۔ یہاں جو قوتیں کارفرما ہیں اُن کی حرکت کے نظم وضبط کے قوانین آسانی سے دریافت نہیں کیے جا سکتے۔ مگر متعدد وجوہ سے انسانی فلاح وبہبود کے لئے ضروری ہے کہ معاشرے کا علمی تحقیق کی نظر سے مطالعہ کیا جائے۔ اوّل تو انسان کی معاشرتی زندگی کے متعلق ہماری معلومات اتنی ناقص ہے جتنی کائنات کے کسی شعبے کے متعلق نہ ہوگی۔ یہ وہ مظاہر ہیں جن پر غوروفکر کرنے کی نوبت سب کے بعد آتی ہے۔ دوسرے ان کا مطالعہ کرنے میں جتنے عملی فائدے ہیں کسی چیز میں نہیں۔ عالمِ فطرت کے متعلق ہمارا علم قریب قریب مکمل ہے اور اِس کے قوانین کو سمجھ کر اور ان سے مطابقت پیدا کر کے ہم نے اسے بڑی حد تک اپنے قبضے میں کر لیا ہے۔ خارجی دنیا کو ہم بہت کچھ جانتے ہیں اور اِس سے کام لیتے ہیں۔ ہمیں یہ گر آ گیا ہے کہ اگر اپنے طبعی ماحول کو بدل نہ سکیں تو

اس کے حالات سے سازگاری پیدا کریں لیکن اس مسئلے کا علمی مطالعہ کہ انسانوں نے باوجود اپنی انفرادی اغراض کو قائم رکھنے کے اتحاد و ہم آہنگی کی زندگی بسر کرنا کیونکر سیکھ لیا، یہ بہت مشکل ہے۔ معاشرتی زندگی کے فن پر عبور حاصل کرنا بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ تاریخ پر نظر ڈالیئے تو آپ دیکھیں گے کہ قبیلوں اور قوموں کو اپنے معاشرتی نزاعوں کا صحیح اور معقول تصفیہ نہ کر سکنے کے سبب سے کتنی لڑائیاں لڑنا پڑیں انسان کو تنازع للبقا میں کتنی شدید کشمکش سے کام لینا پڑا۔ یہ تنازع آج بھی کاروباری دنیا میں مقابلے کی صورت میں جاری ہے۔ فرق اتنا ہے کہ اب یہ کشمکش بقا کیلئے نہیں بلکہ دولت کے لئے ہے۔

۱۰۔ علمِ معاشرت کا مدوّن ہونا

لیکن جب ہم اُس علم کو جو ہم انسانی معاشرے کے متعلق رکھتے ہیں ایک نظام کی صورت میں ترتیب دینا چاہتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس علم کی داغ بیل ڈالنے کے لئے کافی مواد فراہم کرنا دشوار ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ابھی کافی تعداد میں ایسے کلیتے قائم نہیں ہوئے ہیں جو ہر صورت میں صحیح ہوں اِس لئے عمرانیات کے واضح اور معین اصول مرتب کرنا کوئی کھیل نہیں۔ ابھی ہم معاشرے کے نظم وضبط کے قوانین اور اُس کی بنیادی قوتوں کو اتنی اچھی طرح نہیں سمجھتے کہ عمرانیات کے علم کی تدوین اور تحصیل آسانی سے ہو سکے۔ تاہم عمرانیات کا یہ کام ہے کہ معاشرے کے متعلق جتنی معلومات حاصل ہو اُس کی تقسیم اور درجہ بندی کرکے، اُس میں ترتیب اور منطقی صحت قائم کرکے، معاشرے کو وجود میں لانے والی اور اُسے حرکت دینے والی قوتوں کو دریافت کرے اور اُس کے نظم وضبط کے قواعد معلوم کرے۔ اگر وہ یہ نہ بتا سکے کہ کس طرح اور کس حد تک مشترکہ انسانی فکر اور عمل سے معاشرے کی نشوونما اور ترقی کسی مخصوص سمت میں ہو سکتی ہے تو گویا اس نے بہ حیثیت علم صحیح (سائنس) کے اپنا فرض ادا نہیں کیا۔

بابِ دوم

عمرانیات کی تعریف اور اس کا دائرہ بحث

۱۱۔ عمرانیات کی تعریف

مختلف عمرانیوں نے اپنے اپنے نقطۂ نظر سے عمرانیات کی بہت سی تعریفیں کی ہیں۔ صوری تعریفوں میں، جو عالموں نے کی ہیں، پروفیسر گڈنگز[1] کی تعریف سے زیادہ جامع و مانع کوئی نہیں۔ وہ تعریف یہ ہے:-

"عمرانیات ایک کوشش ہے اس بات کی کہ طبیعی، حیاتی اور نفسی اسباب کے متحدہ عمل ارتقا کے لحاظ سے معاشرے کی ابتدا اور نشو و نما، اس کی ساخت اور جد و جہد کی توجیہ کی جائے۔"

اکثر عمرانیوں نے عمرانیات کی صوری تعریف نہیں کی ہے بلکہ اس کی ماہیت تفصیل سے بیان کی ہے۔ بعض نے ایک بے رنگ سی تعریف کر دی ہے مثلاً "عمرانیات معاشرے کے علم کا نام ہے" اور اسی سے کام چلایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عمرانیات ایک ایسا علم ہے جو روز بروز ترقی کر رہا ہے اور

[1] Giddings

اس کی ایسی مختصر اور جامع تعریف کرنا جو ہر صورت میں موزوں ہو بہت مشکل ہے۔ پھر بھی جو تعریف پروفیسر گڈنگز نے کی وہ اُن لوگوں کے لئے بڑے کام کی چیز ہے جو اِس علم کی ماہیت اور اس کے مقصد کو وضاحت اور صحت سے سمجھنا چاہتے ہیں۔ ہمارے نزدیک عمرانیات کی حقیقت اور اہمیت جنہی اُس کے بنیادی اصولوں کے مطالعے سے معلوم ہوسکتی ہے کسی تعریف پر خواہ وہ کیسی ہی معقول اور مکمل ہو، غور کرنے سے نہیں ہوسکتی۔ عمرانیات میں اُن مظاہر پر بحث کی جاتی ہے جو انسانوں کے مِل جُل کر رہنے سے وجود میں آتے ہیں۔ یہ بہت سی منظم اور مرتب معلومات اور متعدد اصول اور قوانین پر مشتمل ہے۔ اِس میں علت و معلول کی تحقیق ہوتی ہے، عمرانی قوتیں دریافت کی جاتی ہیں۔ نظم و ضبط کے قوانین یا کردار و عمل کے اصولوں کی توضیح کی جاتی ہے۔ اِس کے علاوہ اِس عام استدلال کا ایک خاص مقصد بھی ہے یعنی صحیح نتائج پر پہنچنا۔

۱۲۔ عمرانیات اور معاشرے کی ابتدائی بحث

کچھ ضروری نہیں کہ عمرانیات میں معاشرے کی ابتدا پر بھی نظر ڈالی جائے لیکن اس میں بہت سے فائدے ہیں کہ ہم انسانی معاشرت کی ابتدائی حالت کا جہاں تک ہوسکے مطالعہ کریں۔ یہ علمی تحقیقات کا عام اصول ہے کہ جو چیزیں اب پیچیدہ شکل میں ہیں اُن کی اس حالت کا کھوج لگایا جائے جب وہ سادہ شکل میں تھیں تاکہ قوانین اور اصول کے دریافت کرنے میں آسانی ہو۔ آج معاشرتی زندگی اس قدر پیچ در پیچ ہے کہ جو قوانین اِس میں کارفرما ہیں وہ منطقی کلیوں کی شکل رکھتے ہیں اور ان پر آسانی سے نظر نہیں پڑتی۔ بہ خلاف اِس کے معاشرے کی ابتدائی حالت میں اس کے سادہ اعمال کو دیکھئے تو ہر اجتماعی فعل کے اسباب و نتائج صاف ظاہر ہوجاتے ہیں۔

نباتی جب کسی پودے کا حال بیان کرتا ہے تو ضمناً یہ بھی بتاتا ہے کہ وہ کس طرح ایک بیج کی حالت سے بڑھتے بڑھتے موجودہ حالت تک پہنچا اور اس کی نشو و نما کا کیا قانون ہے۔ اسی طرح عمرانی بھی معاشرے کی ابتدائی حالت سے

اس کی نشو و نما دکھاتا ہے۔ حیوانیات کا عالم ہمیشہ بدو فطرت پر نظر ڈالتا ہے تاکہ اُس کی قوتوں کو اور قوانین کو سمجھ سکے۔ اسی طرح عمرانیات کے محقق کو بھی معاشرے کی ابتدا اور اُس کی بقا کے اسباب کے مطالعے سے بڑی مدد ملتی ہے۔

۱۳۔ عمرانیات اور معاشرے کی نشو و نما کی بحث

شروع میں معاشرہ ایک سادہ جماعت تھی اب توسیع یا ترقی ہوتے ہوتے یہ ایک بہت پیچیدہ جسم نامی بن گئی ہے۔ اِس کی نشو و نما کی حسبِ ذیل علامتیں ہیں، نئی شکلوں اور نئے وظائف کا اضافہ اور پُرانی زندگی کی قوت اور جد و جہد میں ترقی، مختلف اجزا کا زیادہ منظم اور بار بار ہونے والے اعمال کا زیادہ واضح ہونا۔ معاشرے کی تدریجی ارتقا یعنی "معاشرے کی تعمیر" پر روشنی ڈالنا عمرانیات کے دائرے کے اندر ہے۔ ابتدا میں عمرانی زندگی یکرنگ اور یک آہنگ تھی، مختلف شعبوں میں منقسم یا ممیز نہیں ہوئی تھی، رفتہ رفتہ افراد کی جماعتیں ایک دوسرے سے وابستہ ہو گئیں۔ اِس جسمِ سالم کے اجزا جدا جدا ہو گئے اور ہر ایک کا کوئی خاص وظیفہ یا کام معین ہو گیا۔ یہ اجزا آہستہ آہستہ زیادہ مربوط اور ایک دوسرے کے زیادہ پابند ہو گئے۔ مختصر یہ کہ معاشرہ گوناگوں عناصر کا مجموعہ بن گیا۔ اب اُس کی ساخت میں وہ سادگی نہ رہی بلکہ پیچیدگی پیدا ہو گئی۔ ابتدا میں یہ لوگوں کا ایک گروہ تھا جس کی زندگی محض خارجی واقعات کی پابند تھی۔ وہ ایک دوسرے کی نقل کرتے تھے یا اپنی غیر معین خواہشوں کے مطابق عمل کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ اُن کے لئے نئے مشاغل پیدا ہو گئے جو افراد میں الگ الگ تقسیم کر دیئے گئے۔ اسی وظائف اور فرائض کی کثرت نے معاشرتی زندگی کو اِس قدر پیچیدہ بنا دیا۔

۱۴۔ معاشرتی اعمال

اس میں شک نہیں کہ معاشرے کی نشو و نما کا مطالعہ عمرانیات کی بنیاد ہے اور اس لئے قابلِ قدر چیز ہے۔ اِس کی بدولت طالب علم کے ذہن میں معاشرے کا

ایک وسیع تصور قائم ہو جاتا ہے اور وہ اجتماعی نظام کے بنیادی اصولوں کو اچھی طرح سمجھ لیتا ہے گو حقیقت میں اِس علم کا موضوع اُس معاشرے کی مختلف صورتوں اور کاموں کا مطالعہ ہے جو تکمیل کو پہنچ چکا ہو یعنی جس میں وہ تمام اعمال اور وہ تنظیم موجود ہے جو ایک مستقل معاشرتی جماعت میں ہونا چاہیئے۔ طالب علم کو اِس بات سے اتنا سروکار نہیں کہ لوگوں نے کس طرح مل کر کام کرنا شروع کیا جتنا اس سے ہے کہ وہ کام، ہے جو مل کر کیا جا رہا ہے۔ کیا ہے؟ یہی معاشرتی اعمال ہمارے علم کی بنیاد ہیں۔ حکومت کے مختلف شعبوں کا کام، تعلیمی ادارات وکلیسا، خدمتِ خلق اور رفاہِ عام کی انجمنوں کی خدمات، اور منظم صنعتی جماعتوں کا کاروبار ان سب چیزوں کا مطالعہ طالبِ علم کے لئے ضروری ہے۔

۱۵۔ معاشرے کی مختلف صورتیں

گو جب معاشرتی اعمال کا ذکر ہوگا تو معاشرے کی ترکیب اور ساخت کی بحث ناگزیر ہے۔ جس جماعت کی نشو ونما پر غور کیجئے آپ یہی دیکھیں گے کہ اُس کا مخصوص کام یا وظیفہ اُس کی باقاعدہ تنظیم سے پہلے کسی نہ کسی صورت میں موجود ہوتا ہے۔ مثلاً ہمیں ریاستہائے متحدہ کے سینیٹ[1] (دار العوام) کا ذکر کرنا ہے تو پہلے اُس کی ساخت بتائی جائے گی کہ وہ ان افراد کا ایک مجموعہ ہے جن کا انتخاب ایک خاص طریقے سے ایک معینہ مقصد کے لئے کیا جاتا ہے۔ یہ افراد جب اکٹھا ہوتے ہیں تو مختلف عہدہ داروں کا انتخاب کرکے اپنی تنظیم کو مکمل کرتے ہیں۔ ابھی تک جو کچھ کہا گیا وہ محض معاشرے کی ایک جماعت یا عضو کی ساخت کے متعلق ہے۔ اب اگر ہم اِس پر غور کریں کہ سینیٹ کا کام کیا ہے یعنی وہ ایک نمائندہ جماعت کی حیثیت سے کیا حقوق اور فرائض رکھتی ہے اور کیا خدمات انجام دیتی ہے تو یہ معاشرے کے ایک جزو یا عضو کا معاشرتی وظیفہ ہوگا۔ اور اگر ہم سینیٹ کے ہر ایک فعل کا ذکر کریں تو یہ اُس کی تاریخ ہو جائیگی

---

[1] Senate

مگر یہ عمرانیات کے دائرے سے باہر ہے۔

۱۶۔ معاشرے کا تصور بہ حیثیت ایک جسم نامی کے

جن لوگوں نے پہلے پہل عمرانیات پر کتابیں لکھیں وہ بہت سی اصطلاحیں طبیعیات اور حیاتیات سے مستعار لے کر استعمال کیا کرتے تھے۔ وہ ایک طرف تو یہ دیکھتے تھے کہ معاشرہ بہت سے اجزا سے مرکب ہے جو ایک دوسرے سے ربط رکھتے ہیں اور ایک دوسرے کے پابند ہیں اور دوسری طرف یہ کہ معاشرے کے افعال ایک حد تک فرد کے فعل سے مشابہ ہیں۔ اسی قسم کی مشابہتوں کی بنا پر اس نئے علم کی خاص خاص اصطلاحیں بنائی گئیں۔ ہر نیا علم یا تو اپنی علیحدہ مصطلحات رکھتا ہے یا اُسے دوسرے علوم کی مصطلحات سے کام لینا پڑتا ہے۔ اس لئے جو شخص کسی نئے علم پر کتاب لکھتا ہے وہ یا تو نئے الفاظ وضع کرتا ہے یا پُرانے الفاظ کو جو اُس کے مفہوم سے کسی قدر قریب ہوں نئے معنی پہناتا ہے۔ جن عمرانیوں نے پرانے الفاظ کو نئے معنی پہنائے وہ عمرانیات کے مطالب کو وضاحت سے بیان کرنے میں اُن سے زیادہ کامیاب ہوئے جنھوں نے نئے الفاظ وضع کرنے کی کوشش کی۔

سب سے پہلے اس بات پر نظر پڑی کہ معاشرے کی ساخت جسم حیوانی یا نباتی کی ساخت سے مشابہ ہے اس لئے لوگ بے تکلف جسمِ اجتماعی کی ترکیب استعمال کرنے لگے مگر اس تشبیہ میں بعض مصنفوں نے اس قدر مبالغہ کیا کہ وہ معاشرے کو بالکل جسمِ طبیعی کی طرح سمجھنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ "حیاتیاتی عمرانیات" کی مخالفت شروع ہو گئی۔ اِس معاملے میں بھی وہی صورت ہوئی جو اکثر معاملات میں ہوتی ہے یعنی کہ یہ نقاد بھی اپنے خیالات میں اُسی قدر تشدد برتنے لگے جتنا وہ لوگ جن پر تنقید کی جاتی تھی۔ بے شک جسمِ اجتماعی ایک چیز ہے جو جسم طبعی سے بعض باتوں میں مشابہ ہے لیکن یہاں لفظ جسم کے معنی وہ نہیں جو جسم طبعی کی ترکیب میں ہیں۔ اس لئے عمرانیات کے اصول کی تشریح کے لئے طبیعیات یا حیاتیات کی جن اصطلاحوں کی ضرورت پڑے ان کا استعمال کرنا بالکل جائز ہے۔

۱۷۔ جسمِ حیوانی یا نباتی اور جسمِ اجتماعی کا مقابلہ

درخت میں جڑیں، تنہ، چھال، شاخیں، پتیاں، پھل اور پھول ہوتے ہیں۔ اِن میں سے ہر جزو کا وجود دوسرے اجزا کا محتاج ہے۔ اس جسمِ طبعی کے اعمال میں باہم بہت قریبی تعلق ہوتا ہے۔ یہ اعمال طبعی اور کیمیاوی افعال پر مشتمل ہیں۔ جسمِ عمرانی افراد کے مجموعوں سے مل کر بنا ہے جن کا وجود کم و بیش ایک دوسرے کا محتاج ہے۔ وہ ایک دوسرے کی بعض مقررہ خدمات انجام دیتے ہیں جو اُن کی زندگی کے لئے نہایت ضروری ہیں۔ یہ تشبیہہ اور آگے بڑھائی جا سکتی ہے مثلاً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تخم مایہ جو درخت کے خلیے میں ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک مستقل انفرادی زندگی بسر کرتا ہے جیسے جماعت میں فرد۔ ہم یہ بھی دکھا سکتے ہیں کہ تخم مایوں کا ایک گروہ درخت کی پتیاں بناتا ہے، دوسرا شاخیں، تیسرا چھال اور جیسے افراد کی جماعتیں معاشرتی زندگی کے مختلف شعبوں میں کام کرتی ہیں۔ مگر مقابلے کو اس قدر وسیع کر دینے سے عموماً غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ بے شک معاشرہ ایک جسم ہے مگر درخت کی طرح شعور اور حرکت سے خالی نہیں کہ چپ چاپ کھڑا حرارت، روشنی، ہوا اور رطوبت کا اثر قبول کیا کرے اور مقررہ قوانین کے مطابق نشو و نما پایا کرے۔ اس میں ایک نفسی عنصر بھی ہوتا ہے اور یہی اس کی طبیعتِ اصلی کی امتیازی خصوصیت ہے۔ شعوری کوشش کا تصور ایک ایسا عنصر ہے جس کی وجہ سے عمرانیات کو حیاتیات کا ایک جزو بنانے کا خیال ہمیشہ ترک کرنا پڑتا ہے۔ اس تصور کو پیش نظر رکھتے ہوئے "جسمِ اجتماعی" کی اصطلاح استعمال کرنے میں کوئی ہرج نہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ اس اصطلاح سے ہمارے ذہن میں درخت یا جسمِ انسانی یا کسی اور جسمِ نامی کا خیال پیدا ہو بلکہ ہمیں جسمِ اجتماعی کا ایسا تصور قائم کرنا چاہئے جو ان سب سے الگ ہو۔ ضرورت محض یہ سمجھنے کی ہے کہ معاشرہ مختلف اعضا یا اجزا پر مشتمل ہے جو ایک دوسرے کے پابند ہیں۔ جسمِ اجتماعی اپنے نفسی عنصر کی بدولت محض ایک انفرادی جسمِ نامی نہیں رہتا بلکہ ایک نظام بن جاتا ہے۔ لیکن معاشرے کو جسمِ نامی سے تشبیہ دینے

میں کوئی نقصان نہیں بلکہ کچھ فائدہ ہی ہے۔

۱۸۔ عمرانیات میں اُن قوتوں سے بحث کیجاتی ہے جن پر معاشرے کی تنظیم و بقا مبنی ہے

جہاں کہیں کوئی فعل یا حرکت وقوع میں آئے وہاں کسی ایسی قوت کا ہونا بھی ضروری ہے جو اس کی محرک ہو یا اُس کی علت کہی جاسکے۔ اس لئے عمرانیات کا ایک کام یہ بھی ہے کہ اُن قوتوں سے بحث کرے جو معاشرے میں کام کررہی ہیں۔ وہ کون چیز ہے جس کی وجہ سے انسان مل جل کر جماعت کی صورت میں رہتے ہیں؟ وہ کونسی قوتیں ہیں جن سے خاندان کی بنیاد قائم ہوئی اور جو خاندانی زندگی کی بقا کی ضامن ہیں؟ وہ کونسی قوتیں ہیں جن کی بدولت مذہبی جماعتیں وجود میں آتی ہیں اور لوگ گرجے بناتے ہیں۔ اور مذہبی مقاصد کے لئے باہم ملتے ہیں؟ وہ کونسی قوتیں ہیں جن کے اثرات سے لوگ شہروں میں جمع ہوتے ہیں یا صنعتی جماعتوں میں منظم ہوتے ہیں یا ریاست یا قوم یا حکومت کی تشکیل کرتے ہیں؟ مختصر یہ کہ وہ کونسی قوتیں ہیں جو جسم اجتماعی اور نظام اجتماعی کو پیدا کرنے اور باقی رکھنے میں کارفرما ہیں؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کا جواب دینا عمرانیات کے ماہر کا فرض ہے۔ عمرانیات کا ایک اہم مقصد ان قوتوں کا دریافت کرنا اور اُن کے طریقِ عمل کا پتہ چلانا بھی ہے۔

۱۹۔ عمرانیات میں اُن قوانین سے بحث کیجاتی ہے جن پر معاشرے کا نظم و ضبط موقوف ہے۔

ہم نے جن قوتوں کا ذکر کیا وہ بے قاعدہ اور غیر مسلسل نہیں ہیں ورنہ معاشرے کی مستقل نشو و نما ناممکن ہو جاتی۔ اُن کے عمل میں ایک خاص ترتیب ہوتا چاہئے اور ہے۔ اور اُن کے نظم و ضبط کے قوانین اور قاعدے بھی ہیں مثلاً اگر یہ سمجھا جائے کہ لوگ حصولِ دولت کے لئے کشمکش کررہے ہیں تاکہ اُن کی مادی حالت بہتر ہو جائے تو یہ کشمکش گویا ایک ثبوتی معاشرتی قوت ہے۔ اگر ہم وہ قانون تلاش کریں جو یہاں کارفرما ہے تو علاوہ اور باتوں کے یہ نظر آتا ہے کہ لوگ کم سے کم قربانی کرکے زیادہ سے زیادہ معاوضہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اسی طرح ہم ہر جگہ دیکھتے

ہیں کہ بعض قوتیں ایسی ہیں جو معاشرے کو آگے بڑھاتی ہیں اور ان کے ساتھ اُن کے نظم وضبط اور ان کی حد بندی کے قوانین ہیں۔ عمرانیات کا ایک خاص کام یہ بھی ہے کہ ان قوانین کو دریافت کرکے منضبط اور مرتب کرے۔

۲۰۔ معاشرتی تنظیم کے نفسی عناصر

یوں تو معاشرے کو وجود میں لانے والی اور قائم رکھنے والی بہت سی قوتیں ہیں مگر ان میں نفسی قوتیں سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ اصل میں وہ حقیقی رشتے، جن سے معاشرے کے مختلف اجزا باہم مربوط ہیں، غور کرنے پر نفسی ہی ثابت ہوتے ہیں۔ عالمِ خارجی کے بعض اثرات لوگوں کو مِل جل کر رہنے اور اتحادِ عمل کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ خود افراد کی بعض طبیعی خصوصیتیں بھی اس اجتماع کا باعث ہوتی ہیں مگر معاشرے کی تخلیق کا خاص سبب اصل میں وہ نفسی خصوصیتیں ہیں جو اُس میں مثل ایک فرد کے پائی جاتی ہیں۔ معاشرہ لوگوں کے "متحدہ احساس، خیال اور ارادے" سے بنتا ہے اور یہی اُس کا سب سے زیادہ مستقل اور دائمی عنصر ہے۔ یوں تو عمرانیات کو بہت سی باتوں میں حیاتیات سے بھی مدد ملتی ہے مگر نفسیاتِ اجتماعی سے اس کا تعلق بہت گہرا ہے۔ یہ علم محض عمرانیات سے مشابہ ہی نہیں بلکہ اُس کا ایک جزو ہے۔

۲۱۔ عمرانیات سکونی بھی ہے اور حرکی بھی

یہ اصطلاحیں مِکانِکْسْ[۵] (علم سکون وحرکت) سے مستعار لی گئی ہیں اور ان کا مفہوم ایک حد تک عمرانیات میں بھی وہی ہے جو مِکانِک میں ہے۔ پھر بھی دونوں جگہ ان کے استعمال میں کچھ فرق ضرور ہے اور جوں جوں عمرانیات ترقی کرتی جاتی ہے یہ فرق واضح ہوتا جاتا ہے۔ کیونکہ ان دونوں اصطلاحوں کے جو معنی ابتدا میں تھے اُن میں اب تغیر ہوگیا ہے۔ حرکی عمرانیات میں عموماً ترقی یا نشوونما کی بحث

۵۔ Mechanics.

ہوتی ہے اور سکونی عمرانیات میں باہمی علاقوں کی۔ اگر ہم ایک لمحے کے لئے سارے معاشرے پر بہ لحاظ اُس کی ساخت اور اس کے عمل کے، اور اُس کے اجزا کے باہمی علاقوں پر نظر ڈالیں تو یہ سکونی عمرانیات کی بنیاد ہوگی۔ لیکن اگر ہم معاشرے پر اس حیثیت سے غور کریں کہ یہ برابر آگے بڑھ رہا ہے اور اُس کے باہمی علاقے ہر منزل پر بدلتے جاتے ہیں تو حرکی عمرانیات کا مفہوم واضح ہو جائے گا۔ ممکن ہے کہ سکونی عمرانیات میں باہمی علاقوں کو کسی عینی معیار سے نسبت دیجائے۔ اِس صورت میں معاشرے کو ایک اخلاقی بنیاد حاصل ہو جائے گی۔ بہت سے مصنفوں نے معاشرتی زندگی کی اِن دو تقسیموں کو مختلف طرح سے ظاہر کیا ہے۔ بعض نے ایک علم معاشرتی حرکیات قرار دے کر اُس کی دو شاخیں قرار دی ہیں، معاشرتی علم حرکت اور معاشرتی علم سکون مگر اس میں کوئی ہرج نہیں کیونکہ اگر منطقی تحلیل سے کام لیا جائے تو یہ مختلف اصطلاحات قریب قریب ایک ہی ثابت ہوں گی۔ اِن میں کوئی بنیادی اختلاف نہیں بلکہ محض مطالعہ کرنے والوں کے نقطۂ نظر کا فرق ہے۔ کیونکہ معاشرے پر غور کرنے ہی یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے اس میں ہمیشہ تغیر یا ترقی ہوتی رہتی ہے۔ اُس کے باہمی علاقے محض ایک لمحے تک ایک حالت میں رہتے ہیں دفعۃً معاشرتی نشو و نما کا عمل ان میں تغیر پیدا کرتا ہے۔ اِس دائمی تغیر کی بدولت معاشرتی نظام کے عام قوانین مرتب کر سکتے ہیں لیکن معاشرے کی کسی مستقل حالت کا تعین نہیں کر سکتے۔ اِس لئے معاشرتی سکونیات بھی ہمیں معاشرے کی ایک متحرک تصویر نشو و نما کی منازل سے یکے بعد دیگرے گزرتی ہوئی دکھاتی ہے اور اُس طرح اس میں بھی معاشرتی حرکیات کی جھلک نظر آتی ہے۔

۲۲۔ معاشرے کے فطری اور اخلاقی اعمال

انسان کائنات کا ایک جزو ہے اور اُس کے قوانین کا پابند ہے۔ وہ علاوہ حیاتی قوت کے طبیعی اور مکانکی[1] قوتوں سے بھی متاثر ہوتا ہے بعض مصنفوں

[1] Mechanical.

نے اسے بالکل قانونِ فطرت کا پابند کرنا چاہا ہے اور اس کی ایک فاعلِ مختار کی حیثیت تسلیم نہیں کی ہے۔ انھوں نے اُسے کائنات کا ایک ذرہ سمجھا ہے جسے فطرتِ خارجی اور خود اُس کی فطرت کی مختلف قوتیں جدھر چاہتی ہیں اڑالے جاتی ہیں۔ یہ اصول نظریۂ اختیار کی انتہائی صورت کے خلاف ردِّعمل اور ارتقائے فطرت کے مشاہدے کا نتیجہ ہے۔ اور بہت سی باتوں کی طرح یہاں بھی سلامتی دونوں اصولوں کے بین بین رہنے میں ہے اور یہی صورت حقیقت سے زیادہ قریب بھی ہے۔ کیونکہ گو یہ مسلّم ہے کہ انسان عالمِ خارجی کے حوادث کا پابند ہے مگر ایک خاص حد کے اندر اُس کا ارادہ بڑی قوت کے ساتھ کارفرما ہوتا ہے۔

نوعِ انسانی کی تاریخ کے ابتدائی دور میں تنازع للبقا سے یہ بات صاف ظاہر تھی کہ انسان کی قسمت اور دوسرے اجسامِ نامیہ سے مشترک ہے۔ اس حیثیت سے نوعِ انسانی اپنی بقا کے لئے ایک حد تک طبیعی ماحول کی پابند تھی اور ایک حد تک خود اپنی سعی کی۔ ابتدا میں یہ تنازع وحشی جانوروں کے ساتھ مشترک تھا۔ یہ ایک خونخوارانہ کشمکش تھی جس میں استیثار یا خودی کا عنصر غالب تھا۔ پھر ایک دن ایسا آیا کہ ایثار کی خفیف سی جھلک نظر آنے لگی۔ رفتہ رفتہ یہ عنصر بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ جدید معاشرے میں ایثار کے اعمال کا پلّہ بہت بھاری ہوگیا ہے۔

۲۳۔ تنازع للبقا کا بجائے جسمانی بنیاد کے نفسی بنیاد پر قائم ہونا۔

جوں جوں ایثار کا عنصر غالب آتا گیا ہمجنس افراد کے باہمی مقابلے کی شدت کم ہوتی گئی اور بجائے جسمانی کشمکش کے ذہنی مقابلہ ہونے لگا۔ تنازع للبقا بدستور جاری رہا لیکن اب حریف ایک دوسرے کی رعایت کرنے لگے۔ پہلے اس کا اظہار اس طرح ہوا کہ بجائے اس کے کہ فرد اپنے واقعی یا فرضی دشمنوں کو تباہ کر کے اپنی بقا کی فکر کرتا اُس نے اپنی قوتوں کو ثبوتی حیثیت سے حصولِ دولت کے لئے صرف کرنا شروع کیا۔ آگے چل کر ہر انسان نے یہ سبق سیکھ لیا کہ اپنی خواہشوں کو پورا کرتے وقت دوسروں کی خواہشوں کا بھی لحاظ رکھے۔ پھر

لوگ اپنی حفاظت کے لیئے اور دولت حاصل کرنے کے لیئے باہم اتحادِ عمل کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ ایثار کے عنصر کی اہمیت بڑھنے لگی اور ہر فرد اپنی سلامتی کے ساتھ ساتھ جماعت کی فلاح کی کوشش کرنے لگا یہ سمجھ کر کہ بالآخر میری کامیابی کا دارومدار اِسی پر ہے۔

۲۴۔ بقائے اصلح

جب ایثار کے خیال نے نشو ونما پائی اور نوعِ انسانی کے اتحادِ عمل کا دائرہ وسیع ہوگیا تو تنازع للبقا کی صورت بھی بدل گئی اور بقائے اصلح کی جگہ رفتہ رفتہ بقائے افضل کا دور دورہ ہوگیا۔ فرد میں جو صلاحیت اپنے طبعی ماحول سے مطابقت کرنے کی تھی اُسے اِس بات سے اور تقویت پہنچی کہ اب اسے اپنے بنی نوع سے بھی مطابقت کرنا پڑی۔ جن لوگوں نے اپنے بنی نوع سے اتحادِ عمل کیا وہ باقی رہے اور جو نہیں کر سکے وہ فنا ہو گئے۔ نسل انسانی کی نشو ونما میں اِس عظیم الشان اصول کی اتنی بڑی اہمیت ہے جس کا پورا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ غرض اب یہ صورت ہوگئی کہ جو لوگ اپنے بنی نوع سے سب سے زیادہ اُنس رکھتے تھے وہی افضل سمجھے جانے لگے۔ یعنی اب افضل کا اِطلاق محض اُن لوگوں پر نہیں ہوتا تھا جو جسمانی اور ذہنی قوت میں سب سے بڑھ کر تھے بلکہ اُن پر بھی جو اتحادِ عمل اور معاشرتی زندگی سے سازگاری کا مادّہ سب سے زیادہ رکھتے تھے۔ اِس اتحادی حفاظت کے عمل نے قوی اشخاص کے ساتھ نیک اشخاص کو بھی باقی رکھا۔ سچ پوچھیے تو تغیر محض اتنا ہوا کہ بقائے اصلح کے اصول میں اصلح کا مفہوم زیادہ وسیع ہوگیا اور اس کا اِطلاق معاشرتی ماحول یعنی انسانوں کی متحدہ زندگی سے مطابقت کرنے والوں پر بھی ہونے لگا۔

۲۵۔ معاشرے کا بامقصد عمل

جوں جوں افراد کے جذبات، خیالات اور عمل میں اتحاد ہوتا جاتا ہے اُن میں وہ چیز پیدا ہوتی جاتی ہے جسے شعورِ اجتماعی کہتے ہیں اور جس کے ذریعے سے

معاشرے کو اپنی مجموعی قوت کا احساس ہوتا ہے۔ اُسے اپنے ارکان کی فلاح و بہبود کے لئے استعمال کرنے کی غرض سے وہ اپنی تعینِ مقصد کی قوت سے کام لیتی ہے۔ یا یوں کہیئے کہ معاشرے کو فلاحِ عامہ کی غرض سے کسی خاص راہ پر چلانے یا کسی معینہ عمل پر آمادہ کرنے کی کوشش گویا اس بات کا اعتراف ہے کہ معاشرہ اپنی اصلاح کے لئے شعوری سعی کر سکتا ہے۔

معاشرے کی تخلیق زیادہ تر تو اس طرح ہوئی ہے کہ ہر فرد اپنا اور دوسرے افراد کا خیال رکھتے ہوئے اپنی ذاتی خواہشوں کو پورا کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ معاشرتی نظام کی تشکیل کا کسی کو خیال بھی نہیں آتا تھا۔ مگر شعورِ اجتماعی کی بدولت اجتماعی نصب العین، اجتماعی مقاصد، اور اجتماعی نقائص کا احساس ہوتا ہے اور ان نقائص کو رفع کرکے فلاحِ عامہ کی کوشش کی جاتی ہے۔

۲۶۔ عمرانیات کی علمی بنیاد

جو کچھ اب تک کہا گیا وہ عمرانیات کے پیچیدہ موضوع کا مختصر اور جزوی بیان ہے۔ اس میں ہر قسم کے معاشرتی امور پر غور کیا جاتا ہے، اُن کی تقسیم اور ترتیب ہوتی ہے اور ان سے معاشرے کے عمل اور اُس کی نشو و نما کے متعلق کلیئے یا قوانین مستنبط کیئے جاتے ہیں۔ ان گونا گوں مظاہر میں منطقی ترتیب پیدا کرنا اور اس ترتیب کو علمی بنیاد پر قائم کرنا کوئی سہل کام نہیں۔ عمرانیات تمام اجتماعی علوم میں سب سے مشکل علم ہے۔ اِس کا موضوع تو وہی چیزیں ہیں جو انسانی معاشرے میں ابتدا سے موجود ہیں مگر یہ اُن کے وجود کے عام ترین بنیادی قوانین دریافت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ فی الحال عمرانیات مختلف عالموں کی تحقیقات کے نتائج کا نام ہے جو یا تو پہلو بہ پہلو چلتے ہیں یا ایک نقطے پر پہنچ کر مل جاتے ہیں یا ایک نقطے پر ملنے کے بعد پھر الگ ہو جاتے ہیں۔ ہر محقق معاشرے کو ایک جداگانہ نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے اور عمرانیات اُس وقت تک ایک محکم اور معین علم نہیں بن سکتا جب تک سب عمرانی اُن حقائق کو جو انھوں نے علحدہ علحدہ طریقے پر دریافت کئے ہیں عام قوانین کے ماتحت نہ لے آئیں اور اُن کا نقطۂ نظر متحد نہ ہو جائے۔

۲۷۔ عمرانیات کا مقام علومِ اجتماعی میں

اس میں عمرانیات کی ماہیت اور اُس کا دائرہ بحث شامل ہے۔ عمرانی کتابوں کے مصنفوں میں اس مسئلے پر بیحد اختلاف رہا ہے اور اصل میں اِس کا فیصلہ اب تک نہیں ہوا ہے۔ بعض مصنفوں کا خیال ہے کہ عمرانیات کل اجتماعی علوم سے مرکب ہے یہ گویا ایک رشتہ ہے جس میں سارے علوم منسلک ہیں بعض جو زیادہ باریکی سے کام لیتے ہیں یہ کہتے ہیں کہ یہ دیگر اجتماعی علوم کے نتائج کا مرکب یا مجموعہ ہے۔ ہربرٹ اسپنسر[1] نے عمرانیات کو ایک عام اصطلاح کے طور پر استعمال کیا تھا جو اور سب اجتماعی علوم پر حاوی تھی۔ علمی نقطۂ نظر سے لفظ عمرانیات کے اس استعمال سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سب اجتماعی علوم ایک بڑے علم کی شاخیں ہیں جس کا نام عمرانیات ہے جیسے اسپنسر کے یہاں تمام علوم جن کا تعلق حیات سے ہے "حیاتیات" میں شامل ہیں۔ لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ عمرانیات اُن علومِ اجتماعی میں سے ایک ہے جو ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو موجود ہیں۔ یہ ان میں سب سے نیا علم ہے جو ایک خاص مقصد کے لئے وضع کیا گیا ہے اور درآنحالیکہ معاشیات، سیاسیات، اور اخلاقیات میں ان خاص قوانین کی بحث ہوتی ہے جو معاشرے کے مختلف اجزا سے متعلق ہیں۔ عمرانیات کا موضوع وہ عام قوانین ہیں جو پورے جسمِ اجتماعی پر نافذ ہیں۔

۲۸۔ علومِ اجتماعی کی تفریق

انسانی معاشرے کے اندر متعدد مظاہر ہیں جن میں نظامِ اجتماعی کی نشو و نما کے ساتھ ساتھ اور اضافہ ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ نشو و نما صدیوں تک جاری رہے اور ان مظاہر میں ترتیب قائم کرنے کی کوئی علمی کوشش نہ کی جائے۔ مگر ایک دن وہ آتا ہے کہ اربابِ علم یہ محسوس کرتے ہیں کہ معاشرتی نشو و نما میں بعض امور بار بار

---

[1] Herbert Spencer.

نظر آیا کرتے ہیں مثلاً وہ چیزیں جن کا تعلق فرد کے اخلاقی عمل سے ہے۔ اِن مظاہر کی ترتیب اور عام اصول و قوانین کے استنباط سے اخلاقیات کی بنیاد پڑتی ہے یہ علم زمانے کے لحاظ سے علومِ اجتماعی میں پہلا علم ہے۔ اِس کے بعد اس پر نظر پڑتی ہے کہ اِسی قسم کے بعض امورِ حکومت کے متعلق ہیں اور معاشرے کے نظم و ضبط کی نشو و نما کچھ اصولوں پر مبنی ہے۔ یہ چیزیں جمع کی جاتی ہیں، ان کی تقسیم و ترتیب ہوتی ہے، ان کے اصول منضبط ہوتے ہیں اور اِس طرح سیاسیات کا علم وجود میں آتا ہے۔ مگر ابھی دوسرے معاشرتی مظاہر باقی ہیں جن کی ترتیب نہیں ہوئی اور دوسرے مقاصد ہیں جو تکمیل کو نہیں پہنچے۔ وہ عمل جس کے ذریعے سے دولت پیدا ہوتی ہے اور تقسیم کی جاتی ہے ایک مستقل عمل ہے جو نہ اخلاقیات کے دائرے میں آتا ہے اور نہ سیاسیات کے۔ اِس لئے ایک نیا علم وضع کیا جاتا ہے جس کا نام معاشیات ہے۔ اِن مختلف علوم میں رفتہ رفتہ قدرتی ترتیب کے مطابق توسیع ہوتی ہے لیکن ان کے دائروں کے باہر ایسے معاشرتی مظاہر موجود ہیں جن کی ترتیب نہیں ہوئی اور ایسے علمی مقاصد ہیں جو تکمیل کو نہیں پہنچے چنانچہ ابھی تک کسی نے یہ بحث نہیں کی ہے کہ وہ کون سی عالمگیر قوتیں ہیں جن سے معاشرہ بہ ہیئتِ مجموعی نشو و نما اور تشکیل پاتا ہے یعنی کسی نے اب تک معاشرتی زندگی کے قوانین کی تشریح نہیں کی ہے۔ سیاسی، مذہبی، اخلاقی اور معاشی زندگی کا مخصوص نقطہ ہائے نظر سے مطالعہ کیا جا چکا ہے مگر معاشرے کے عام قوانین کو کسی نے منضبط نہیں کیا ہے۔ اِس لئے یہاں عمرانیات کے نام سے ایک نئے علم کی گنجائش ہے۔ نہ تو یہ علم کسی اور علمِ اجتماعی کے تحت میں آسکتا ہے اور نہ دوسرے علومِ اجتماعی اس کے ماتحت یا اِس میں ضم ہو سکتے ہیں تعلیمی اور علمی نقطہائے نظر سے یہ ایک بالکل علیحدہ علم ہے۔ اِس کا ایک مخصوص مقصد ہے اور یہ بعض مخصوص معلومات اور مخصوص اصول و قوانین پر حاوی ہے۔

۲۹۔ عمرانیات کی امتیازی خصوصیت

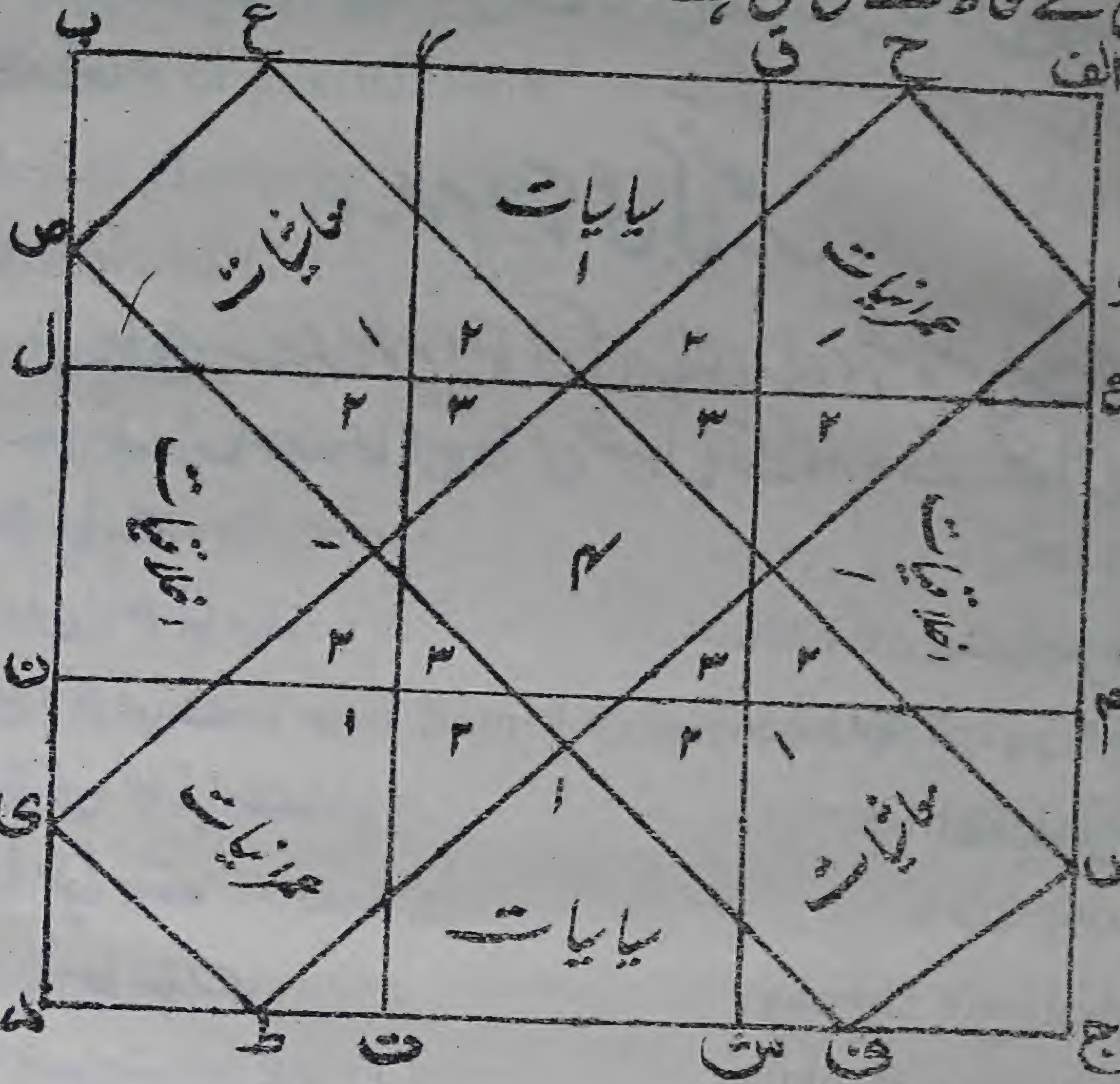
اِس علم کے دائرۂ نظر کے متعلق جو خلطِ مبحث ہوا ہے وہ زیادہ تر اس سبب سے

کہ مصنفین یہ اعتراف نہیں کرتے کہ علوم کی حدود خارجی نہیں بلکہ داخلی ہوتی ہیں۔ کسی علم کا امتیازی نشان اصل میں اُس کا مقصد اور اُس کا استدلال ہوتا ہے نہ کہ وہ مظاہر جن سے وہ بحث کرتا ہے مثلاً نباتیات اور کیمیا کا موضوع بعض صورتوں میں ایک ہی ہوتا ہے مگر ان کے مقاصد بالکل مختلف ہیں۔ نباتیات اور کیمیا کی طرح طبیعیات اور ہیئت میں بھی اکثر ایک ہی طرح کے مظاہر سے بحث کی جاتی ہے مگر جو مقاصد دونوں کے مدِ نظر ہیں اُن میں اختلاف ہوتا ہے۔ اِن میں ہر ایک کو ایک جداگانہ اور مستقل علم ماننے میں کسی کو ذرا سا بھی تامل نہیں ہوتا۔ اِسی طرح عمرانیات، معاشیات، اخلاقیات اور سیاسیات میں بعض اوقات ایک ہی قسم کے مظاہر پر بحث ہوتی ہے مگر بہ حیثیت علوم کے ان سب کی داخلی حدود الگ الگ ہیں مثلاً شرکتِ تجّار[۱] کے مسئلے کو لیجئے اور اِس کے مختلف مظاہر پر غور کیجئے۔ اگر ہم اِسے معاشی نقطۂ نظر سے دیکھیں تو ہم اُس کا اندازہ کریں گے کہ شرکتِ تجّار سے دولت میں کس طرح افزائش ہوتی ہے، مزدوری پر یا پیداوار کی تقسیم پر اور دوسرے معاشی مسائل پر اس کا کیا اثر پڑتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہماری یہ بحث معاشیات کے دائرے کے اندر ہے۔ اگر ہم اِس پر غور کریں کہ جن لوگوں کو شرکتِ تجّار سے تعلق ہے اُن کا اخلاقی کردار کیسا ہے اور اُس کا عام اثر معاشرے کے اخلاق پر کیا پڑتا ہے تو یہ اخلاقیات کا مسئلہ بن جائے گا۔ اگر ہم یہ معلوم کرنا چاہیں کہ اِس شرکت کے نظم و ضبط کے لئے کن قوانین کی ضرورت ہوگی تو ہم سیاسیات کی قلمرو میں داخل ہو جائیں گے اور اگر ہم ان مظاہر پر اِس حیثیت سے نظر ڈالیں کہ ان کا اثر خاندانوں کی حالت پر، ہجرتِ قبائل کے مسئلے پر، معاشرے کے انتشار اور اجتماع پر اور عام طور سے معاشرتی معیارِ زندگی پر کیا پڑے گا تو ہم اجتماعیات کے دائرے میں ہو جائینگے۔ غرض ہم پر یہ ثابت ہو جائے گا کہ جہاں تک موضوع کا تعلق ہے تمام علوم میں

---

[۱] بعض ملکوں میں خصوصاً امریکہ میں چند بڑے تاجر مل کر کسی چیز کی تجارت کے لئے ایک شرکت (کمپنی) قائم کرتے ہیں تاکہ چھوٹے چھوٹے بیوپاری ان کا مقابلہ نہ کر سکیں، یہ شرکت Trust. کہلاتی ہے

کم و بیش اشتراک ہے اور ہمیں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ اصل میں علم ایک ہی ہے یعنی علم کائنات اور اس کی تقسیم مختلف شعبوں اور شاخوں میں محض آسانی کے لئے اور تعلیمی اغراض کے لحاظ سے کی گئی ہے۔



الف ب ج د = اجتماعی علوم کا میدان
ک ل م ن = اخلاقیات کا میدان
ق ر ش ت = سیاسیات کا میدان
س ع ف ص = معاشیات کا میدان
و ح ط ی = عمرانیات کا میدان
۱ = وہ مسائل جو صرف ایک علم سے تعلق رکھتے ہیں۔
۲ = وہ مسائل جو دو علوم میں مشترک ہیں۔
۳ = وہ مسائل جو تین علوم میں مشترک ہیں۔
۴ = وہ مسائل جو چار علوم میں مشترک ہیں۔
مثلاً فرض کیجئے کہ مستطیل (الف ب ج د) تمام اجتماعی علوم کے میدان کو

(ك ل م ن) اخلاقیات کے میدان کو (س ع ف ص) معاشیات کے میدان کو (ق ر ش ت) سیاسیات کے میدان کو اور (و ح ط ی) عمرانیات کے میدان کو ظاہر کرتا ہے تو آپ دیکھیں گے کہ بعض مقامات پر یہ مستطیل ایک دوسرے کو چھپا لیتے ہیں۔

۳۰۔ علوم اجتماعی کی قسمیں

ذیل کی فہرست میں علومِ اجتماعی کی سیدھی سادی تقسیم تعلیمی نقطۂ نظر سے کی گئی ہے۔ ہر صنف میں صرف خاص خاص شعبوں کے نام دئے گئے ہیں۔

I Ethics.	۱۔ اخلاقیات
Principles of Ethics.	اصولِ اخلاقیات
History of Ethics.	تاریخ اخلاقیات
Social Ethics.	اجتماعی اخلاقیات
II Economics.	۲۔ معاشیات
Economic theory.	نظریۂ معاشیات
Economic Politics.	سیاسیات معاشی
Industrial History.	تاریخ صنعت وحرفت
Labour Lagislation.	مزدوروں سے متعلق قوانین
Banking and Monetary Theory.	نظریۂ زر اور مہاجنی
Taxation and finance.	محصول اور مالیات
III Politics.	۳۔ سیاسیات
Political Theory	نظریۂ سیاست
Diplomacy and International Law.	حکمت عملی اور قانون بین الاقوامی
National Administration.	ملکی نظم ونسق
Municipal Administration.	بلدی نظم ونسق
Constitutional Law.	قانونِ اساسی

Colonial administration.	نوآبادیات کا نظم و نسق
IV History.	۴۔ تاریخ
Political History.	سیاسی تاریخ
History of Institutions.	ادارات کی تاریخ
Social History.	عمرانی تاریخ
Historical Geography.	جغرافیۂ تاریخی
V Socialogy.	۵۔ عمرانیات
Discriptive Socialogy.	بیانی عمرانیات
Social Evolution.	معاشرتی ارتقا
Social Pathalogy.	معاشرتی مرضیات
Socialization and Social Control	تعمیرِ معاشیرہ اور معاشرتی نظم و ضبط
Social Psychology.	معاشرتی نفسیات
History of Socialogy.	تاریخ عمرانیات
VI Anthropology.	۶۔ علم الانسان
General Anthropology.	عام علم الانسان
Ethnology.	نسلیات
Ethnography.	علم الاقوام
Somatology.	جسمیات
Archaeology.	آثارِ قدیمہ
VII Comparative Religion.	۷۔ تقابلِ مذاہب

علومِ اجتماعی کی اِس فہرست میں ابھی بہت کچھ توسیع کی گنجائش ہے لیکن تعلیمی مصلحتوں کے لحاظ سے یہ تقسیم اِن علوم کا باہمی تعلق دکھانے کے لئے کافی ہے۔ یہ کوشش فضول ہے کہ اِن سب کو یا اِن کے نتائج کو ملا کر ایک علم بنایا جائے۔ اس کے لئے یہ فرض کرنا ہوگا کہ معاشرتی زندگی کے متعلق جتنے مسائل ہیں سب سے بحث کرنے کے لئے ایک علم کافی ہے۔ اِس کی مثال یوں سمجھیے جیسے ہم غیر نامی

اجسام کے متعلق تمام مسائل کے مجموعے کو ایک علم اور تمام حیاتی مسائل کے مجموعے کو دوسرا علم فرض کرلیں۔ اسی طرح اس سے بھی کام نہیں چلتا کہ "عمرانیات" کو "علوم اجتماعی" کا مترادف سمجھا جائے کیونکہ اس طرح گویا ہماری فہرست میں سے نمبرہ کے مسائل نکل جائیں گے اور اجتماعی معلومات کے نقشے میں ایک بہت بڑا خانہ خالی رہ جائے گا۔

۳۱۔ عمرانیات کی تعلیمی حدود

کم سے کم تعلیمی مصلحتوں کے لحاظ سے عمرانیات کی معینہ حدود ہونی چاہئیں۔ اس علم کو معاشیات، اخلاقیات، سیاسیات یا کسی اور مستقل اجتماعی علم کی جگہ نہیں لینا چاہئے اور نہ ان میں سے کسی علم کو کھینچ کر اپنے دائرہ میں لانا چاہئے۔ اس کی حیثیت محض ایک عام اصطلاح کی نہیں ہے جو تمام علوم پر حاوی ہو، نہ یہ دوسرے اجتماعی علوم کے متفرق اجزا کے ملنے سے بنتا ہے اور نہ ان کے نتائج کی ترتیب اور تنظیم سے یہ ایک مستقل علم ہے جو اپنا جداگانہ وجود اور جداگانہ دائرۂ تحقیق رکھتا ہے۔ البتہ اس تحقیق کے لئے مواد اسے معاشیات، اخلاقیات، سیاسیات یا کسی اور مسلم الثبوت علم سے ضرور حاصل ہوتا ہے مگر یوں تو بعض چیزیں اسے حیاتیات اور نفسیات سے بھی ملتی ہیں حالانکہ ان علوم کا شمار عمرانیات میں کوئی بھول کر بھی نہیں کرتا۔ تاہم عمرانیات اجتماعی علوم کے زمرے میں نہایت اہمیت رکھتی ہے۔ وارڈ^۱^ نے خوب کہا ہے کہ اپنی عمومیت کے سبب سے "عمرانیات بمنزلۂ سر کے ہے اور دوسرے علوم اعضائے تن کی طرح اس سے مربوط ہیں" اس لئے جامعہ کے نصابِ تعلیم میں اس علم کا تعلق دوسرے اجتماعی علوم سے بہت گہرا ہونا چاہئیے۔

۳۲۔ عمرانیات کا تعلق نفسیات اور حیاتیات سے

حیاتیات کا موضوع فرد انسانی ہے اور بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ اس کی

---

۱ Ward.

تحقیق کا دائرہ اِس سے آگے بڑھے۔ اِن کا مقصد یہ ہے کہ حیات کے آغاز اور نشو و نما کو اُس کی مختلف صورتوں میں دکھائے اور وہ فرد کی تاریخ تخم مایہ سے لے کر مکمل جسم نامی تک حرف بہ حرف بیان کرتی ہے۔ نفسیات کا موضوع فرد کی نفسی قوتوں اور عادتوں کا مطالعہ ہے۔ اس کا سارا کام یہ ہے کہ نفس کے طبعی اور غیر طبعی عمل کی حقیقت دریافت کرے۔ یہ دونوں علوم صرف فرد سے بحث کرتے ہیں اور جب وہ اِس کے متعلق تمام مظاہر کو دریافت کر کے ترتیب دے چکیں تو اِن کا دائرہ تحقیق مکمل ہو جاتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ حیاتیات میں کبھی کبھی معاشرتی زندگی کے کسی پہلو کا ذکر آ جاتا ہے کہ اس پر حیاتیاتی عوامل کا کیا اثر ہوتا ہے اور نفسیات کی ایک شاخ معاشرتی نفسیات بھی ہے جس کی غرض یہ ہے کہ انفرادی خصوصیات کی تشریح اجتماعی ماحول کے لحاظ سے کرے۔ لیکن دونوں میں سے کسی کا یہ مقصد نہیں کہ سماجی زندگی کے مقاصد کو ایک نظام کی صورت میں پیش کرے۔ اُدھر عمرانیات کا یہ کام ہے کہ حیاتیات اور نفسیات کے موضوع افرادِ انسانی کی اجتماعی زندگی سے بحث کرے۔

۳۳۔ عمرانیات کا تعلق معاشیات سے

جدید عمرانیات کی نشو و نما سے پہلے بلکہ اسپنسر کی یادگار کتاب[۱] کی تصنیف اور وارڈ کی عمرانیات حرکی[۲] کی اشاعت سے بھی قبل معاشیات کا رجحان اِس طرف تھا کہ اس قدیم تنگ دائرے سے جس میں اُسے ایڈم اسمتھ[۳] ریکارڈو[۴] اور کیرنس[۵] نے محدود کر دیا تھا باہر نکلے۔ جوں جوں ملک کی صنعتی زندگی میں توسیع

ے۱ Principles of Sociology.

ے۲ Dynamic Sociology.

ے۳ Adam Smith.

ے۴ Ricardo.

ے۵ Cairnes.

ہوتی گئی یہ رجحان اور بڑھتا گیا یہاں تک کہ معاشیات اُن مسائل میں دخل دینے لگی جن سے معاشی اور عمرانی دونوں نقطہائے نظر سے بحث کی جا سکتی تھی۔ معاشیات کے "مذہب تاریخی" نے انسانی زندگی کی بہت سی تفصیلات کو معاشیات میں شامل کر لیا جو اصل میں اس علم سے تعلق نہیں رکھتیں بلکہ اُن اثرات کو ظاہر کرتی ہیں جو مقابلے پر مبنی عمل معاشی سے معاشرے کی فلاح و بہبود پر پڑتے ہیں۔ بعض نے تو یہاں تک کیا کہ اپنی تصانیف میں بہت سے سیاسی اور اخلاقی مسائل اور اُن امور کو شامل کر لیا جو معاشی زندگی کی خصوصیتیں نہیں بلکہ عمرانی زندگی کی ہیں۔ لیکن جب عمرانیات نے نشو و نما پائی اور اپنے دائرۂ تحقیق پر قبضہ کر لیا تو معاشیات کو اپنی اصلی حدود کے اندر واپس جانا پڑا۔ معاشیات میں اُن معاشرتی مظاہر سے بحث کی جاتی ہے جو دولت کی پیداوار اور تقسیم سے وجود میں آتے ہیں۔ اس کا مرکزی تصور دولت ہے اور صرف وہ معاشرتی مظاہر جو دولت سے قریبی تعلق رکھتے ہیں معاشی کہے جا سکتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ معاشی تعلقات بھی معاشرتی تعلقات ہیں مگر معاشیات کا طریق عمل اور ہے اور عمرانیات کا کچھ اور۔ اس کے مقاصد معین ہیں اور عمرانیات کے عام مقاصد میں شامل نہیں ہیں۔ مگر جو باتیں معاشیات میں ثابت کی جا چکی ہیں انھیں عمرانیات اپنے مقصد کے لئے استعمال کر سکتی ہے جس طرح کسی اور علم کے عام حقائق کو۔

غرض عمرانیات اور معاشیات میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ معاشیات ایک مخصوص دائرے میں کام کرتی ہے اور عمرانیات معاشرتی زندگی کے پورے میدان میں۔ معاشیات کا موضوع موجودہ معاشرتی زندگی بہ لحاظ دولت کے ہے اور عمرانیات اُن عام قوانین کی جستجو کرتی ہے جو معاشرے کے سارے نظام اور اس کے عمل میں کارفرما ہیں۔ ان علوم کی حدود پوری طرح معین ہیں، ان کے مقاصد سراسر مختلف ہیں اور ان کے مادی موضوع بالکل علحدہ ہیں البتہ کبھی کبھی دونوں علم ایک ہی طرح کے معاشرتی مظاہر سے بحث کرتے ہیں۔

۲۴۔ عمرانیات کا تعلق سیاسیات سے

سیاسیات جیسا کہ اُس کے نام سے ظاہر ہے حکومت کے علم کو کہتے ہیں

جس میں مقامی، ریاستی اور قومی یعنی مرکزی حکومت کے طریقوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے خصوصاً امریکہ میں اِس سے نظریۂ حکومت اور طریقِ انتظام مراد لیتے ہیں۔ اس کا موضوع فلسفۂ سیاست، ریاست کی نشو و نما اور سیاستِ عملی ہوتا ہے۔ اِس میں اصولِ حکومت کی تشریح کی جاتی ہے اور عمرانیات میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ اِن اصولوں کا اثر معاشرے پر کیا ہوتا ہے۔ جیساکہ اور اصولوں میں ہوتا ہے۔ یہاں بھی عمرانیات ایک دوسرے علمِ اجتماعی کے نتائج سے فائدہ اٹھاتی ہے۔ باوجودیکہ اِن دونوں علوم کے مقاصد میں بہت فرق ہے بعض اوقات ان کے میدانِ عمل میں حدِ فاصل مُعیّن کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ اساسی دستوروں اور ملکی نظم و نسق کے طریقوں کی تاریخ نوعِ انسانی کی ترقی کے ایک پہلو کو ضرور ظاہر کرتی ہے مگر یہ حقیقی معنی میں عمرانیات کا موضوع نہیں کہی جاسکتی۔

۳۵۔ عمرانیات کا تعلق تاریخ سے

تاریخ کا کام واقعات کا تفصیلی ثبوت مُہیا کرنا ہے اور عمرانیات کا کام عام اصول اور قوانین مُعیّن کرنا ہے۔ مثلاً تاریخ کو سلطنتِ روما کے عروج و زوال کی داستان بیان کرنا ہو تو وہ نہایت تفصیل سے وہ سب واقعات بیان کرے گی جو ہر ہر قدم پر پیش آئے اور اس کے بعد خاموش ہو جائے گی بہ خلاف اِس کے عمرانیات کو اِن تفصیلات سے محض اس حد تک تعلق ہے کہ ان سے نوعِ انسانی کی ترقی کے متعلق عام اصول اخذ کرے۔ البتہ تاریخ کے بعض شعبے خالص عمرانیات کے دائرۂ نظر سے زیادہ نزدیک ہیں مثلاً فلسفۂ تاریخ تعمیرِ قومیت کے اسباب و نتائج سے بحث کرتا ہے اور اِس سے انسانی معاشرے کی منفرد جماعتوں کی نشو و نما کے متعلق عام اصول اخذ کئے جاسکتے ہیں۔ بہت سی باتیں جو عمرانیات کے نام سے لکھی گئی ہیں اصل میں فلسفۂ تاریخ میں شامل ہیں اور اکثر فلسفۂ تاریخ کا دائرۂ نظر اتنا وسیع رہا ہے کہ وہ عمرانی فلسفہ بن گیا۔ مگر عمرانی فلسفہ استخراجی منہاج اختیار کرتا ہے اور عمرانیات استقرا سے کام لیتی ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ تاریخ کو عمرانی مسائل سے کوئی واسطہ نہیں۔ بہت سے مورخوں نے تاریخ

کے اِس پہلو کی طرف سے غفلت برتی ہے لیکن جوں جوں فن تاریخ ترقی کرتا جاتا ہے اُس کا دائرۂ نظر وسیع ہوتا جاتا ہے اور اُس کی اہمیت بہ حیثیت ذہنی ترتیب کے ایک ذریعے کے بڑھتی جاتی ہے۔ تاہم یہ فن کتنا ہی وسیع کیوں نہ ہو جائے تمام عمرانی مسائل پر حاوی نہیں ہو سکتا۔ محض معاشرے کے متعلق امور کا بیان کر دینا اجتماعی علم ہونے کے لئے کافی نہیں۔

۳۶۔ عمرانیات کا تعلق علم الانسان سے

علم الانسان وسیع ترین معنی میں انسان کی جسمانی، ذہنی اور عمرانی زندگی کے علم کو کہتے ہیں۔ اِس کے بعض حصوں میں عمرانیات کا رنگ پایا جاتا ہے مثلاً وہ حصہ جس میں انسان کے فطری عام زندگی اور عمرانی خصوصیتوں کا مقابلہ کیا جاتا ہے۔ لیکن علم الانسان محدود معنی میں محض نوعِ انسانی کی حیاتی نشو و نما کی تاریخ کا نام ہے۔ جب تک یہ علم اتنی صحیح حد کے اندر رہتا ہے۔ حیاتیات، نفسیات، عمرانیات، سیاسیات، معاشیات وغیرہ میں دخل نہیں دیتا۔ اِس کا سب سے اہم مقصد یہ ہے کہ انسان کا مطالعہ بہ حیثیت ایک حیوان کے کرے جو اپنی ذہنی اور جسمانی خصوصیتیں اور اپنا مخصوص طرزِ زندگی رکھتا ہے اور اُس کا مقابلہ دوسرے حیوانوں سے کرے۔ اِس کا مقصد اور اجتماعی علوم سے مختلف ہے مگر اِس کے بعض شعبے عمرانیات سے بہت قریبی تعلق رکھتے ہیں اسی لئے اِس کا شمار اجتماعی علوم میں ہوتا ہے۔ اگر یہ خالص حیاتی علم ہوتا اور محض انسان کی جسمانی ساخت یعنی عضویات اور تشریح سے بحث کرتا تو حیوانیات کی ایک شاخ سمجھا جاتا۔ مگر اِس کا جزو غالب غیر متمدن انسانوں کی اجتماعی زندگی کا بیان ہوتا ہے کیونکہ وہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی دونوں طرح کی خصوصیتوں کو دکھانا چاہتا ہے۔ علم الانسان کے کئی شعبے ہیں مثلاً جسمیات جس میں جسمانی خصوصیات کا تعین کیا جاتا ہے، جسم جس میں انسانوں کے جسم کی پیمائش سے بحث ہوتی ہے، نسلیات جس میں نسلی خصوصیتوں کا ذکر ہوتا ہے، علم الاقوام جس میں ان نسلوں کی اصل، ان کی چھوٹی چھوٹی شاخوں میں تقسیم اور سطح ارض کے مختلف حصوں

میں پھیلنے کا ذکر ہوتا ہے۔ لیکن ان میں سے کوئی ایک یا سب مل کر بھی عمرانیات کے قائم مقام نہیں ہو سکتے۔

ہربرٹ اسپنسر نے اپنی کتاب "اصولِ عمرانیات"[1] اور لیتیورنو[2] نے اپنی "عمرانیات" میں اکثر جگہ ایسے مسائل کا ذکر کیا ہے جو اصل میں خالص عمرانیات سے نہیں بلکہ علم الانسان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اُن کا موضوع معاشرے کا نسلیاتی پہلو ہے۔ اسپنسر کی "اصول عمرانیات" کی پہلی دو جلدوں میں عمرانیات کے بنیادی مسائل پر بحث کی گئی ہے جہاں تک ان کا تعلق غیر متمدن قوموں سے ہے۔ لیتیورنو نے غیر متمدن قوموں کی عمرانی حالت تفصیل سے بیان کی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان دونوں کی تصانیف سے عمرانیات کی بنیاد قائم کرنے میں مدد ملی ہے لیکن عمرانیات کا اصل موضوع وہیں سے شروع ہوتا ہے جہاں پہنچ کر ان دونوں کا قلم رک گیا ہے۔

۴۷۔ عمرانیات کا تصور مختلف لوگوں کے ذہن میں کیا ہے؟

جہاں بہت سے مصنف ایسے ہیں جو عمرانیات کو متعدد نقطہائے نظر سے مثلاً معاشیات، فلسفۂ تاریخ، علم الانسان، حیاتیات، یا سیاسیات وغیرہ کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں وہاں بعض ایسے بھی ہیں جو عمرانیات کا موضوع صرف ایک سمجھتے ہیں۔ ان میں سب سے ممتاز موسیو تارد ہے ہیں جنھوں نے اپنی کتاب "قانونِ تقلید"[3] میں عملِ عمرانی کے محض ایک پہلو پر غیر معمولی طور پر زور دیا ہے اور ہر چیز کو اُسی کے رنگ میں رنگ دیا ہے۔ آگے چل کر "عمرانی قوانین" میں انھوں نے یہ کوشش کی ہے کہ عمرانیات کو تین بنیادی تصورات یعنی "معادوت، تضاد اور تطابق" میں محدود کر دیں۔ گڈنگز نے "اصولِ عمرانیات" میں اس علم کا مطالعہ صرف ایک بنیادی اصول "احساسِ نوعی" کے نقطۂ نظر سے کیا ہے البتہ انھوں نے اپنی بعد کی تصانیف میں عمرانیات کے دائرے کو وسیع کر کے "احساسِ نوعی"

---

[1] Principles of Sociology.

[2] Letourneau : Sociology.

[3] Trade : Law of Imitation.

کو ایک ضمنی چیز بنا دیا ہے اور سچ پوچھئے تو گو یہ ایک بہت اہم تصور ہے مگر اس کی واقعی حیثیت بس اتنی ہے جتنی اُسے یہاں دی گئی ہے گمپلو وِلِس نے اپنی کتاب "نسلوں کی جنگ"[1] میں سو سائٹی کی نشو و نما مختلف نسلوں کے تصادم کے نقطۂ نظر سے دکھائی ہے اور تنازع یا جنگ کو ارتقا کی بنیاد مانا ہے۔ نو وِکو نے[2] "انسانی معاشروں کی کشمکش" میں اسی بات کو ایک دوسرے انداز میں بیان کیا ہے۔ اِن سب کے بعد پھر وہ نیا نقطۂ نظر ہے جسے وارڈ نے "لاشعوری عمرانی ضبط" کہا ہے۔ اِس کے علم بردار بہت سے مصنف ہیں جو یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ سوسائٹی کی بنیاد ان افراد کے اخلاقی یا نفسی عمل سے پڑتی ہے جو ہل جل کر رہتے ہیں۔ اِس میں شک نہیں کہ یہ ایک نہایت اہم خصوصیت ہے اور ہر منظم معاشرے میں پائی جاتی ہے۔ عمرانیات کا یہ تصور کسی مکمل نظام کی صورت میں ظاہر نہیں ہوا ہے بلکہ زیادہ تر اُن کتابوں میں پایا جاتا ہے جو عمرانیوں نے مخصوص مسائل پر لکھی ہیں۔ اِس کی عمدہ مثال راس کی "معاشرتی نظم و ضبط"[3] اسپنسر کی "رسم و رواج"[4] اور دورہکائم کی "عمرانیات کے قوانین اور طریقے"[5] میں نظر آتی ہے۔

۳۸۔ عمرانیات کی بنیادیں

اِس میں شک نہیں کہ عمرانیات کے متعلق یہ تصورات اہمیت رکھتے ہیں مگر اِس علم کا موضوع اتنا وسیع ہے کہ ان میں سے کوئی تصور اُس پر پوری طرح حاوی نہیں ہو سکتا۔ مکمل عمرانیات وہ کہلائے گی جو ان سب خیالات کے اُن اجزا کو جو معیارِ تحقیق پر پورے اتریں منطقی ترتیب کے ساتھ ایک نظام کی صورت میں لے آئے۔

ل۱ Gumplowicz : Der Rasse kampf

ل۲ Novicow : Les luttes entre societies humaines

ل۳ Ross : Social Control

ل۴ Spencer : Ceremorial Institutions

ل۵ Dunkheim : Laws and Methods of Sociology

گراس کے لئے ایک جید اور ضخیم کتاب کی ضرورت ہے۔ ایک معمولی درسی کتاب میں اس کی گنجائش نہیں۔ یہاں تو ہم اسی پر قناعت کریں گے کہ طالب علم کو عمرانیات کی عام نشو ونما کا مطالعہ کرائیں اور یہ دکھائیں کہ معاشرے میں کیا کیا تغیرات ہوتے ہیں اور کون کون سے قوانین کارفرما ہیں۔

باب سوم

عمرانیات کا مقصد اور منہاج

۳۹ - مقصد

پچھلے باب میں ہم وضاحت کے ساتھ دکھا چکے ہیں کہ علوم اجتماعی میں عمرانیات کی کیا حیثیت ہے۔ اور اس کا موضوعِ بحث کیا ہے۔ اس کا علمی مقصد یہ ہے کہ معاشرے کے متعلق کلّی قوانین معلوم کرے یا کم سے کم جو معلومات حاصل ہو سکے اُسے عام قوانین کی صورت میں بیان کرے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے بڑے وسیع مطالعے کی اور معاشرے کے متعلق تمام امور پر عبور حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ اِس کے طالب علم کے لئے سب سے مقدم واقعات نفس الامری ہیں۔ اِن سے مراد محض مادّی واقعات نہیں، گو انھیں مدِّ نظر رکھنا بھی ضروری ہے، بلکہ نفسیاتی، اخلاقی اور عمرانی واقعات جو مادّی دنیا سے جدا وجود رکھتے ہیں۔ کیونکہ دوسرے علوم کی طرح یہاں بھی علمی تحقیق کی پہلی منزل واقعات کا جمع کرنا اور انھیں ترتیب دینا ہے۔ ان میں سب سے اہم معاشرتی تعلقات ہیں۔ معاشرے کی واقعی حالت کا صحیح علم حاصل کرنا ضروری ہے اور اس میں اس سے کام نہیں چلتا کہ ہم بیٹھ کر فلسفیانہ تخیل کے گھوڑے دوڑایا کریں کہ معاشرہ ہونا کیسا چاہیے کیونکہ اِس سے تو محض ایک خیالی معاشرے کے متعلق کلیے قائم کئے جا سکتے ہیں۔

پھر بھی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اِس علم کا اصل مقصد تبھی حاصل ہوگا جب یہ نوعِ انسانی کی اجتماعی بہبود اور انفرادی راحت میں ممِد و معاون ہو۔ اِس میں معاشرتی کردار کے معیار پر غور کرنا بھی ضروری ہے۔ اِس لئے عمرانیات کا مقصد محض اس سے پورا نہیں ہوتا کہ معاشرتی مظاہر کی تفصیل اور ترتیب بیان کی جائے، معاشرتی قوتیں دریافت کی جائیں اور معاشرتی زندگی کی کیفیت اور نشو و نما دکھائی جائے اِس کا یہ بھی کام ہے کہ بہتر معاشرتی زندگی بسر کرنے کی راہ دکھائے اور نظام کی اصلاح کی تدبیریں بتائے۔

۴۰۔ معاشرے کی علتِ غائی

معاشرے کی علتِ غائی یہ ہے کہ انسانوں کی ایک جماعت کو مُضر خارجی اثرات سے محفوظ رکھے جو افراد کو ہلاک کر دیتے ہیں۔ یہ فطری قوتوں کے مقابلے میں دو مقاصد کو مدِ نظر رکھ کر قائم کی گئی ہے۔ اِس کا مقصدِ اولے جماعت کی بقا ہے اور مقصدِ ثانوی فرد کی حفاظت ہے۔ اس کا کام یہ بھی ہے کہ بہت سے افراد کے باہمی امداد اور اتحادِ عمل سے اپنے آپ کو خود اُن ارکان سے بھی محفوظ رکھے جو اس کی تخریب کے درپے ہوں۔ معاشرہ نسلِ انسانی کی خونخوار جانوروں سے، فطرت کی شدید قوتوں سے اور جنگجو انسانوں سے حفاظت کرتا ہے۔ اس کے علاوہ تنظیم انصاف کے ذریعے سے وہ جماعت کے حلقے کے اندر افراد کی دادرسی کرتا ہے اور انھیں ایک دوسرے کو ہلاک کرنے سے باز رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس معاشرے کا یہ مقصد ہو اُس کے منظم مطالعے سے ایک ایسا علم مدون ہوتا ہے جسے محض معاشرتی تغیرات ہی سے سروکار نہیں بلکہ نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود سے بھی واسطہ ہے۔ اور یہی سبب ہے کہ یہ علم علومِ اجتماعی میں سب سے اہم ہے کیونکہ یہ براہِ راست روزمرہ کی زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔

۴۱۔ معاشرے کے متعلق حل طلب مسائل

جن مسائل سے عمرانی کو واسطہ پڑتا ہے وہ مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ غالباً

ان سب میں بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ معاشرے کی اصل ساخت اور حرکت کا صحیح تصور قائم کیا جائے۔ معاشرے کے اجزا اور اُس کے وظائف یا مشاغل اور اُن کے باہمی علاقوں کا صحیح علم طالبِ علم کے لئے سب سے زیادہ اہم ہے۔ اِسے نہ صرف معاشرتی مظاہر سے بلکہ ان کے اسباب و نتائج سے بھی واقف ہونا ضروری ہے۔

یہ بات بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتی کہ جو معاشرتی مظاہر بار بار ظہور میں آتے ہیں ان میں باقاعدگی ثابت کی جائے۔ بغیر اِس کے کوئی قطعی نتائج حاصل نہیں کئے جا سکتے۔ ایک اور نہایت اہم مسئلہ یہ ہے کہ انسان کا ارادہ معاشرے کی نشو و نما کی تشکیل میں مختار ہے یا مجبور۔ اِسی مسئلے کے حل پر اِس کا انحصار ہے کہ معاشرے کی نشو و نما کس حد تک فطری ہے اور کہاں تک ذہن اجتماعی کے نظم و ضبط کی رہینِ منت ہے۔ یہیں سے شعورِ اجتماعی کی بحث چھڑ جاتی ہے اور اِس کے علاوہ اُس بات کا بھی یقین ہوتا ہے کہ اجتماعی جد و جہد میں فرد کی کیا حیثیت ہے اور اُس کا کتنا اثر ہے۔ اِس کے بعد ارتقائے نامیہ کے اصولوں کو معاشرے پر عائد کرنے کا مسئلہ ہے۔ اگر ترقی کی بنیاد افراد اور نسلوں کے تنازع پر اور بقائے اصلح پر ہے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نوعِ انسانی کے لئے امن زیادہ مفید ہے یا جنگ؟

اِسی کے ساتھ اخلاقی اور مذہبی تربیت ذہنی طرزِ حکومت اور ہیئت سے اور معاشرتی مسائل پر غور کرنا ضروری ہے جو بہترین انفرادی اور اجتماعی زندگی کا طریقہ دریافت کرنے میں ممد و معاون ہوتے ہیں۔

۴۲۔ عمرانیات کا منہاج

عمرانیات کے منہاج کے معین کرنے میں ایک تو اِس بات کا لحاظ کرنا پڑتا ہے کہ اِس علم کی ماہیت کیا ہے اور دوسرے اِس کا کہ دوسرے علوم کے مقابلے میں اِس کی حیثیت کیا ہے؟ فی الحال تو یہ محسوسات کا علم ہے مگر اِس کا رجحان اِس طرف ہے کہ مجردات کا علم بن جائے۔ جس طرح معاشیات کی ابتدا چند مخصوص مظاہر کے مشاہدے سے ہوئی تھی اور آخر میں یہ ایک مجرد علم بن گیا اسی طرح

جوں جوں عمرانیات میں زیادہ عام قوانین دریافت ہوتے جاتے ہیں اس کا قدم بھی اس راہ پر بڑھتا جاتا ہے مگر معاشیات مجرّد علم کی حیثیت سے بھی محسوس واقعات سے بے تعلق نہیں ہو سکتی۔ پچھلے چند سال سے تو یہ کوشش ہو رہی ہے کہ اس علم میں محسوسات پر اور بھی زیادہ زور دیا جائے۔ معاشی جوں ہی کلّی قوانین قائم کر چکتا ہے اُسے از سرِ نو اپنی پوری توجہ محسوس مظاہر کی تحقیقات کی طرف منعطف کرنی پڑتی ہے اور عمرانیات کے متعلق تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کا شمار ابھی سالہا سال تک اِن علوم میں ہو گا جن کی موضوع محسوسات ہیں۔ معاشرے کی زندگی میں انسان کی تخلیقی قوت کی بدولت جو تغیرات ہوتے رہتے ہیں وہ اِس علم کو محسوسات کی حد سے باہر نہیں جانے دیں گے۔ تاہم اِس علم کی جان کلیات ہیں اور گو اس کے مطالعے کے لئے واقعات کا جمع کرنا لازمی ہے مگر اس کی ترقی کا سوائے اِس کے کوئی طریقہ نہیں کہ کلیات مدوّن کئے جائیں۔

۴۳۔ مشاہدۂ محسوسات کا منہاج

معاشرے کی تحقیقات کا طریقہ ہمیشہ یہی رہے گا کہ پہلے اِس کے اجزا کی زندگی کا مشاہدہ کیا جائے اور پھر اس کی مجموعی زندگی کا۔ اِس وجہ سے یہ ہمیشہ ایک بیانی علم اور اُس کا موضوع محسوس واقعات رہیں گے اور اُس کے نتائج کی بنیاد مجرد استدلال پر نہیں بلکہ مشاہدے پر رہے گی۔ معاشرے کے متعلق فلسفیانہ خیال آرائی جو واقعات کی مبصرانہ تعبیر سے بے نیاز تھی بہت کچھ ہو چکی ہے بلکہ سچ پوچھئے تو کوئی علمِ اجتماعی ایسا نہیں جس نے یہ طرزِ عمل اختیار کر کے یعنی محسوسات کے مشاہدے سے غافل ہو کر استخراجی استدلال سے کام لے کر نقصان نہ اٹھایا ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نظری مسائل کا ایک انبار جمع ہو جاتا ہے اور کچھ ضروری نہیں کہ اس انبار سے سائنس کی نشو و نما یا نوعِ انسانی کی ترقی میں مدد ملے۔ تاہم اِس میں شبہ نہیں کہ کلیات قائم کرنا اور عام قوانین مدوّن کرنا بھی بہت ضروری ہے۔ علم محض واقعات کے جاننے کا نہیں بلکہ ان کی صحیح ترتیب اور استعمال کا نام ہے جس کے لئے تجرید اور تعمیم لازمی ہے۔ معاشرتی مظاہر کی تعداد اس قدر

زیادہ ہوتی ہے کہ عمرانیات کے طالب علم کے لئے معینہ نتائج پر پہنچنے سے پہلے ان مظاہر کا جمع کرنا، انہیں مختلف قسموں میں تقسیم کرنا اور منطقی ترتیب سے مرتب کرنا ضروری ہے۔ آج کل کے بڑے بڑے عمرانیوں کے پاس بھی معاشرے کی ساخت اور اس کے اعمال کے متعلق معلومات و واقعات کا کافی ذخیرہ فراہم نہیں۔ مگر خواہ معاشرتی مظاہر کے مشاہدے میں کتنی ہی دقتیں کیوں نہ ہوں معاشرے کے ایک باضابطہ علم کی تعمیر کی بنیاد سوائے اس کے اور کوئی نہیں ہو سکتی۔

۴۴۔ دوسرے علوم سے حاصل کی ہوئی معلومات

گو عمرانی اپنے فن کی تحقیق کا ایک مستقل اور جداگانہ دائرہ رکھتا ہے مگر کبھی کبھی وہ دوسرے علوم کے نتائج کو قبول کرتا ہے اور اُن کی جمع کی ہوئی معلومات سے کام لیتا ہے۔ مثلاً حیاتیات سے جو معلومات جسمِ انسانی کے متعلق یا اجتماع کے ابتدائی اسباب کے متعلق یا وراثت کے اثرات کے متعلق حاصل ہوتی ہے اُسے کوئی عمرانی ناقابلِ التفات سمجھے تو یہ اُس کی نادانی ہوگی کیونکہ یہ چیزیں معاشرتی نشو و نما کے ابتدائی اسباب ہیں اور عمرانیات میں داخل ہیں۔ اسی طرح نفسیات نے ہمیں فرد کے نفس کے متعلق جو کچھ سکھایا ہے وہ بھی بھولنے کی چیز نہیں کیونکہ نفسِ اجتماعی کا منبع ہی انفرادی نفس ہے۔ معاشیات نے ہماری معاشی زندگی کے متعلق بہت سے اصول اور قوانین بنائے ہیں اور بہت سے معلومات اکٹھا کی ہے جس سے عمرانیات کی نشو و نما میں کام لیا جاسکتا ہے۔ یہی حال سیاسیات، اخلاقیات اور تاریخ کا ہے۔ آخر ان سب علوم میں بھی معاشرتی زندگی کی چھان بین ہوتی رہی ہے۔ پھر اگر عمرانی ان نتائج کی طرف سے آنکھیں بند کرلے جو ان علوم میں حاصل ہو چکے ہیں اور کئے ہوئے کام کو دوبارہ کرے تو اسے تضییعِ اوقات کے سوا اور کیا کہیں گے۔ لیکن جیسا ہم پچھلے باب میں کہہ چکے ہیں عمرانیات کو ان علوم کا مجموعہ نہیں سمجھنا چاہئے نہ اسے محض اس بنا پر ذہنی علم قرار دے دینا چاہئے کہ اس کا موضوع ذہن رکھنے والے

انسانوں کی معاشرتی زندگی ہے اِس کا دائرہ اِن سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔

۴۵۔ عمرانیات میں اور دوسرے اجتماعی علوم میں مابہ الامتیاز اس کی عمومیت ہے۔

عمرانیات اپنا ایک مستقل اور مخصوص مقصد اور ایک معین مبحث رکھتی ہے اِس لئے اگر یہ دوسرے علوم کے نتائجِ تحقیق سے کام لے تو اِس سے اِن علوم کی قدر و قیمت کم نہیں ہوتی۔ عمرانیات کے عام قوانین کا دائرہ بہت وسیع ہوتا ہے اور دوسرے اجتماعی علوم کا موضوع اور مبحث محدود ہوتا ہے۔ مثلاً تاریخ کا خاص کام یہ ہے کہ کسی جماعت کے اخبار قلمبند کرے اور واقعات سلسلہ وار مرتب کرے مگر عمرانیات کو اِس روداد سے محض اس حد تک سروکار ہے جہاں تک اس سے عام اور دائمی موثرات کے معلوم کرنے میں اور معاشرتی نشو و نما کے قوانین دریافت کرنے میں مدد ملتی ہے۔ اِس قسم کے کلیے قائم کرنے میں بڑی مشکلوں کا سامنا ہوتا ہے اسی لئے اس علم کی ترقی کی رفتار بہت سست ہے

۴۶۔ استدلال کا طریقہ

اصل میں عمرانیات استقرائی علم ہے مگر دوسرے علوم کی طرح اس میں بھی استخراجی منہاج سے کام لیا جاتا ہے۔ موسیو کونٹ[1] جنھوں نے پہلے پہل عمرانیات کی تدوین کا باضابطہ اعلان کیا اسے بیانی اور مشاہدے پر مبنی علوم میں شمار کرتے ہیں لیکن اُن کی تصانیف میں اِس کی حیثیت استقرائی علم کی نہیں بلکہ فلسفۂ اجتماع کی ہے۔ مگر اب کچھ دنوں سے اِس کی نشو و نما استقرا کے طریق پر ہو رہی ہے پہلے مشاہدے کی مدد سے واقعات اور معلومات جمع کر کے ترتیب دیتے ہیں اور پھر عام اصول کا استخراج کرتے ہیں۔

مصنفین نے استخراجی استدلال سے تو بہت کچھ کام لیا ہے مگر استخراج کے ذریعے سے عام اصول مُدوّن کرنے کی کوشش بہت کم کی گئی ہے۔ اِس علم کی

[1] M. Comte.

نشو و نما اصل میں اس طرح ہوتی ہے کہ محسوس مظاہر کا مشاہدہ کیا گیا اور ان میں سے جو واقعات بار بار رونما ہوتے ہیں اُن کی بنا پر عام اصول قائم کئے گئے۔
خود معاشرے کی تعمیر تجربی اصول پر ہوتی ہے۔ ہر نئی جماعت یا ادارہ زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور پرانے رسم و رواج اور قوانین "قانون بقا" کے ماتحت ترک کر دئے جاتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تغیر پذیر تجربی بنیاد پر کوئی باضابطہ علم جو علوم متعارفہ عملی مفروضات اور قابل ثبوت قضیوں پر مبنی ہو مدوّن نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن چونکہ کسی بحث کا دائرہ بغیر دونوں طریقوں سے کام لئے مکمل نہیں ہوسکتا اس لئے استقرائی منہاج کے ساتھ ساتھ استخراجی منہاج بھی ہمیشہ استعمال ہوتا رہے گا۔

۱۴۔ علمی منہاج کو مدنظر رکھنا ضروری ہے

خواہ ہم کسی طریق استدلال سے کام لیں یہ بات بہت ضروری ہے کہ عمرانی مظاہر کی تحقیق میں ہمیشہ علمی منہاج کی سختی کے ساتھ پابندی کی جائے۔ کونت نے سب سے پہلے یہ طریقہ اختیار کیا اور مدارج علوم میں عمرانیات کو ممتاز درجے پر رکھا۔ اور اسپنسر نے بھی ابتدا ہی سے زیادہ وسیع معلومات کی ضرورت کو تسلیم کیا اور اسی خیال سے اُس نے "عمرانیات بیانی"[1] لکھی اور اپنی "اصول عمرانیات" میں بھی بہت سے معاشرتی واقعات اور جمع کر دئے۔ وارڈ نے اپنی "حرکی عمرانیات" میں تمام بڑے مسائل کی بحث طریق مشاہدہ کے مطابق کی ہے اور آخر میں استخراجی طریقے سے کام لیا ہے۔ مگر اکثر مصنفوں نے بس اتنا کیا ہے کہ اپنے تاثرات کو قلمبند کر دیا یا زیادہ سے زیادہ اپنے اپنے نقطۂ خیال سے نظرئے قائم کر دئے۔ دنیا کی ترقی اسی نسبت سے ہوئی جس نسبت سے اس کے مظاہر میں ترتیب قائم ہوئی۔ علم نے بھی واقعات اور حقائق

[1] Spencer : Descriptive Sociology.

کی دریافت اور ترتیب کی مناسبت سے آگے قدم بڑھایا لہذا عمرانیات کی ترقی بھی اسی نسبت سے ہوگی جس نسبت سے خیال آرائی کم ہوتی جائے اور مکمل علمی تحقیق بڑھتی جائے۔

۴۸۔ عمرانیات کے مختلف پہلو

عمرانیات کے بیانی پہلو کو زیادہ نمایاں کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ بیان ہی کے ذریعے سے اُس کے موضوع کا تصور واضح ہو سکتا ہے اس کے بغیر لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً بہت سے لوگوں نے بے تکلف ٹرسٹ یا شرکتِ تجار کے متعلق بہت کچھ لکھ ڈالا حالانکہ وہ اس کی ماہیت، اصل اور نشو ونما سے بالکل واقف نہ تھے۔ ان کے خیالات لاعلمی پر مبنی تھے اِس لئے اُن کے نتائج زیادہ تر بیکار ہیں۔ "زر" نکاح اور طلاق" "تعلیم" "اشتراکیت" "اوقاف" "سرمایہ اور محنت" وغیرہ کے متعلق بھی جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں کام کی باتیں بہت کم ہیں کیونکہ اِن مسائل کے متعلق واقعات و حقائق سے لوگ واقف نہ تھے اور نہ یہ جانتے تھے کہ ان چیزوں کا اور دوسری چیزوں سے کیا تعلق ہے۔

اعداد و شمار کا اِس علم میں معقول عنصر ہونا ضروری ہے اور اِن کا دائرہ جہاں تک ہو سکے معاشرتی نشو ونما کے پورے میدان کو محیط ہونا چاہیئے۔ یہ اصل میں عمرانیاتِ عملی میں داخل ہیں اور ان کی نوبت تب آتی ہے جب عمرانیاتِ نظری نشو ونما پا چکی ہو۔ معاشرے کی ارتقا کا مطالعہ بھی معاشرتی زندگی کے سمجھنے میں بہت کچھ مدد دیتا ہے اور اس کے علاوہ یہ واضح کر دیتا ہے کہ معاشرے کی تعمیر کن قوتوں سے ہوئی ہے اور اس میں کون سے قوانین کارفرما ہیں؟

اگرچہ اصل موضوعِ بحث طبعی معاشرہ ہے مگر معاشرے کی بگڑی ہوئی شکلوں کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ اکثر اِنھیں شکستہ اجزا میں معاشرتی ترقی اور انحطاط کے اصلی قوانین نظر آتے ہیں جس طرح چاندی کی کان

میں چاندی کا اصل خزانہ معدنی چیزوں کی پرت میں ملتا ہے اسی طرح معاشرے کے گرے ہوئے طبقوں کے مشاہدے سے اکثر طبعی معاشرے کی حقیقت کا علم ہوتا ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ یہ مشاہدہ مکمل اور علمی تنقید پر مبنی ہو، جذبات پرستی کے بحران اور فلسفیانہ ہیجان کا نام بھی نہ ہو۔ معاشرتی مرضیات سے بھی معاشرتی عمل کے اخلاقی معیار قائم کرنے میں بہت اہم نتائج حاصل ہو سکتے ہیں۔

حصۂ دوم

معاشرے کی ارتقاء

حِصّۂ دُوم

معاشرے کی ارتقا

بابِ اوّل

معاشرے کی ابتدا

۴۹۔ عام عمرانی ارتقا

عمرانی ارتقا کے مطالعے کا مقصد یہ ہے کہ طالب علم کو عمل ارتقا کی ابتدا اور ماہیت معلوم ہو جائے اور یہ بات ہمیشہ اُس کے پیشِ نظر رہے کہ معاشرے کا آغاز ایک سادہ اور محدود صورت میں ہوا تھا رفتہ رفتہ اُس کے شعبے اور وظیفے ایک ایک کر کے بڑھتے گئے۔ اِس حقیقت کی اہمیت اس امر سے اور بڑھ جاتی ہے کہ نشوونما ایک مستقل رفتار سے ہوتی ہے۔ اس کی حرکت کبھی نہیں رُکتی۔ اِس کا دائرہ ہر لحظہ پھیلتا جاتا ہے، اِس کی حالت میں ہمیشہ تغیر ہوتا رہتا ہے۔ ساکن معاشرے کا تصور کام چلانے کے لئے ایک اچھا فرضیہ ہے جس سے مختلف مظاہر کے باہمی علاقے متعین کرنے میں مدد ملتی ہے لیکن حقیقی وجود متحرک معاشرے ہی کا ہے اور اِسی کے مطالعے سے معقول نتائج حاصل ہو سکتے ہیں۔

عمرانی ارتقا کا بیان کرنا خصوصاً ایک مختصر سے رسالے میں بہت مشکل کام

ہے کیونکہ معاشرے کی نشو و نما کسی ایک مرکزی تصور سے نہیں ہوئی بلکہ اِس کی تہہ میں بہت سے تصورات ہیں جن میں کبھی بہت قریبی رابطہ رہا ہے اور کبھی ایک دوسرے سے بالکل جدا رہے ہیں اِس لئے اس کی ارتقا اس طرح نہیں دکھائی جاسکتی کہ مختلف مدارج یکے بعد دیگرے وضاحت کے ساتھ بیان کر دیئے جائیں جیسے بیج سے درخت کا اگنا دکھاتے ہیں بلکہ ہمیں اس کے مختلف شعبوں مثلاً مذہب، حکومت، قانون، خاندان وغیرہ کا ذکر الگ الگ کرنا پڑے گا کہ کس طرح ہر ایک نے سادہ صورت سے رفتہ رفتہ پیچیدہ صورت اختیار کی، کس طرح ان کے باہمی ربط سے معاشرے میں استحکام پیدا ہوا اور اس کی جد و جہد کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔ یہاں ہم صرف اتنا کر سکتے ہیں کہ پہلے اس کے مختلف شعبوں کا آغاز دکھائیں اور پھر عمرانی ارتقا کے خاص خاص مدارج کا ایک مختصر سا نقشہ کھینچ دیں۔

۵۰۔ حیوانوں کی اجتماعی زندگی

عمرانیات کا اصل موضوع تو انسانی معاشرہ ہے مگر یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم یہاں حیوانوں کی زندگی کی طرف بھی ذرا سا اشارہ کر دیں تاکہ ظاہر ہو جائے کہ عمرانی تنظیم کی ایک ہلکی سی جھلک ان حیوانوں میں بھی پائی جاتی ہے جو مدارجِ وجود میں انسان سے کمتر درجہ رکھتے ہیں۔ اِس طرح طالبِ علم کو وہ بنیاد مل جائے گی جس پر معاشرے کے قصرِ رفیع کی بالائی منزلیں تعمیر ہوئی ہیں اور اِس بات کا بھی پتہ چل جائے گا کہ معاشرے کی بنا دورِ انضباط سے پہلے محض جسمانی ضروریات پر تھی اور اِس کی نشو و نما عقل کی ترقی کے ساتھ ساتھ ہوئی۔ حیوانوں کے معاشرتی اعمال سے انسانوں کے معاشرتی اعمال تک جو ارتقا ہوئی وہ مسلسل نہیں دکھائی جاسکتی کیونکہ اِن دونوں کے درمیان ایک خلیج حائل ہے جسے علمی تحقیق آج تک عبور نہیں کر سکی۔ تاہم انسانوں کی ادنےٰ اور حیوانوں کے اعلیٰ معاشرے میں باہم بہت سی باتوں میں مشابہت ہے۔ یہ فرق ضرور ہے کہ انسانوں کے اجتماع میں تنوع اور ہمہ گیری نہیں

زیادہ ہے لیکن اگر تنازع اور بقا کے قانون کو دیکھئے تو یہ حیوانی اور انسانی معاشرت دونوں میں کارفرما ہے۔ اجتماع للحفظ کا اصول بھی دونوں جگہ ایک ہی ہے۔ البتہ وہ اجتماعی جبلّت جو اُنس کہلاتی ہے اور خالص ذوقِ محبت پر مبنی ہے حیوانوں میں انسانوں سے کم نظر آتی ہے۔ جنسی جبلت دونوں جگہ بہت اہمیت رکھتی ہے لیکن حیوانی معاشرے میں اِس کا اتنا زور شور نہیں جتنا انسانی معاشرے میں ہے۔ سب سے بڑا فرق ایثار کا ہے جو انسانی جماعت میں بہت تیزی سے نشو و نما پاتا ہے اور عقل کا جس کی بدولت انسانوں میں اعلیٰ درجے کی تنظیم اور اتحادِ عمل موجود ہے۔ غرض حیوانی معاشرے میں بہت سی اجتماعی صفات ابتدائی صورت میں موجود ہیں مگر ادنےٰ درجے سے آگے نہیں بڑھتیں اور انسانی معاشرے میں یہ سب اور اِن کے علاوہ اور بہت سی صفات اعلیٰ درجے کی ترقی یافتہ صورت میں پائی جاتی ہیں۔

حیوانوں کی دو بڑی قسمیں نظر آتی ہیں جن میں سے ایک غول پسند ہے اور دوسری غیر غول پسند۔ عام طور سے یہ دونوں قسمیں سبزی خور اور گوشت خور قسموں سے مطابقت رکھتی ہیں۔ پہلی قسم کے حیوان اپنی حفاظت اور خاندانی زندگی میں اتحادِ عمل رکھتے ہیں اس لئے ان میں کچھ ابتدائی معاشرتی صفات پیدا ہو جاتی ہیں۔ دوسری قسم کے حیوانوں میں انفرادیت غالب ہے۔ یہ تنہا رہتے ہیں اور شکار پر گزر کرتے ہیں۔

بعض مختلف نوع کے پرندے غیر شعوری طور پر مل جل کر کام کرتے ہیں اور ہر نوع والے آپس میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ بعض انواع اپنے علٰحدہ جھنڈ بنا لیتی ہیں۔ مثلاً بعض نوع کے پرندے ساتھ ساتھ تبدیلِ مکان کرتے ہیں، بعض لطفِ محبت یا خاندانی زندگی کی غرض سے ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہیں۔ لیکن ڈارون[۱] نے اِس مسئلہ کو صاف کر دیا ہے کہ پرندوں کے اجتماع میں اخلاقی حس کا پتہ نہیں چلتا۔ ان میں پچھلے اعمال پر غور کرنے اور

Darwin. ۱؎

موجودہ اعمال سے اُن کا مقابلہ کرنے کا مادہ نہیں ہوتا جس پر اخلاق کا دارومدار ہے۔

بارہ سنگوں کے جھنڈ ہم آہنگی اور امن کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں جب کوئی خطرہ درپیش ہوتا ہے تو اُن کے سرگروہ اپنے ساتھیوں کو آگاہ کر دیتے ہیں۔ ہاتھیوں کو لوگوں نے پانچ سے لے کر ڈیڑھ سو تک کے غولوں میں ساتھ رہتے دیکھا ہے۔ یہ غول خاندانی رشتوں کی بنا پر بنتے ہیں۔ پُرانی دنیا میں بندروں کے بہت سے خاندان مل کر ایک غول بناتے ہیں۔ ایک قسم ایسی بھی ہے جو ایک سرگروہ کی ماتحتی میں حملے کیا کرتی ہے۔ ان کا سرگروہ اپنی فوج پر حکومت کرتا ہے، سنتری تعینات کرتا ہے اور احکام جاری کرتا ہے جن کو دوسرے سمجھتے ہیں اور اُن کی تعمیل کرتے ہیں ایک اور قسم بقول بریم[1] کے اس سے بھی برتر تنظیم کا ثبوت دیتی ہے۔

۵۱۔ انسانوں کے گروہ

انسانوں کا اجتماع جس میں تنظیم نہ ہو گروہ کہلاتا ہے۔ گروہ کی زندگی بھی معاشرتی ارتقا کی ایک منزل ہے۔ آج کل گروہ کی کوئی کامل مثال موجود نہیں گو جنوبی امریکہ میں فیوجی نسل[2] اور اسٹریلیا اور ایشیا میں بعض نسلیں پائی جاتی ہیں جس میں کوئی تنظیم نہیں۔ یہ نسلیں خانہ بدوش ہیں اِن کا گھر کہیں نہیں ہے۔ اِن کے گروہ کبھی بڑے ہو جاتے ہیں اور کبھی چھوٹے۔ عارضی سردار تو اِن میں نظر آتے ہیں مگر مستقل تنظیم کا نام بھی نہیں۔ ان کی زندگی زمانے کے حادثوں کا کھلونا ہے۔ پھر بھی یہ گروہ ایک حد تک انسانی معاشرے کی بنیاد کا پتہ دیتے ہیں کیونکہ اسی سادہ اور ہم رنگ اجتماع نے نشو و نما پا کر ہمارے پیچیدہ اور گوناگوں معاشرے کی صورت اختیار کی ہے۔ گروہ کو کبھی کبھی معاشرے کا

---

[1] Brehm.

[2] The Fuegians.

تخر مایہ کہتے ہیں جس میں اجتماعی مرکزے موجود ہیں۔

۵۲۔ اجتماع کے اسباب

بہت سے موثرات نے مل کر افراد کو جماعت کی صورت میں مربوط کیا ہے ان میں زیادہ اہم حسب ذیل ہیں ذوقِ محبت جس میں جنسی کشش بھی شامل ہے، آب و ہوا، غذا، ہم جنسی کا احساس، انسانوں اور حیوانوں سے تحفظ کی ضرورت، ضبط و انضباط، صنعت و حرفت میں اتحادِ عمل اور زمین کی طبیعی حالت۔ ان سب کی بنا پر لوگ مل جل کر فطری جماعتیں بناتے ہیں۔ انسان کے تنہا رہنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی اور مل جل کر رہنے کی بہت سی وجہیں ہیں۔

۵۳۔ معاشرتی مرکزے

انسانی گروہ کے اندر کچھ چھوٹی چھوٹی جماعتیں ایسی پائی جاتی ہیں جو مقابلۃً زیادہ مربوط ہوتی ہیں۔ انہیں کو تنظیم کے مرکزے سمجھنا چاہیے چھوٹی چھوٹی صنعتی جماعتیں، خاندان، قبیلے اور مذہبی حلقے بن جاتے ہیں جو رفتہ رفتہ بے شکل گروہ میں معاشرتی ترتیب پیدا کرتے ہیں۔ یہ منظّم قوت کے چھوٹے چھوٹے مرکز بغیر کسی شعوری کوشش کے خود بخود قائم ہو جاتے ہیں۔ آگے چل کر ان کے باہمی تعلقات معیّن ہو جاتے ہیں اور یہ مختصر جماعتیں مستقل صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ زندگی کی ابتدا ہی میں تقسیم محنت کے سبب سے نیم منظم صنعتی جماعتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ چونکہ معاشرتی طبقوں کی بنا صنعتی پیشوں پر ہوتی ہے اس لئے صنعتی جماعتوں کا وجود معاشرے کی عام تنظیم کا محرک ہوتا ہے۔ لیکن جتنے تغیرات واقع ہوتے ہیں ان سب میں معاشرے کی تنظیم اس طرح ہوتی ہے کہ جو چھوٹی جماعتیں خود بخود قائم ہو گئی تھیں انھیں کے مرکزوں کے گرد دائرے بنتے جاتے ہیں اور انھیں سے نئی جماعتیں اس طرح نکلتی ہیں جیسے درخت کی شاخوں میں نئی کونپلیں پھوٹیں۔

۵۴۔ رشتہ داری

معاشرے کی ابتدائی حالت میں خاندانی زندگی موجودہ صورت سے

بہت مختلف تھی۔ یعنے بہت غیر معیّن اور بے قاعدہ تھی۔ لیکن اُس اُنس کی بنا پر جو ماں کو بچے سے ہوتا ہے خاندان کا باہمی اتحاد اشتراک اغراض کے ساتھ ساتھ بڑھتا گیا۔ ابتدا میں خاندان کے افراد میں ربط کی بنا رشتہ داری یا اتحادِ خون پر تھی۔ آگے چل کر خواہ مِل جُل کر رہنے سے یا اتحادِ خون کے احساس سے خاندان معاشرتی نظام کا ایک مستقل جزو بن گیا۔ معاشرتی تنظیم کے ابتدائی دور میں رشتہ داری کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ جن لوگوں میں باہم اتحادِ خون تھا وہ یگانگی کا احساس رکھتے تھے اور ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے۔ جب دوسرے قبیلوں سے اقدامی یا دفاعی جنگ ہوتی تھی تو یہ سب ایک ہو جاتے تھے۔ یہ اتحاد بڑھتے بڑھتے قبیلے اور نسل کا اتحاد بن گیا اور اسی سے مختلف نسلوں میں منافرت کی بنیاد پڑی۔

۵۵۔ موالی بنانا

خاندانوں اور قبیلوں میں قدرتی افزائش کے علاوہ اور طریقوں سے بھی توسیع ہوتی رہی۔ مختلف قبیلوں کی باہمی جنگ میں یہ اکثر ہوتا تھا کہ ایک قبیلے کو ایسی شکست پہنچی کہ اس کا شیرازہ بکھر گیا اور اس کے بچے کھچے افراد کو اپنی حفاظت کی بجز اس کے کوئی صورت نظر نہ آئی کہ وہ کسی دوسرے قبیلے میں مل جائیں۔ اس وقت تک نہ تو سلطنت تھی نہ سیاست نہ سیاسی حکومت بلکہ صرف خاندانی یا قبائلی تنظیم اس لئے جب کوئی فرد یا چھوٹا سا خاندان اکیلا رہ جاتا تو وہ یا تو اپنے بل پر جنگ کرتا یا کسی اور خاندان میں مل کر اس کی حمایت میں چلا جاتا۔ چنانچہ سخت لڑائیوں کے بعد بقیۃ السیف قبیلوں کا یہ دستور ہو گیا کہ دوسرے قبیلے کے لوگوں کو اپنا موالی بنا لیں۔ اِس کی صرف یہ شرط تھی کہ باہر سے آنے والے قبیلے کے رسوم و قوانین کی پابندی کریں۔ اِس طرح قبیلے قدرتی افزائش اور موالیوں کے شامل ہونے سے بڑھتے رہے۔ موالی قبیلے میں مل جل جاتے تھے، لڑائی میں اس کا ساتھ دیتے تھے، اس کے ساتھ ساتھ تبدیلِ مقام کرتے تھے اور اس کے معاشی اشغال اختیار کر لیتے تھے۔

۵۶۔ جماعتوں کا اتحاد

معاشرے کے ابتدائی دور میں ہمیشہ یہ رجحان رہتا تھا کہ چھوٹی جماعتیں مل کر ایک بڑی جماعت بنالیں۔ اِس کے بہت سے اسباب تھے جن میں چند یہ ہیں:۔ خارجی اور طبیعی قوتوں کے دباؤ سے بہت سی جماعتوں کا اپنی حفاظت کی غرض سے ایک ہوجانا' اتحادِ نسل کے احساس سے متفرق جماعتوں کا مل جانا' اور غالباً سب سے بڑھ کر سعی و عمل کا اشتراک جو صنعتی زندگی کے سبب سے پیدا ہوا۔ یہ اتحادِ سعی رفتہ رفتہ زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی نمایاں ہوگیا اور اس کی بدولت بہت سی جماعتیں متحد ہوگئیں جو اس کے نہ ہونے کی صورت میں جدا رہتیں اور ہلاک ہو جاتیں۔

۵۷۔ زبان کی ابتدا

زبان کو معاشرتی تنظیم میں ہمیشہ بڑی اہمیت رہی ہے۔ اس کو تبادلۂ خیالات کا آلہ بناکر چھوٹی جماعتوں نے نشوونما اور قوت حاصل کی اور دوسری جماعتوں سے اتحاد پیدا کیا۔ جن جماعتوں کی زبان ایک ہے اُن میں باہم موانست ہوتی ہے اور جن کی زبان مختلف ہے اُن میں باہم منافرت سی رہا کرتی ہے۔ مختلف جماعتوں میں جو مختلف زبانیں بولتی ہوں اور مختلف خیالات و جذبات رکھتی ہوں' معاشرتی تنظیم پیدا کرنا بہت مشکل کام ہے۔ آج کل بھی یہ وقت ان بڑے شہروں میں محسوس ہوتی ہے جہاں مختلف ملکوں کے مختلف زبانیں بولنے والے لوگ آکر آباد ہوگئے ہیں۔ دوسری طرف یہ بھی ہے کہ خود زبان لوگوں کے ملنے جلنے سے بنتی ہے۔ تبادلۂ خیالات کی کوشش ہی اِس کی تخلیق کی بنیاد ہے۔ جو شخص معاشرے کی ابتدا کا پتہ لگانا چاہتا ہے وہ دیکھے گا کہ زبان اُس کا ایک سبب بھی ہے اور نتیجہ بھی۔ یہ انسانی معاشرے پر اپنا اثر بھی ڈالتی ہے اور اُس سے متاثر بھی ہوتی ہے۔

۵۸۔ مشترک اخلاقی جذبات

مختلف قبیلوں اور جماعتوں کا اتحاد زیادہ تر مشترک اخلاقی جذبات پر موقوف ہے۔ فرض کیجئے ایک قبیلے میں انسانوں کے باہمی تعلقات کا ایک خاص دستور رائج ہے۔ اب وہ جماعتیں جن کا معاشرتی دستور اس سے مشابہہ ہوگا اس قبیلے کی طرف کھنچ آئیں گی اور جن کا دستور مختلف وہ اُس سے دور دور رہیں گی۔ ابتدائی قوموں میں اخلاقی دستور العمل بہت آہستہ آہستہ نشو و نما پاتا ہے مگر اس کے احکام بہت سخت ہوتے ہیں۔ ابتدائی قبیلوں کے رسم و رواج کی بنیاد قانونی یا معاشی مصلحتوں سے زیادہ اخلاقی اصول پر ہوتی ہے۔ یہ رسوم مذہبی جذبے سے پیدا ہوتے ہیں یا کم سے کم اُس سے متاثر ہوتی ہیں۔ معاشرے کے قیام اور آغاز میں مذہب کا بہت بڑا عنصر تھا۔ اِس کا اصلی مقصد تو یہ تھا کہ انسان اور روحوں یا دیوتاؤں کے تعلقات مُعیّن کرے مگر ضمنی طور پر اس میں اخلاق اور معاشرتی تنظیم کے عملی مسائل بھی شامل تھے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ کوئی مذہب ابتدا میں اخلاقی تصورات سے خالی ہو لیکن مذہبی رسوم کی پابندی سے معاشرتی حقوق و فرائض کی بنیاد پڑ جاتی ہے۔ اِس لیے ہم معاشرے کی بنیادوں میں انسان کے ترقی پذیر اخلاقی تعلقات کو بھی شمار کریں گے۔

۵۹۔ نظم و نسقِ معاکی ابتدا

جہاں کہیں لوگ مل جل کر کام کریں گے وہاں قیادت کی جھلک ضرور نظر آئے گی۔ ممکن ہے کہ یہ قیادت محض اتفاقی یا عارضی ہو مگر اس کا ہونا ہر صورت میں ضروری ہے سوائے اِس صورت کے جب لوگوں میں بے ساختہ ایک مشترک ارادے کی لہر سی پیدا ہو جائے۔ جہاں کہیں معاشرتی نظام ہوگا وہاں کسی نہ کسی حد تک قیادت کا وجود بھی ہوگا، خواہ قائد خاندان کا افسر ہو یا قبیلے کا سردار یا سپہ سالار جو لڑائی میں فوج کی رہنمائی کرتا ہے۔ بہر حال سماجی نظام کا قیام اسی

نسبت سے ہوتا ہے جس نسبت سے قیادت قوی اور مستحکم ہوتی جائے۔ ممکن ہے کہ آگے چل کر یہ بادشاہ، پارلیمنٹ یا دستورِ اساسی کی صورت اختیار کرے مگر کسی نہ کسی شکل میں اس کا معاشرتی انضباط کے نمائندے کی حیثیت سے رونما ہونا ضروری ہے۔ یہ جماعت، قبیلے یا قوم کے اتحاد اور استحکام کے لئے ایک بہت بڑی قوت بن جاتی ہے۔

۶۰۔ عدالت کی ابتدا

عدل و انصاف کو ہم معاشرتی اجتماع کا سبب نہیں قرار دے سکتے کیونکہ یہ خود معاشرے کی ارتقا کا نتیجہ ہے۔ جہاں کہیں معاشرتی نظام موجود ہو وہاں عدل و انصاف کی نشو و نما کا موقع ہوتا ہے کیونکہ تا وقتیکہ کسی حد تک عدل موجود نہ ہو لوگ کسی مشترکہ بنیاد پر مل جل کر زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ عدل کے قائم ہونے سے پہلے معاشرتی قوتیں اندھا دھند ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں۔ جماعت کے افراد میں باہم نزاع رہا کرتی ہے جس کا فیصلہ یا تو فطری انصاف سے ہو سکتا ہے یا مدنی عدل سے۔ فطرت کے انصاف کا اصول ہے جس کی لاٹھی اُس کی بھینس۔ اس انصاف کا طریقِ کار یہ ہے کہ جس شخص میں قوت ہے وہ اپنے حریف پر غالب آجاتا ہے اور من مانا فیصلہ کرتا ہے۔ مدنی عدل میں ایک تیسرے فریق کی مداخلت ہوتی ہے جو فریقین مقدمہ کے تعلقات کا تصفیہ کرتا ہے ہر ایک کو اُس کا واجبی مطالبہ دلاتا ہے اور اس کے حقوق کی حمایت کرتا ہے۔

۶۱۔ جنگ کی قوت

غالباً کسی مرئی قوت نے معاشرے کی نشو و نما میں اتنے زیادہ اور اتنے عظیم الشان تغیرات پیدا نہیں کئے ہوں گے جتنے جنگ نے کئے ہیں۔ افراد کی باہمی نزاع سے انفرادی سیرت میں مضبوطی پیدا ہوتی ہے جیسے جماعتوں کی نزاع سے اجتماعی سیرت مستحکم ہو جاتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ کبھی کبھی دونوں

صورتوں میں ایک فریق یا فریقین ہلاک ہو جاتے ہیں لیکن اگر کچھ لوگ بچ رہے تو ان میں معاشرتی زندگی کے متضاد عناصر سے نپٹنے کی قوت اور بڑھ جاتی ہے۔ جنگ نے افراد کو، قبیلوں کو قوموں کو برباد کر دیا ہے۔ کروڑوں جانیں اور بے اندازہ دولت اِس دیوی پر بھینٹ چڑھائی جا چکی ہے۔ مگر اسی کی بدولت انسانوں میں بہت سی اچھی صفات بھی پیدا ہوئی ہیں۔ اِسی کے ذریعے سے انسان نے اپنے سے قوی اشخاص کی اطاعت کرنا اور اپنے سے کمزور لوگوں کا لحاظ کرنا سیکھا۔ جنگ انضباط کی بڑی زبردست قوت ہے۔ اسی کے ذریعے سے وحشی قومیں مدنی حکومت کے اصول سیکھتی ہیں۔ اسے معاشرے کی بنیاد کا ایک بہت قوی عنصر سمجھنا چاہیئے۔

۶۲۔ طبیعی دباؤ

معاشرے کی ابتدا کا ایک اہم سبب طبیعی ماحول کا دباؤ ہے جو انسانوں پر پڑتا ہے۔ اِس سے قطع نظر کر کے کہ غذا کی تلاش میں لوگ اُس جگہ جمع ہوتے تھے جہاں اُس کا کافی ذخیرہ تھا اور آسانی سے دستیاب ہو سکتی تھی۔ آب وہوا کے اثر اور سطحِ ارض کی طبعی خصوصیات نے بھی لوگوں کو جماعتوں میں مل کر رہنے پر مجبور کیا۔ دریاؤں کے کنارے مچھلیوں اور شکار کے جانوروں کی تلاش میں پھرتے پھرتے لوگ ایک دوسرے سے دوچار ہوئے اور انھوں نے مل کر رہنا سیکھا۔ پہاڑوں کے سلسلے اُن کے تبدیلِ مقام میں حائل ہوئے اور اِن کے ڈھلواں دامن میں یا ان سے متصل وادیوں میں آبادی زیادہ گنجان ہو گئی۔ اسی طرح سمندر کے ساحل پر یا جھیلوں کے کنارے پہنچ کر انھیں عرصے تک مقام کرنا پڑا یہاں تک کہ وہیں بس گئے۔ شدید طوفانوں نے انھیں غاروں میں پناہ لینے پر مجبور کیا جہاں ابتدائی شکل میں چھوٹی چھوٹی جماعتیں بن گئیں اور شمال کے برفانی سیلابوں نے انھیں جنوبی وادیوں میں جمع کر دیا۔ غرض فطری ماحول کے اثر کا ہمیشہ یہی رجحان نظر آتا ہے کہ لوگوں کو یکجا اور متحد کرے۔

۶۳- معاشرتی دباؤ

بعض قبیلے اور نسلیں سطحِ ارض پر تبدیلِ مقام کرتے ہوئے ہلاک ہوگئیں۔ بعض منتشر ہوگئیں مگر بعض کو اسی ذریعے سے مجتمع اور متحد ہونے کا موقع ملا۔ قدیم متمدن قوموں پر خانہ بدوش قبیلوں کے حملوں، یورپ پر مختلف آریہ[1] جماعتوں کے ریلوں، ٹیوٹن[2] قوم پر ہن[3] قوم کے خروج اور یونانی اور رومی قبیلوں کی آپس کی نزاع کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ اس کشمکش سے بچ رہے ان میں سماجی اتحاد زیادہ گہرا ہوگیا۔ مختلف قوموں میں اور ان قوموں کے اندر مختلف فرقوں میں ایک کا دباؤ دوسرے پر پڑتا ہے جس کی بدولت کئی کئی جماعتیں مل کر اپنی فلاح وبہبود اور حفاظت کے لئے تنظیم کرتی ہیں۔ اس تنازع للبقا میں ہزاروں نسلیں فنا ہوگئیں جن کا نشان اب صرف آرٹ کی یادگاروں میں یا زبان کے بچے کھچے الفاظ میں ملتا ہے۔ اور مضبوط نسلیں تمدن کی گاڑی کو کھینچتی رہیں۔ ہماری زمین پر معلوم نہیں کتنی نسلوں اور قوموں کی قبریں جابجا موجود ہیں۔

یہ ہے معاشرے کے خاص خاص بنیادی عناصر کا ایک سرسری خاکہ۔ عموماً معاشرے کی ابتدا انھیں چیزوں کی بدولت ہوتی ہے۔ ان کی نشو ونما کے دوران میں اور ہزاروں قوتیں اور موثرات اپنا اپنا اثر ڈالتے رہتے ہیں۔

---

[1] Aryans

[2] Teutons

[3] Huns

باب دوم

ملک اور اُس کے باشندے

۴۶۔ فطرتِ خارجی اور معاشرتی نشو ونما

پچھلے باب میں ہم نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے کہ فطرتِ خارجی کا اثر معاشرے کی ابتدا پر کیا پڑتا ہے۔ اُس کی نشو ونما پر یہ اثر اور بھی گہرا ہوتا ہے۔ ہم ہر جگہ دیکھتے ہیں کہ انسانی زندگی کے امکانات کا دار و مدار طبعی ماحول پر ہوتا ہے۔ انسان جس سرزمین میں رہتا ہے اُس کا اس قدر پابند ہوتا ہے گویا اُسی سے پیدا ہوا ہو۔ ہر جگہ اُس کی ترقی کی رفتار اُسی حد تک ہوتی ہے جس حد تک اس کا تعلق زمین سے ہو اور وہ فطرت کی قوتوں کو قابو میں لے آئے۔ جس طریقے سے کوئی جماعت زمین سے وابستہ ہو اصل میں اسی کے لحاظ سے معاشرتی زندگی کی نوعیت کا تعین ہوتا ہے۔ جس طرح فرد کی نشو ونما پر طبعی ماحول کا اثر پڑتا ہے اسی طرح جماعت کی ساخت اور نشو ونما بھی اس سے متاثر ہوتی ہے۔ مشرق کے ریگستان میں سفر کرنے والے قبیلے جن میں رشتۂ اتحاد بہت گہرا اور مضبوط ہوتا ہے، ٹیوٹن قوم کے دیہاتی معاشرے سے بہت مختلف ہیں، اسی طرح انگلستان کے بڑے زمینداروں کی رعایا میں اور ریاستہائے متحدہ امریکہ

آزاد کاشتکاروں کی جماعت میں بہت بڑا فرق ہے۔ جہاں بڑے بڑے تعلقے زمین کے وسیع خطوں پر پھیلے ہوئے ہونگے وہاں کی رعایا میں کاشتکار کثرت سے ہوں گے اور ممکن ہے کہ یہ لوگ غلام اسامیوں کی نسل سے ہوں۔

۶۵۔ فطرت سے کشمکش

ہر زمانے میں اور ہر مقام پر انسان میں اور فطرتِ خارجی میں کشمکش نظر آتی ہے۔ اُسے جنگل کے وحشی جانوروں سے لڑکر اُن کو قابو میں لانا یا اُن کا استیصال کرنا پڑتا ہے۔ اُسے جاڑوں کی سردی اور گرمیوں کی گرمی سے بچنے کی فکر ہوتی ہے۔ وہ جنگل سے، دریا سے اور زمین سے اپنی غذا چھینتا ہے، فطرت کی قوتوں کو اپنی بربادی کے رخ سے موڑ کر اپنی بہبودی کی راہ پر لاتا ہے۔ پانی کی قوت، ہوا، بھاپ اور بجلی سب اس کے غلام بن جاتے ہیں۔ دوسری طرف اُس پر خون چوسنے والے کیڑوں اور بیماری کے جراثیم کا نرغہ ہوتا ہے۔ ہلاک جرثومہ اُس کا جانی دشمن ہوتا ہے۔ وہ دن رات اس کے استیصال کے درپے رہتا ہے۔ لیکن سچ پوچھئے تو فطرت نہ تو انسان کی دشمن ہے اور نہ اُس کی امداد میں بخل کرتی ہے۔ انسان اپنی عقل کی بدولت اپنی زندگی کو قوانین فطرت سے ہم آہنگ بناتا ہے اور اپنی سعی سے فطرت کی قوتوں سے ان کے خزانے اگلواتا ہے۔ فطرت انسان کی کل ضروریاتِ زندگی کے فراہم کرنے میں بہت فیاض ہے مگر شرط یہ ہے کہ انسانی سعی پیہم اُسے اپنے خزانوں کے قفل کھولنے پر مجبور کر دے۔ فلسفیوں میں دو نظریئے رائج ہیں ایک تو یہ کہ فطرت بخیل، سخت دل اور بے رحم ہے اور دوسرا یہ کہ وہ انسان کے مایحتاج کے عطا کرنے میں فیاض اور دریا دل ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ حقیقت اِن دونوں کے بین بین ہے یعنی انسان کی طرف سے عاقلانہ اور مناسب سعی ہو تو فطرت اُس کی تمام ضروریاتِ زندگی فراہم کر دیتی ہے۔

۶۶۔ انسان کا سابقہ فطرت سے رفتہ رفتہ بڑھتا ہے

ابتدائی معاشرے میں زندگی میں بہت سادگی تھی اور انسان کی ضرورتیں

فطرت کے چند سرچشموں سے پوری ہو جاتی تھیں۔ لیکن جوں جوں تمدن ترقی کرتا جاتا ہے انسان کا سابقہ فطرت سے بڑھتا جاتا ہے۔ چنانچہ ابتدائی زندگی میں جب انسان جڑیں اور جھڑبیریاں کھاتا تھا، چٹانوں اور غاروں میں رہتا تھا اور پتیوں وغیرہ سے بدن ڈھکتا تھا اُس کا قبضہ فطرت کے سرمائے پر بہت محدود تھا۔ اِس سارے عرصے میں اُس کی زندگی عناصر کے ہاتھ میں ایک کھلونا تھی۔ آگے چل کر جب اُس نے شکار کرنا اور جانوروں کو پالنا سیکھا تو اُسے قدرت کے اور سرچشموں سے بھی مدد ملنے لگی۔ لیکن اُس نے زمین سے مستقل تعلق پیدا کرلیا۔ اور زراعت شروع کی تو وہ ہزار گنی رفتار سے ترقی کرنے لگا۔ نسلِ انسانی کی تاریخ میں برابر یہ نظر آتا ہے کہ جس نسبت سے انسان نے فطرت سے اپنا سابقہ بڑھایا اور اُس سابقے سے فائدہ اُٹھایا اُسی نسبت سے اُس نے تمدن کے عملی فنون میں ترقی حاصل کی۔ نقل و حمل کے لئے دریا اور سمندر، جہازرانی کے لئے ہوا، مشینیں چلانے کے لئے پانی کی قوت، بھاپ کے کام، بجلی کے کرشمے، معدنیات اور نئی غذاؤں کی تجارتی اہمیت ان سب چیزوں کے استعمال نے اُسے اپنے پیروں پر کھڑا کر دیا۔ یہ اِس بات کا کافی ثبوت ہے کہ انسان کی ترقی فطرت کی قوتوں اور مادّوں کو کام میں لانے کی بدولت ہوئی ہے۔

۶۷۔ زمین سے وابستگی

زمین سے مستقل وابستگی کی بدولت انسان نے جداگانہ مخصوص معاشرتی اِدارے قائم کئے۔ خاندانوں کے اپنے اپنے مستقل گھروں میں رہنے سے خاندانی زندگی نے نشو و نما پائی اور یہ معاشرتی نظام کا سب سے قوی عنصر بن گئی۔ ہزاروں آدمیوں کی یکجائی نے انھیں یہ بات سکھائی کہ ایک دوسرے کے حقوق کا احترام کریں۔ اسی کی بدولت حقوق اور فرائض کا تعیّن ہوا کیونکہ عمرانیت اعلےٰ درجے تک اُسی وقت پہنچ سکتی ہے جب افراد میں ذاتی تعلقات بہت گہرے ہوں۔ ایسی صورت میں رسم و رواج ترقی کرکے قانون بن جاتا ہے،

حکومت کی قوت مختلف شعبوں میں تقسیم اور مستحکم ہو جاتی ہے، صنعت و حرفت میں تقسیم عمل کا دور دورہ ہوتا ہے اور معاشرہ چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں تقسیم ہو جاتی ہے جو ایک دوسرے سے وابستہ ہوتی ہیں اور عام نظام اجتماعی سے مشترک تعلق رکھتی ہیں۔ سچ پوچھئے تو انسان کی زمین سے وابستگی تمدن کی نوعیت متعین کرتے ہیں اس قدر اہمیت رکھتی ہے کہ اگر اس کی تاریخ مرتب کی جائے تو وہ معاشرتی زندگی کی بنیادی خصوصیات کی تاریخ بن جائے گی چنانچہ قبائلی زندگی گاؤں کی پنچائت، تعلقہ داری، جاگیرداری اور معمولی زمینداری یہ سب معاشرتی تعلقات کے مختلف دور ظاہر کرتی ہیں۔

۶۸۔ زمین کے فوائد

زمین کے فائدے تین طرح کے ہیں۔ ایک تو موقع کے، دوسرے زرخیزی کے اور تیسرے معدنی پیداوار کے لحاظ سے۔ پہلا فائدہ سکونت کا ہے اور آبادی اور زمین کے باہمی تعلق سے معاشرتی نشو و نما کے بہت سے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ بادی النظر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ سطح ارض پر انسانوں کے لئے جگہ کی کوئی کمی نہیں مگر ان کی آبادی اسباب خور و نوش کے لحاظ سے چند مرکزوں کے گرد ہوتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ زمین کے چند محدود خطوں کی طلب بہت بڑھ جاتی ہے۔ آبادی کے اس طرح سمٹ کر چند بڑی جماعتوں میں مجتمع ہو جانے کا اثر معاشرتی تعلقات پر بہت گہرا پڑتا ہے۔

(۲) زرخیز وادیوں میں انسان کی غذا پیدا ہوتی ہے اس لئے وہ انھیں میں رہنے پر مجبور ہے۔ بڑے بڑے شہر جو صنعت اور تجارت کی بدولت بن گئے ہیں اور معدنی بستیاں جو ایک رات میں بس گئی ہیں وہ اسی بنا پر کہ لوگ ایک ہی وقت میں ایک ہی جگہ رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جس کا یہ نتیجہ ہے کہ زمین کی قیمت بڑھ جاتی ہے اور کبھی کبھی تو اتنی ہو جاتی ہے کہ قیاس میں نہیں آتی مثلاً نیویارک شہر میں براڈوے[1] کے نشیبی حصے میں ایک مربع فٹ

[1] Broadway

زمین کی قیمت سیکڑوں ڈالر ہے۔ اِس کا سبب یہی ہے کہ لوگوں کے رہنے کے لئے کافی زمین نہیں ہے یا یوں کہیئے کہ ہزار ہا آدمی ایک ہی وقت میں اس ایک فٹ زمین کے خواستگار ہوتے ہیں۔ برعکس اِس کے مغربِ بعید میں براڈوے کی ایک فٹ زمین کی قیمت سے سیکڑوں ایکڑ اراضی خریدی جا سکتی ہے۔

(۳) زمین کے زرخیز ہونے کے سبب سے انسان اس کی کل پیداوار سے اپنی زندگی کی ضروریات پوری کرتا ہے۔ غلہ، نباتات، اور چوپائے جن پر انسان کی غذا منحصر ہے، درخت اور جنگل جن سے مکان اور اس کے سامان بنائے جاتے ہیں اور دوسرے کام نکلتے ہیں اِن سب کا وجود زمین کی زرخیزی کے بدولت ہے۔ اِسی طرح انسان زمین کے اندر سے سونا، چاندی، لوہا، کوئلہ اور دوسری دھاتیں جو مشینوں میں استعمال ہوتی ہیں حاصل کرتا ہے۔ غرض زمین سے جو فائدے حاصل ہوتے ہیں اُن کی وجہ سے لوگ سمٹ کر چند مخصوص مرکزوں پر آباد ہو جاتے ہیں اور ہر رنگ کے معاشرے کی زندگی زمین اور اس کے استعمال کی بدولت ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔

۶۹۔ آبادی کا بڑھنا

جب آبادی بڑھنے لگتی ہے تو اس کا رجحان یہ ہوتا ہے کہ ایک مخصوص مرکز پر جمع ہو اور مخصوص طرز کا معاشرہ پیدا کر دے۔ زراعتی مشاغل کی وجہ سے آبادی بہت بڑھتی ہے اور زمین کی زرخیزی کے تناسب سے گنجان ہوتی جاتی ہے۔ بعض رقبے بہت بڑی آبادی کی کفالت کر سکتے ہیں لیکن عام طور پر آبادی غذا کی مقدار کی حد پر پہنچ کر رک جاتی ہے۔ البتہ نقل و حمل اور رسل و رسائل کی بدولت بعض مقامات بہت بڑی آبادی کے حامل ہو سکتے ہیں کیونکہ وہ اپنی غذا ایک بڑے رقبے سے حاصل کرتے ہیں، انھیں معاشی سرگرمیوں کی بدولت شہروں میں اتنی بڑی آبادی اکٹھا رہ سکتی ہے۔ اگر نیو یارک اپنی غذا کے لئے اتنے خطے کا پابند ہو جائے جو اس شہر کے مرکز سے سو میل نصف قطر کے دائرے کے اندر ہے تو بہت سے لوگ چند ہی مہینے کے اندر فاقے کرنے لگیں۔

ابتدائی معاشرے میں لوگوں کو مجبوراً اُن مقامات پر جانا پڑتا تھا جہاں غذا موجود ہوتی تھی اور جب کوئی قبیلہ کسی جگہ کی کل غذا صرف کر ڈالے تو اُسے کئی ٹکڑیوں میں تقسیم ہو کر نو آبادیاں بسانا پڑتی تھیں، یا نقلِ مکان کر کے دوسرے ملکوں میں سکونت اختیار کرنا پڑتی تھی۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ کسی نئی غذا کے استعمال سے غذا کے موجودہ سرمائے میں اضافہ ہو جاتا تھا اور نقلِ مکان کی ضرورت نہیں آتی تھی۔

۷۔ جسمانی ضروریات کو پورا کرنے کی کوشش معاشرے کی بنیاد ہے

معاشرے کی بنیاد کے متعلق بہت سے نظریئے قائم کئے گئے ہیں بعض نے رشتہ داری یا اتحادِ خون کو معاشرے کی بنیاد قرار دیا ہے، بعض کا اصرار ہے کہ اتحادِ نسل جو اسی کی ایک وسیع صورت ہے معاشرے کی صوری بنیاد ہے۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ انسان مل جل کر رہنے میں سب سے پہلے طبعی قوتوں سے متاثر ہوتا ہے تاکہ اپنی انفرادی جسمانی ضرورتوں کو پورا کرے۔ کہیں کہیں تو طبعی موثرات اسے بالکل مجبور کر دیتے ہیں اور ان کی بدولت اُسے اپنے بنی نوع کے ساتھ مل کر رہنا پڑتا ہے جو مثل اُس کے ان قوتوں سے متاثر ہوتے ہیں۔ مثلاً طوفان کے سبب سے لوگ ایک ہی جگہ پناہ لینے پر مجبور ہوئے، دریا کی وجہ سے ایک ہی مقام پر کھنچ آئے۔ اور شکار گاہوں کی بدولت ایک ہی خطے میں اکٹھا ہو گئے۔ اِس طرح بھوک کو رفع کرنے کے لئے، سردی سے بچنے کے لئے، وحشی درندوں اور درندوں سے بدتر انسانوں سے محفوظ رہنے کے لئے انھیں جماعت بنا کر رہنا پڑا۔ یہ جماعتیں جن میں اجتماعی کشش نے باہمی ربط پیدا کر دیا تھا ایک فرد کی طرح آب و ہوا، زمین، پہاڑ، دریا اور سمندر کے اثرات سے متاثر ہو کر اِدھر اُدھر پھرتی رہیں۔

۸۔ معاشرے کی بقا

جب معاشرتی جماعت کی تشکیل پوری طرح ہو چکی اور اُس نے ایک

مستقل ہستی اختیار کرلی تو اُس میں اور دوسری جماعتوں میں زمین پر نزاع شروع ہوئی۔ جہاں جہاں یہ جماعت مضبوط نسل کی تھی اور اچھی جگہوں پر قابض ہوگئی تھی اُسے اُس نزاع میں غالب آنے کا موقع ملا لیکن اگر اتفاق سے کسی قوی نسل کو عرصے تک خراب ماحول میں رہنا پڑا تو اُس کی کامیابی بہت دشوار ہوگئی۔ بہ خلاف اِس کے اگر کوئی نسل جو جسمانی یا ذہنی حیثیت سے کمزور ہے زرخیز زمین پر اور موافق ماحول میں رہی تو اُس کی سلامتی اُس سے بھی زیادہ مشکل ثابت ہوئی، جتنی ناموافق ماحول میں رہنے والی مضبوط قوم کی تھی کیونکہ انسان کی بقا کے لئے مناسب اور مفید سعی سب سے پہلی شرط ہے۔ اور جو کہیں کسی کمزور جماعت کو بنجر زمین پر یا کم آباد شکارگاہوں میں رہنا پڑا تو ظاہر ہے کہ اُس کا سلامت رہنا تو اور بھی دشوار تھا۔ مختلف نسلوں کی تاریخ شاہد ہے کہ ہزاروں جماعتیں اپنے سے قوی تر جماعتوں کے ہاتھ سے شکست کھاکر اچھی زمینوں سے نکال دی گئیں اور صفحۂ ہستی سے اس طرح ہٹ گئیں کہ انھوں نے متمدن زندگی کے کوئی آثار نہیں چھوڑے۔ غرض زمین پر قابض ہونے کے نتائج زیادہ تر قبضہ کرنے والے معاشرے کی تعداد اور جدوجہد پر موقوف ہیں۔ اگر کوئی جماعت مضبوط اور مستعد ہے تو وہ فطرت کو مغلوب کرتی ہیں اور اُس کی برکات سے فائدہ اٹھانے میں زیادہ تیزی سے پیشقدمی کرتی ہے۔

۲۷۔ غیر متمدن نسلیں

معاشرتی نشوونما کی تاریخ میں جہاں دیکھئے غیر متمدن اور متمدن نسلوں کا تقابل نظر آتا ہے۔ بدوی نسلوں سے مراد وہ نسلیں ہیں جو تمدن کے ادنےٰ درجے سے آگے نہ بڑھ سکیں گو ان میں سے بعض میں ترقی کے ابتدائی آثار نظر آتے ہیں۔ جہاں کہیں بعض نسلیں ترقی کرکے متمدن بنیں انھیں تبدیلِ مکان کے سلسلے میں ان غیر متمدن نسلوں سے ضرور سابقہ پڑا۔ خواہ یورپ ہو یا ایشیا یا افریقہ سب کہیں قوی تر قبیلوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ جاکر ادنےٰ درجے کی جماعتیں ملیں۔ جب یورپی لوگ امریکہ پہنچے تو سارے برّاعظم میں ایسی نسلیں آباد

تھیں جو اس وقت تک تمدن کے دائرے میں داخل نہیں ہوئی تھیں۔ اُن میں سے بعض مثلاً پیرو دی[1]، ازٹیک[2]، پیوبلورس[3]، "چٹانوں پر رہنے والی[4]" اور ٹیلے بنانے والی[5] نسلوں نے بعض آثار چھوڑے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن میں تہذیب شروع ہو چکی تھی، وہاں فنون لطیفہ، صنعت و حرفت، مذہب اور حکومت کا وجود رہ چکا تھا مگر یورپی نسلوں سے سابقہ پڑنے کے وقت زیادہ تر نسلیں جمود یا انحطاط کی حالت میں تھیں۔ وہ ایک خاص طریقے پر امریکہ کی ساری زمین پر آباد تھیں۔ اُس کو وہ زیادہ تر شکار گاہ کے کام میں لاتی تھیں۔ ان میں قبضۂ اراضی کا اصول بالکل ابتدائی صورت میں تھا۔ عموماً قبضہ عارضی ہوا کرتا تھا۔ ملکیت زیادہ تر قبیلے کی ہوتی تھی البتہ بعض چھوٹے چھوٹے گاؤں میں یہ دستور تھا کہ جس خاندان نے جس زمین پر اپنی جھونپڑی بنالی ہے وہ اس وقت سے اُسی کی ملکیت ہے۔

سالہا سال تک قبیلے برابر تبدیلِ مکان کرتے رہے یا ایک بستی کو چھوڑ کر دوسری بستی بساتے رہے۔ لیکن سچ پوچھئے تو تبدیلِ مکان محض برائے نام تھا کیونکہ قبیلوں میں قبضۂ اراضی کی دو صورتیں تھیں۔ ایک تو زمین تھی جہاں اُن کے گاؤں، چراگاہیں اور مستقل شکارگاہیں تھیں۔ دوسرے وہ رقبہ تھا جس میں وہ اپنے نزدیک شکار کا حق رکھتے تھے۔ سال کے مختلف موسموں میں وہ اُس رقبے کی شکارگاہوں میں آتے جاتے رہتے تھے۔ انھیں شکارگاہوں کی ملکیت کا دعوے عموماً ایسی امریکیوں میں جنگ و جدل کا باعث ہوتا تھا۔ اکثر یہ لڑائیاں اتنی طویل اور اتنی خونریز ہوتی تھیں کہ ان میں قبیلے کے قبیلے

---

[1] The Peruvians.

[2] The Aztecs

[3] The Pueblors.

[4] The Clift Dwellers.

[5] The Mound Bu.lders.

نیست و نابود ہو جاتے اور ہزار ہا گاؤں اجڑ جاتے تھے۔ قبیلوں کے تبدیلِ مکان میں جب کبھی کوئی قوی قبیلہ کسی کمزور قبیلے کی زمین چھین لیتا تھا تو وہ وہاں آباد ہو جاتا تھا اور زمین اُس کی مشترک ملکیت بن جاتی تھی۔ یہی صورت قدیم یونانیوں رومیوں، اور ٹیوٹن قوم کی نیم متمدن جماعتوں میں بھی تھی۔

۳۔ زمین کے قابلِ سکونت خطے

دنیا میں جتنی زمینیں ہیں اُن میں سے بعض قابلِ سکونت اور بعض ناقابلِ سکونت کہی جاتی ہیں۔ مگر سچ پوچھیے تو یہ محض اعتباری الفاظ ہیں کیونکہ زمین کا قابلِ سکونت ہونا جماعتوں کے مدارجِ تمدن اور معیارِ زندگی پر موقوف ہے۔ ریاستہائے متحدہ (امریکہ) میں آج بھی بہت سے غیر آباد خطے پڑے ہیں جو ایک مختصر سی آبادی کے لئے اسبابِ معاش مہیا کر سکتے ہیں۔ بہت سے ادنےٰ درجے کے قبیلے بنجر زمینوں یا گھٹیا شکارگاہوں میں بری بھلی زندگی گذارتے ہیں۔ دریائے مسی سپی کے مغرب میں بہت سی بے آب زمین کو جو عموماً ناقابلِ سکونت سمجھی جاتی تھی سائنس نے اور انگلو سیکسن نسل کی ان تھک کوششوں نے قابو میں لاکر کام کا بنا دیا۔ نیو انگلینڈ میں ایک اعلےٰ درجے کا تمدن قائم ہو گیا جس کا سبب زیادہ تر اس قوم کی مخصوص سیرت اور قوتِ عمل ہے جو اپنے ساتھ متمدن زندگی کا علم و فن اور صنعت و حرفت لے کر آئی۔ بہت سے کوہستانی سلسلوں اور اُن کے گرد و پیش کے علاقوں میں گنجان بستیاں آباد نہیں ہو سکتیں بلکہ بعض میں تو مستقل سکونت قریب قریب ناممکن ہے۔ بہ خلاف اِس کے مسی سپی اور دوسرے دریاؤں کی زرخیز وادیوں میں رفتہ رفتہ بہت گنجان آبادی ہو جانے کی صلاحیت ہے۔ نوعِ انسانی برابر یہ زرخیز خطے تلاش کرکے ان کے قدرتی وسائل کو نشو و نما دے رہی ہے تاکہ اُن میں بڑی آبادیوں کی گنجائش نکل آئے۔

۴۔ قبائل کا بستیوں میں بسنا

ابتدا میں شمالی امریکہ کے دیسی قبیلے قریب قریب سارے برّاعظم میں

پھیلے ہوئے تھے۔ ان میں الگون کوئن[1] قبیلہ بہت بڑا تھا۔ یہ تقریباً سارے کناڈا اور ریاستہائے متحدہ کے بعض حصوں یعنی نیو انگلینڈ کی ریاستوں اور مسی سپی کی شمالی وادی[2] پر قابض تھا۔ ارو کوئس[3] قبیلے نیو یارک، ٹینسی[4] جارجیا، جنوبی کیرولینا، اور شمالی کیرولینا کے ایک حصے میں آباد تھے۔ کوہ خارا Rocky Mountain کے مشرقی حصے میں سوئن[5] قبیلے کی اور ریاستہائے متحدہ کے جنوبی مغربی حصے میں شو شونی[6] قبیلے کی سکونت تھی۔ شمالی امریکہ کے شمالی مغربی اور ریاستہائے متحدہ کے جنوبی مغربی حصے میں اتھاپاسکن[7] قبیلے تھے۔

اور قبیلے ریاستہائے متحدہ کے مختلف علاقوں میں مقیم تھے اور ان میں سے اکثر بحرالکاہل کے کنارے پر رہتے تھے۔ ان قبیلوں میں تبدیل مکان اور قبضۂ اراضی کی کشمکش کے اثرات نظر آتے تھے۔ یوں تو وہ بڑے بڑے علاقوں میں پھیلے ہوئے تھے مگر اُن کے آبادی کے مرکز دریاؤں کے کنارے اور زرخیز وادیوں میں تھے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بھی متمدن قوموں کی طرح انھیں مقامات کی طرف کھنچتے تھے جہاں اسباب معاش موجود ہوں۔ ان بیشمار دیسی قبیلوں میں سے بہت کم ایسے تھے جنھیں حضری کہا جا سکے۔ حضری قبیلے زیادہ تر اریزونا[8] اور نیو میکسیکو[9] میں مقیم تھے۔ ممکن ہے کہ چند ارد کوئس قبیلے اور ٹیلے

[1] Algonquin
[2] Northern Mississippi
[3] Iroquois
[4] Tenessee
[5] Souian
[6] Shoshonean
[7] Athapascans
[8] Arizon
[9] New Mexico

بنانے والی نسل کے بچے کھچے لوگ جو ریاستہائے متحدہ کے جنوبی حصے میں پائے جاتے ہیں مستقل بستیوں میں رہتے ہوں۔ جب یورپی لوگ امریکہ پہنچے تو اُن کی آبادی بھی دیسیوں کے نقشِ قدم پر چلتی رہی۔ ان کی سب سے گنجان آبادی انھیں مقامات پر تھی جہاں دیسیوں کی سب سے گنجان بستیاں تھیں۔ پہلے وہ دریاؤں کے کنارے بستے گئے پھر وادیوں میں اور اِس کے بعد میدانوں میں۔

۷۔۵۔ آبادی کا زمینوں کے لحاظ سے بڑھنا

زمین کی حیثیت کو ہمیشہ آبادی کی نشو ونما میں بہت دخل رہا ہے۔ نہ صرف اسبابِ معاش کے محدود ہونے کے اعتبار سے بلکہ اِس لحاظ سے بھی کہ مختلف قبیلوں اور جماعتوں کو مل کر ایک مربوط اور استوار جماعت بنانے کا موقع کہاں تک مل سکتا ہے۔ یہاں بھی عالمِ فطرت کی قوتوں کا معاشرتی اتحاد کی نشو ونما پر بہت بڑا اثر پڑتا ہے۔ لیکن خاص طور پر محدود علاقوں کی آبادی رہی جہاں پھیلنے کی گنجائش نہیں تھی کیونکہ ظاہر ہے کہ ایسے مقامات پر اسبابِ معاش بھی محدود تھے۔ جب غذا کی رسد اُس زمانے کے طریقِ استعمال کے مطابق بڑھتی ہوئی آبادی کے لیئے ناکافی ثابت ہوی تو یا تو غذا کے وسائل بڑھانے کی تدبیریں تلاش کی گئیں یا آبادی کو پھیلنے کے لیے اپنی ابتدائی حدود سے باہر نکلنا پڑا۔ نوآبادیاں زیادہ تر اِسی اصول کے مطابق قائم ہوی ہیں۔ یونانیوں نے نوآبادیاں تبھی بسائیں جب اُن کی آبادی بہت بڑھ گئی۔ شمال کی وحشی قوموں نے رومیوں کے علاقے پر اُسی وقت حملہ کیا جب خود اُن کے علاقے کے وسائلِ معاش اُس زمانے کے طرزِ زندگی کے لحاظ سے ان کے لیئے ناکافی ہوگئے۔ بہ خلاف اِس کے وادیِ نیل کی سیر حاصل زراعت کی بدولت ایک چھوٹا سا علاقہ ایک بہت بڑی آبادی کا بار اٹھاتا رہا۔

۷۔۶۔ قبضۂ اراضی کی مختلف صورتیں

قبضۂ اراضی کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ معاشرتی

نشو ونما میں کون سے موثرات زیادہ نمایاں رہے ہیں۔ جب کوئی قبیلہ کسی زمین میں بس جاتا ہے اور وہ افراد کی ملک نہیں ہوتی بلکہ بہ حیثیتِ مجموعی قبیلے کی ملک ہوتی ہے تو انسان کی انفرادی سعی بہت محدود ہو جاتی ہے۔ سب لوگ ملکیت کو مشترک سمجھنے لگتے ہیں اور اس حد تک ان میں جمہوریت کا رجحان بھی ہوتا ہے۔ اسی کی بدولت ایک مستحکم جماعت قائم ہو جاتی ہے جس کی حکومت استبدادی ہوتی ہے۔ زندگی میں تنوع نہیں ہوتا اس لیئے ضابطوں اور رسموں کا زور ہوتا جاتا ہے اور یہ چیزیں مضبوطی سے جڑ پکڑ لیتی ہیں۔ قدیم دیہاتی زندگی میں البتہ تھوڑا بہت تنوع نظر آتا ہے کیونکہ یہاں گھر اور اس کی متعلقہ زمین کا مالک خاندان ہوتا ہے۔ خاندان قبیلے سے بہت چھوٹا ہوتا ہے اس لیے اس کی زندگی میں کسی قدر آزادی پیدا ہو جاتی ہے جو اُس صورت میں ناممکن ہے کہ ساری زمین قبیلے کی ملکیت ہو۔ قدیم رومی قوانین کی نشو ونما قبضۂ اراضی سے ہوئی اور پھر انہیں کا رنگ رومیوں کے سارے طرزِ زندگی پر چھا گیا۔ اسی طرح جاگیرداری معاشرہ زمین کے نظام جاگیرداری پر مبنی تھا۔ انگلستان اور اسکاٹستان میں بڑی بڑی زمینداریاں اور تعلقے تھے اس لیئے وہاں عمائدی طرزِ حکومت کی نشو ونما ہوی۔ اسی طرح اگر امریکہ میں جو چھوٹی زمینداریاں اب ہیں وہی قائم رہیں تو یہاں جمہوریت کی بنیاد ہمیشہ استوار رہے گی۔

غیر متمدن قوموں میں قبضۂ اراضی عموماً مشترک ہوتا تھا لیکن تھوڑے ہی دنوں میں انفرادی قبضے کا رواج ہو گیا۔ جہاں کہیں انفرادی ملکیت تسلیم کی گئی وہاں زمینداریوں کا رقبہ ہمیشہ مختلف رہا۔ چھوٹی اور بڑی زمینداریاں پہلو بہ پہلو موجود رہیں لیکن اکثر صورتوں میں عام رجحان یہ تھا کہ بڑی زمینداریاں بڑھتی جائیں اور تعلقہ داری کی بنیاد پڑ جائے۔

بابِ سُوم

معاشرتی اعمال

۷۷۔ معاشرتی عمل معاشرتی اداروں سے پہلے تھا

یہ بات ہر پہلو سے صریحی طور پر ظاہر ہے کہ معاشرتی ادارے معاشرتی عمل کی بنا پر قائم ہوئے ہیں جس طرح ایک ننھی سی صُدف مچھلی آہستہ آہستہ بڑھتی ہے اور اپنے گرد اپنا مکان گھونگھے کی شکل میں بنا لیتی ہے اُسی طرح ہر معاشرتی عمل سے ایک معاشرتی اصول پیدا ہوتا ہے۔ کوئی مسلّمہ قانون یا قاعدہ اُس وقت تک وجود میں نہیں آتا جب تک افراد یا جماعتوں کے عمل سے اُس کی ضرورت نہ پیدا ہو بلکہ اکثر صورتوں میں تو عمل پہلے ہوتا ہے اور بعد میں اُس کی ضرورت تسلیم کی جاتی ہے اور وہ ایک اصول یا ادارے کی شکل اختیار کرتا ہے۔ اس لیے ہمیں یہ نظر آئے گا کہ معاشرتی اعمال اصل میں جسمِ اجتماعی کی جان ہیں۔ ہم کسی معاشرے کی ساخت کا اندازہ اُس کے اعمال سے کرتے ہیں اور اُس کے کسی عضو یا شعبے کی ساخت کا اندازہ اُس عضو یا شعبے کے وظائف سے کرتے ہیں۔ وارڈ کا قول ہے کہ "وظیفے کا مقصد تنظیم ہے" اور اس کے نزدیک معاشرتی اعمال کا مقصد اصول اور ادارے قائم کرانا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اصل میں معاشرتی اعمال

محض انسان کی خواہشوں کو پورا کرنے کے لیئے تھے اور ضمناً اُن کی بدولت مستقل اِدارے قائم ہو گئے اور معاشرتی نظام کے جز بن گئے۔ معاشرے کے خاص اعضا یا شعبوں کی لاشعوری تخلیق کے بعد معاشرتی زندگی کی شعوری سعی شروع ہوئی اور اُس نے تو توں کو اِس طرح راہ پر لگایا کہ پورا نظام بدل گیا اور اِس میں بہت کچھ ترقی رونما ہوئی۔

۷۸۔ جذبات اور ضبطِ نفس

انسان کی اجتماعی سعی ابتدا میں حس اور جذبے کی بنیاد پر شروع ہوتی ہے جب اُسے بھوک لگتی ہے تو وہ اُسے رفع کرنے کی کوشش کرتا ہے جب اُسے سردی سے تکلیف ہوتی ہے تو تبدیلِ مقام کر کے یا محفوظ مکان تلاش کر کے اپنے لیے گرم ماحول مہیا کرتا ہے۔ صحبت کی آرزو سے اجتماعی زندگی کی جستجو پیدا ہوتی ہے۔ محبت اور خوف کے جذبات اس کے اکثر اعمال کا باعث ہوتے ہیں۔ ابتدا میں انسانی سعی صرف خود غرضی پر مبنی تھی مگر یہ آہستہ آہستہ نشوونما پا کر اجتماعی ہمدردی بن گئی۔ جذبات کو ضبطِ نفس نے جو سب سے پہلے معاشرتی اعمال میں سے ہے بہت محدود کر دیا۔ فرد کی حفاظت اور بقا کا جذبہ بہت جلد حفاظتِ نوع اور بقائے نوع کا جذبہ بن گیا۔ معاشرے کے آخری مجموعی مقصد کا تعین صرف اسی طرح ہو سکتا ہے کہ تمام موجودہ انفرادی مقاصد کو جمع کر لیا جائے۔ آج کل تو ہم مکمل معاشرتی نظام اور اس کے مجموعی اعمال کو پیش رکھ کر اُس کا آخری مقصد متعین کرتے ہیں لیکن معاشرے کی ابتدائی صورت میں انسان کو اس کا احساس نہ تھا۔ وہ اپنی فطری خواہشوں کا بندہ تھا اور اپنی ساری کوشش اپنے جسمانی، نفسی اور معاشرتی زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرنے میں صرف کرتا تھا۔ اُس کے اعمال کا مقصد نظامِ اجتماعی قائم کرنا نہیں تھا۔ لیکن اگر ہم آج کل کے نقطۂ نظر سے دیکھیں تو یہ بات آسانی سے واضح ہو جاتی ہے کہ کس طرح اِن جداگانہ اور انفرادی اعمال نے جو محض فوری مقاصد پر مبنی تھے مل جل کر ایک عظیم الشان اجتماعی مقصد پیدا کر لیا یعنی ایک

نظامِ معاشرت کا قائم کرنا جو مختلف شعبوں پر مشتمل ہے اور جس کے ہر شعبے کے متعلق بہت سے اعمال و وظائف ہیں۔ احساس قوت کی ایک ابتدائی شکل ہے اور ضبطِ نفس سے اجتماعی ترتیب کی بنا پڑتی ہے اور نظامِ معاشرت تعمیر ہوتا ہے۔

۷۹۔ معاشرے کا تحفظ

فرد کے تحفظ کا مقصد رفتہ رفتہ وسعت پاکر معاشرے کے تحفظ کا خیال بن جاتا ہے۔ افراد کے چھوٹے مجموعوں میں اپنے تحفظ کی کوشش سے وحدت پیدا ہو جاتی ہے۔ ہر جماعت کی شعوری اجتماعی سعی اپنے تحفظ کے لیئے صرف ہوتی ہے۔ تحفظِ جماعت کا مشترکہ مقصد جنگ وفاعی کی نشو و نما میں نظر آتا ہے جہاں سب کے سب ایک مشترکہ مہم کے لیے جمع ہوتے ہیں اور ایسی حکومت کی نشو و نما میں جہاں افراد اپنے حقوق کی حفاظت کے لیئے مل کر کام کرتے ہیں، رسم و رواج کی بدولت ان میں ایک وحدت پیدا ہو جاتی ہے اور ہر فرد جو کسی جماعت میں پیدا ہوتا ہے یا شریک کیا جاتا ہے وہ اُس قانون کا پابند ہوتا ہے جس کی رو سے افراد کے باہمی تعلقات معین ہوتے ہیں۔ وہ کسی فرد کا ماتحت نہیں ہوتا بلکہ ایک برتر قوت کا جو سب پر حکومت کرتی ہے۔ اُس کے جذبات اور خواہشات کا انضباط صرف طبیعی ماحول سے نہیں بلکہ اُس نو ساختہ معاشرتی ماحول سے بھی ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ یہ انضباط، احکام، قوانین اور اصل عمل کی شکل اختیار کرتا ہے جو جماعت کے تحفظ کے لیئے ضروری سمجھ کر باضابطہ رائج کیے جاتے ہیں۔

اس کے علاوہ ایک معاشی عمل بھی ہے جس میں پھیلنے اور بڑھنے کی عجیب و غریب طاقت ہے۔ ابتدا میں فرد اپنی غذا اپنے طور پر بغیر دوسروں کا لحاظ کیئے ہوئے مہیّا کرتا ہے مگر تھوڑے دن میں غذا کی رسد معاشرے کی نگرانی میں آجاتی ہے۔ لوگ مل جل کر شکار کرتے ہیں اور مشترکہ محنت سے جو کچھ حاصل ہوتا ہے اُسے آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں۔ فرض کیجیئے کوئی وہیل یہ مچھلی ساحل گیر موج میں مل گئی یا کنارے پر پکڑی گئی تو یہ پانے والے شخص کی ملکیت نہیں ہے بلکہ پورے خاندان یا قبیلے کی۔ اسی طرح کھیتوں کی حفاظت ساری جماعت کرتی ہے اور اُن کی پیداوار

جماعت کی مشترکہ املاک میں داخل ہے۔ مکان کی تعمیر بہت سے لوگ مل کر کرتے ہیں جو ساری جماعت کے نمائندے ہوتے ہیں اس لیے اس کی ملکیت اور استعمال بھی مشترک ہے۔ گو معاشی زندگی کی ہر منزل میں انفرادی عمل بھی نظر آتا ہے مگر یہ ظاہر ہے کہ انسان کی بقا بغیر اجتماعی عمل کے ناممکن ہے۔ معاشرتی ارتقا کے دوران میں معاشرتی انضباط اور معاشی زندگی کو وسعت حاصل ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ آج کل کا پیچیدہ سیاسی اور معاشی نظام بن گیا جو بہت سے مستقل اور ممیز شعبوں سے مرکب ہے۔ مجموعی حیثیت سے تو معاشی زندگی ایک وحدت ہے مگر اس کے بہت سے الگ الگ حصے ہیں اور متعدد اغراض و مقاصد ہیں جو مل جل کر انسانی معاشرے کے تحفظ کا فرض انجام دیتے ہیں۔

۸۰۔ معاشرے کی بقا

انسانی زندگی کی نشوونما میں فطرت کا سب سے بڑا مقصد بقائے نوع ہے۔ یہ نہایت ہی اہم مقصد ہے اور فوری خواہشوں کے پورا کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ اس میں تو بہت شبہ ہے کہ انسان کو ابتدا ہی سے بچے پیدا کرنے کی خواہش تھی مگر جب صحبت اور جماع کی فطری خواہش کی بدولت بچے پیدا ہوئے تو اس سے ماں باپ کو بہت خوشی ہوئی اور ان کے تحفظ اور بقا کی کوشش کی جانے لگی۔ یقیناً بچے ہی کی وجہ سے گھر کی بنیاد پڑی۔ چونکہ وہ بہت عرصے تک اپنی حفاظت آپ نہیں کر سکتا اس لیے ایک محفوظ مقام اور مستقل مسکن بنانے کی ضرورت پیش آئی۔ ابتدا میں تمام معاشرتی رابطوں کا مرکز بچے کی ذات تھی۔ اس کی خاطر گھر بنایا گیا اور گھر کے سلسلے میں جماعت کی بقا کی بہت سی محرکات پیدا ہوئیں۔ جو لوگ ایک گھر میں رہتے ہیں ان کے آپس میں انس اور محبت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے بعد اپنے خاندان پر فخر کرنے کا جذبہ ابھرتا ہے جس کا مقصد خاندان کی بقا اور اسے دوسرے خاندانوں کے حملوں سے بچانا ہے۔ اجتماعی خیال نمایاں حیثیت اختیار کرتا ہے اور اسی بنیاد پر قومی زندگی اور حب وطن کی عمارت کھڑی ہو جاتی ہے۔

ارتقا کے دوران میں آخر وہ منزل آجاتی ہے جب بقائے نوع کی شعوری کوشش شروع ہوتی ہے۔ ازدواجی تعلقات کے نظم وضبط کے لیئے رسوم وقوانین بن جاتے ہیں اوران پرعمل ہونے لگتا ہے۔ بعض صورتوں میں افراد کو ممانعت ہوتی ہے کہ جماعت کے باہر شادی نہ کریں اور جماعت کے اندر بھی قریبی عزیزوں میں نہ کریں بلکہ کسی دوسرے معاشرتی حلقے میں۔ غرض طرح طرح سے معاشرہ اپنی حفاظت اور بقا کی کوشش کرتا ہے۔ اُسے ہمیشہ بیرونی دشمنوں سے جو اُسے برباد کرنا چاہتے ہیں بچنے کی فکر رہتی ہے اور اسی کے ساتھ اِس کا بھی خیال رہتا ہے کہ بیماری سے محفوظ رہیے اور بقائے نسل کے رسوم و قوانین قائم کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جائے۔ یہ عمل اجتماعی معاشرے کے وجود کے لیئے نہایت ہی اہم ہے اور معاشرتی زندگی کے اعلےٰ اور مکمل صورت میں بھی بدستور کارفرما رہتا ہے۔

۸۱۔ معاشرے کی نشوونما

معاشرتی جماعت کے معیار زندگی کو بلند کرنے اور اُسے قوی تر بنانے کی بہت سی مختلف کوششیں کی جاتی ہیں۔ منجملہ ان کے وہ تدبیریں ہیں جو انسان کی جسمانی حالت کو ترقی دینے کے لیے اختیار کی جاتی ہیں۔ زیادہ مقدار میں اور بہتر قسم کی غذا مہیا ہونے سے جسمانی زندگی ایک مستقل رنگ اختیار کرلیتی ہے اور جماعت کو دوسرے پہلوؤں سے ترقی کرنے کی فرصت مل جاتی ہے۔ اِس کی خاص جدوجہد ہوتی ہے کہ سائنس سے کام لے اور معاشرے کی مادی حالت کو بہتر بنانے کے لیے نئی نئی چیزیں دریافت کرے۔ پھر ورزش جسمانی اور حفظانِ صحت کے اعمال ہیں۔ انھیں سے ملتے جلتے وہ مشاغل ہیں جن سے تازگی اور تقویت پہنچتی ہے اور جن کا نام لوگوں نے تفریح اور کھیل رکھ دیا ہے۔ ہزار ہا آدمی اسی میں معروف رہتے ہیں کہ انسانوں کی تفریح کے ذرائع بہم پہنچائیں۔ کھیل کا عنصر، معاشرے کی اعلےٰ نشوونما اور حقیقی بہبود کے لیے ناگزیر ہے۔ اس لیے معاشرتی جدوجہد کا یہ پہلو جماعت کی ترقی کے لیے بہت اہم ہے۔

۸۲۔ اخلاقی اور جمالیاتی جد و جہد

ہر منظم جماعت میں ایک بن لکھا ضابطہ اخلاق ہوتا ہے جسے معاشرے کی وحدت اور قوت میں بہت کچھ دخل ہے۔ بعض انجمنیں خاص اس مقصد کے لیے قائم ہوتی ہیں کہ معاشرے کے اخلاقی معیار کو بلند کریں مثلاً انجمنِ ترکِ نشیات، انجمن مانعِ ظلمِ حیوانات اور بہت سی خیراتی اور امدادی انجمنیں جو مخصوص طبقوں کی اصلاح اور ترقی کی کوشش کرتی ہیں۔ ہر تحریک جو جماعت کے افراد میں زیادہ ربط پیدا کرتی ہے اور کل جماعت کی حیاتِ سلیم اور حُسن اخلاق میں اضافہ کرتی ہے وہ اس کے معیارِ زندگی کو بلند کر دیتی ہے اور عام انسانی معاشرے کو تقویت پہنچاتی ہے۔ ایسی کوششوں سے صرف طرزِ معاشرت ہی کی اصلاح نہیں ہوتی بلکہ جماعت میں محنت کی صلاحیت بڑھتی ہے۔ اس کی عمر زیادہ ہو جاتی ہے اور بقائے نسل کا بہتر موقع ملتا ہے۔

جمالیاتی جد و جہد کو اخلاقی اعمال سے بہت قریبی تعلق ہے۔ یقیناً حُسن کی محبت کا عام اثر یہ ہوتا ہے کہ حق کی محبت بڑھ جائے اور نسل کو ترقی حاصل ہو۔ بہ خلاف اس کے بد مذاقی سے معاشرتی زندگی کو تنزل ہوتا ہے۔ اور چیزوں کی طرح اس میں بھی بہترین نتیجے وسائل کے صحیح استعمال سے حاصل ہوتے ہیں کیونکہ آرٹ اس طرح بھی برتا جا سکتا ہے کہ اخلاق کا مؤید ہو اور اس طرح بھی کہ بد اخلاقی پھیلائے مگر آرٹ کا بہترین اثر یہی ہے کہ جماعت کو بلند تر نصب العین اور برتر زندگی بخشے۔ کہا جاتا ہے کہ ہنگری میں موسیقی کا ایک اثر یہ بھی ہے کہ کاہلی اور جذبات پرستی پیدا کرے اور بہت لوگوں کا خیال ہے کہ جرمنی میں موسیقی کا حد سے زیادہ چرچا ہمیشہ جذبات کو چھیڑتا رہتا ہے اس لیے وہاں کے لوگوں میں اختراع اور منطقی فکر کا مادہ کم ہے۔ عوام پسند بے اصول موسیقی سے قوائے ذہنی کو تازگی تو ضرور حاصل ہوتی ہے مگر اس میں بہت شبہ ہے کہ معاشرے کی زندگی پر اس کا کوئی مفید اثر پڑتا ہے۔ سچ پوچھیے تو موجودہ صورت میں اس میں موسیقی کا جمالی عنصر بالکل برباد ہو جاتا ہے مگر اسے عام اصول کا استثنا سمجھنا چاہیے۔ اصل میں ہر جد و جہد جس سے آرٹ یا فطرت میں حسنِ ازل کا مشاہدہ کیا جا سکے ترقی پذیر معاشرتی جماعت کے لیے

ناگزیر ہے۔

۸۳۔ تہذیبی جدوجہد

تہذیب کی کوئی مستقل تعریف نہیں ہے مگر عمرانیات کی اصطلاح میں تہذیب عقیدے کی تبدیلی اور طرزِ عمل کے تغیر کا نام ہے۔ پرانے عقیدے کی جگہ نیا اور بہتر عقیدہ قبول کرنا، پرانے طرزِ خیال اور طرزِ عمل کو چھوڑ کر نیا مسلک اختیار کرنا جو بلند تر نصب العین کا حامل ہو، اسی کو تہذیب کہتے ہیں۔ ہر جماعت کی تہذیب میں سب سے زیادہ نمایاں تین چیزیں ہوتی ہیں مذہب، تعلیم اور علم۔ اُن ہزارہا آدمیوں میں سے جو مذہبی تبلیغ کرتے ہیں سب کی بلاواسطہ یا بالواسطہ یہی کوشش ہے کہ لوگوں کے مذہبی عقائد کو بدل دیں یا ان کی تشکیل دینیات کے کسی خاص نصب العین کے مطابق کریں۔ مذہب کو سب سے زیادہ تعلق عقیدے سے ہے اور اس کے بعد عمل سے۔ مذہب کا سب سے اہم کام جس حد تک کہ اس کا اثر معاشرے پر پڑتا ہے یہ ہے کہ عقیدے کی سطح کو بلند کرے اور معاشرے کے عمل کو عقیدے کے ماتحت کر دے۔ اس حیثیت سے وہ معاشرے کا بہت بڑا تنظیمی عنصر ہے۔ گو معاشرے کا وجود بغیر مذہب کے بھی ممکن ہے مگر معاشرتی زندگی کی ترقی کا ایک عنصر مذہب بھی ہے اور جو زمانے قوموں کے مذہبی عقائد میں انحطاط کے گزرے ہیں وہی قومی عظمت کے انحطاط کے دور بھی تھے۔

تہذیب جماعت کی ترقی میں جن وسائل سے کام لیتی ہے اُن میں تعلیمی جدوجہد سب سے بڑھ کر تیر بہدف ثابت ہوتی ہے اور تعلیم کا بڑا مقصد یہی ہے کہ جہالت کو دور کر کے علم و دانش کو رواج دے، ذہنِ انسانی کے خیالات میں اتحاد پیدا کرے اور زندگی کے نصب العین کو بلند کرے۔ اسی میدان میں معاشرے کی شعوری جدوجہد سب سے نمایاں ہوتی ہے۔ تعلیم کے ذریعے سے معاشرے کو عمل کی نئی راہیں سوجھتی ہیں۔ زمانۂ حال کی سب سے اعلےٰ معاشرے میں سب سے زیادہ عام معاشرتی جدوجہد منظم تعلیمی قوتوں ہی کی صورت پیش نظر آتی ہے۔ تعلیم ہی معاشرے کے اتحاد، استحکام اور ترقی کی ضامن ہے۔

تعلیم ہی سب سے اہم طریقہ ہے جو معاشرہ اپنی اصلاح کے لیے اختیار کرتا ہے۔ علمی تحریک تعلیمی تحریک کا ایک شعبہ ہے۔ گو علم کا مقصد حق کا دریافت کرنا ہے مگر اُس کی آخری غرض یہی ہے کہ اپنے انکشافات کو آئندہ نسلوں تک پہنچاتے ہوئے تاکہ نوعِ انسانی کی ترقی اور اصلاح ہو کسی نئی علمی حقیقت کے دریافت ہوتے ہی اُسے اِفادی بنیاد پر قائم کرنے کی کوشش شروع ہو جاتی ہے۔ اِس طرح علم نوعِ انسانی کی مادی فلاح کے لیے ناگزیر بن گیا ہے۔ جب کوئی جماعت جدید تمدن کو اختیار کرتی ہے اور زندگی کے ان حقائق سے فائدہ نہیں اٹھاتی جن کا انکشاف علومِ فطرت کی بدولت ہوتا ہے تو اُس کی ترقی نہیں بلکہ تنزل شروع ہو جاتا ہے۔ اِس کا مشاہدہ ان ملکوں میں ہوتا ہے جہاں وحشی یا غیر مہذب قوموں کو جدید تمدن سے سابقہ پڑتا ہے۔ وہ اپنے نئے طرزِ زندگی کی تشکیل میں علومِ فطرت (سائنس) سے پوری طرح کام نہیں لیتے اور جب مہذب فنون سے مقابلہ پڑتا ہے تو برباد ہو جاتے ہیں۔ وحشی قوموں کے لیے اپنی زندگی کو سائنس کے حقائق پر مبنی کیے بغیر جدید تمدن اختیار کرنے سے تو یہی بہتر ہے کہ وہ فطرت کو اپنا رہنما بنائیں۔

۴۸۔ اتحادِ عمل

ہم اس کتاب میں متعدد مقامات پر اشتراکِ عمل کا ذکر کر چکے ہیں۔ یہاں عام معاشرتی جدوجہد کے سلسلے میں اس کی طرف محض اشارہ کر دینا کافی ہے۔ اس کے معنی ہیں بعض مخصوص اغراض کے حاصل کرنے کے لیئے افراد کے مقصد اور عمل کا متحد ہونا۔ کسی خاص غرض سے لوگوں کی ایک جماعت بنانے کے سلسلے میں بہت سی اجتماعی سرگرمیاں رونما ہوتی ہیں جن سے معاشرے کی ترقی میں مدد ملتی ہے۔ یہاں ہمیں فوری اور آخری مقصد میں فرق کرنا چاہیے۔ فرض کیجیے کچھ لوگ ایک جماعت کی صورت میں منظم ہو کر لوہے کی ایک بہت بڑی کان میں کام کرتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ ان سب لوگوں کی خواہش روپیہ کمانا ہے لیکن معاشرے کی اصلی خدمت جو ان کے ہاتھ سے انجام پاتی ہے یہ ہے کہ وہ ایک بڑی مقدار میں ایک مفید دھات حاصل کرتے ہیں جس سے ساری قوم کی مادی اور غالباً

اجتماعی زندگی کو ترقی ہوگی۔ لیکن اِس اشتراکِ عمل کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ وہ بلا واسطہ معاشرے کی ترقی کے لیے کیا جائے مثلاً کچھ لوگ مل کر اپنی قوم کے معاشرتی اور سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے ایک مدنی انجمن قائم کریں۔ اس قسم کا اشتراکِ عمل عام ہے اور اسے معاشرتی جدوجہد کی ایک خاص قسم سمجھنا چاہیے۔ اگر اس سے آگے بڑھیے تو ہم نفسِ اجتماعی کے تصور پر پہنچ جاتے ہیں جس میں سارے معاشرے کی بہبود کے لیے احساس، خیال اور ارادے کی ہم آہنگی ہوتی ہے۔ یہ معاشرتی اشتراکِ عمل کا سب سے اعلےٰ تصورِ عمومی ہے۔ اس کا عمل ضمیرِ عامہ اور ارادۂ عامہ کا پابند ہوتا ہے۔ معاشرتی جدوجہد کے اعلےٰ عمومی تصورات اصل میں نفسیاتی ہیں اور ہم اس باب میں جس کا عنوان "نفسی قوتیں" ہے اُن پر بحث کریں گے۔

باب چہارم

ہیئتِ اجتماعی

۸۵۔ ہیئتِ اجتماعی کا مفہوم

ہیئتِ اجتماعی سے ہم معاشرے کا ڈھانچہ مراد لیتے ہیں۔ جسم اجتماعی کے اعضا یعنی معاشرے کی مختلف جماعتوں یا شعبوں سے مل کر بنا ہے۔ جب معاشرے کی طبعی حالت میں کوئی جماعت جس کی تنظیم کسی خاص مقصد کے لیے ہوئی ہے معاشرتی زندگی کے لیے لازمی ہو جائے تو وہ ہیئتِ اجتماعی کا ایک اہم جزبن جاتی ہے مثلاً کلیسا نے بہ حیثیت ایک ادارے کے جو ہدایت اور انضباط کا کام کرتا ہے یہ اہمیت حاصل کر لی ہے۔ اسی طرح وہ لوگ جو کسی خاص پیشے کا کام کرتے ہیں مثلاً مہاجنوں کی جماعت جو قوم کی اہم معاشی خدمت انجام دیتی ہے اس نظام کا لازمی عنصر بن جاتی ہے۔ ان سب غیر سرکاری منظم جماعتوں سے اہم تر اور برتر ریاست ہے۔ اسے ایک طرح کا ڈھانچہ سمجھیے جس کے اندر جسمِ اجتماعی کے تمام اعضا ایک خاص ترکیب سے باہم مربوط ہیں۔ اگر یہ معلوم کرنا ہو کہ اِس ہیئتِ اجتماعی کی اصلاح کس طرح ہوئی ہے تو معاشرتی ارتقا کی داستان پر نظر ڈالیے۔ ہر معاشرتی عمل

ابتدا میں بہت خفیف ہوتا ہے مگر یہ تدریج قوت پکڑتا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ لوگوں کی ایک مخصوص جماعتِ نامیہ کا مرکز بن جاتا ہے جو اُسے نظم و ترتیب کے ساتھ انجام دیتی ہے۔

۸۶۔ غیر منظم گروہوں سے جماعتوں کا بننا

اگر ہم یہ مان لیں کہ معاشرے کی ابتدا ایک غیر منظم گروہ کی شکل میں ہوئی تھی جو اتفاقی وجوہ سے مشترک مقاصد کے حصول کی کوشش میں اور مشترک مہیجات سے متاثر ہو کر اکٹھا ہو گیا تھا تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ غیر منظم گروہ کس طرح سے ایک جسمِ نامی بن گیا۔ یقیناً پہلے پہل اس گروہ کے اندر کسی مرکزی تصور یا خیال یا عمل مثلاً خاندانی زندگی کی بنیاد پر معاشرتی مرکز بنے۔ جنسی کشش کی بدولت زیادہ معین معاشرتی تعلقات قائم ہوئے اور آہستہ آہستہ خاندانی اور گھریلو زندگی کی تشکیل ہوئی۔ اسی طرح مذہب کے تصور نے جس کی بنا پر بعض رسوم پابندی سے ادا کی جاتی تھیں آخر میں ایک منظم جماعت کو اکٹھا کر لیا اور جو مذہبی عبادت کی نگران بن گئی۔ اسی طرح مختلف صنعتی پیشوں میں اتحادِ عمل ہوا اور افراد وسائلِ معاش مہیا کرنے، گھر بنانے، کھیلنے اور دوسرے اجتماعی مشاغل کے لیے مل کر کام کرنے لگے۔ اِن سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ معاشرے کی زندگی میں تنوع پیدا ہو گیا۔

۸۷۔ مختلف جماعتوں میں اتحاد کی ضرورت

مگر ہماری یہ چھوٹی جماعت دوسری جماعتوں سے الگ وجود میں آئی تھی۔ اب اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ یہ جماعتیں متحد ہو جائیں۔ رفتہ رفتہ چھوٹی چھوٹی جماعتیں ایک مرکزی منظم جماعت میں ضم ہو گئیں جس کی جد و جہد نے ایک جسم اجتماعی کی حرکت کی صورت اختیار کر لی۔ اس اجتماع کی بدولت معاشرے کے بہت سے منتشر عناصر بالکل متحد ہو گئے یہاں تک کہ اس صورتِ حال کی ایک عمدہ مثال سرقبیلی خاندان میں نظر آتی ہے جہاں تمام مختلف عناصر کا مرکز ایک

سردارِ خاندان تھا جو نظم وضبط کی قوت کا تنہا حامل تھا۔ اس کی ایک اور مثال قبیلے ہیں جن کی بنیاد اس طرح پڑی کہ مختلف گروہوں کو مذہب، جنگ اور محبت کے مشترک مقاصد نے متحد کر دیا۔ مختلف قبیلوں کو ملا کر اور بڑی جماعتیں بنانا یہ اُسی عملِ اجتماع کا سلسلہ تھا جو انسانی معاشرے کی صدیوں کی نشو ونما میں برابر جاری رہا۔ اور گو یہ عملِ اجتماع اصولاً معاشرتی نشو ونما کے دوسرے مدارج سے پہلے واقع ہوا تھا لیکن سچ پوچھئے تو یہ معاشرتی ترقی کی ہر منزل میں باقی رہتا ہے۔ یہ معاشرے کی تعمیر میں ایک مستقل عنصر ہے اور جوں جوں معاشرے میں وسعت پیدا ہوتی جاتی ہے یہ بھی وسیع تر صورتیں اختیار کرتا جاتا ہے۔ یہ اتحادِ نسل اور عصبیت کی نشو ونما کا آئینہ ہے۔

۸۸۔ معاشرے کے اجزا

پرانے زمانے میں معاشرہ خاندانوں سے مل کر بنا تھا جو مختلف صورتوں میں اور مختلف ترکیب کے ساتھ مربوط تھے۔ رفتہ رفتہ خاندانوں کی حدود اٹھ گئیں اور معاشرہ افراد کے مجموعے کا نام ہو گیا جن میں سے ہر ایک کو بلا لحاظ خاندانی رشتوں کے ساری جماعت سے تعلق تھا۔ معاشرے کی یہ صورت آج کل کی جمہوریت میں نظر آتی ہے۔ اس معاشرے کی تقسیم محلّوں، بستیوں، گاؤں، قصبوں اور شہروں کے لحاظ سے کی جاتی ہے۔ جب کوئی شخص کسی قصبے میں داخل ہوتا ہے تو وہ چند گھروں کو دیکھتا ہے اور کچھ انسانوں کو جو اُن گھروں میں رہتے ہیں یا سڑکوں پر چلتے پھرتے ہیں یا جلسوں میں جمع ہوتے ہیں۔ اُسے نہ تو بلدیہ نظر آتا ہے اور نہ قصبے کی مجلسِ انتظامی۔ بجائے کسی ادارے کے اسے محض لوگوں کا ایک گروہ نظر آتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ انسانوں کے اس گروہ کا محض ایک حصہ ہیئتِ اجتماعی کا جزوِ ترکیبی ہے۔ معاشرے کا اصل ڈھانچہ اس جماعت کا منظم حصہ ہے جو دوسرے منظم حصوں سے ایک معین علاقہ رکھتا ہے۔ اس بات کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں کہ معاشرے کا نظام اُن جماعتوں سے مل کر بنا ہے جو مخصوص اور معین مقاصد کے لیے قائم کی گئی ہیں اور آپس میں

اتحاد رکھتی ہیں۔

۸۹ ۔ متفقہ گروہ

وہ سب گروہ جن کا مجموعہ معاشرہ کہلاتا ہے اس کی ترکیب میں شامل ہیں مگراس کی ترکیب میں داخل نہیں۔ یہ کوئی ضروری بات نہیں کہ یہ گروہ اس حد تک مربوط ہوں کہ جسمِ اجتماعی کے اعضا کہے جاسکیں۔ ابتدا میں یہ افراد کے مجموعے ہوتے ہیں جن سے معاشرہ مرتب ہوتا ہے۔ ترتیب سے محض ان گروہوں کی آبادی کی تقسیم اور نوعیت ظاہر ہوتی ہے لیکن آگے چل کر ان کا ایک منظم معاشرہ اور علیحدہ علیحدہ شعبوں میں تقسیم ہونا زیادہ تر آبادی کی تعداد پر موقوف ہے۔ بعض اوقات معاشرتی اتحاد کی شعوری کوشش کی جاتی ہے جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ افراد کے متفرق گروہ ایک مقام پر اکٹھا ہوتے جائیں یعنی بستیوں کی آبادی بڑھتی جائے اور آپس کے شادی بیاہ یا عام اتحادِ معاشرت سے یہ آبادی ایک متحد جماعت بن جائے۔ کبھی کبھی عام معاشی یا معاشرتی اتحاد کی بدولت مختلف قبیلے بلکہ قومیں ایک معاشرے میں شامل ہو جاتی ہیں۔ اس طرح مختلف عناصر کو ملانے کی شعوری کوشش کی جاتی ہے یہاں تک کہ معاشرتی تنظیم ان میں کامل اتحاد پیدا کر دیتی ہے۔

۹۰ ۔ شعوری اتحاد

چھوٹے گروہوں کے ملنے سے بڑے گروہوں کا بننا اور ایک متحدہ جماعت کی نشو و نما ایک بہت طویل مدت تک مختلف فطری اور عمرانی اسباب کے ماتحت جاری رہی۔ مگر ہر معاشرے کے ارتقا میں ایک وقت ایسا آیا کہ جب اس نے بہ حیثیت ایک منظم جماعت کے اپنی قوت کو محسوس کیا۔ اس کے بعد سے وہ بطور ایک وحدت کے کام کرنے لگی اور خود اپنی شعوری کوششوں سے ایک وسیع تر معاشرہ بننے کے لیے سرگرمِ عمل ہوگئی۔ مختلف طریقوں سے وہ اپنی مقبوضات کی حدود کو وسیع کرنے بیرونی دشمنوں کی مدافعت کرنے اور اپنے اندرونی معاملات کا

نظم وضبط کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس نے اور خاندانوں اور قبیلوں کو اپنے اندر جذب کر کے اپنی آبادی بڑھالی۔ یہ مقصد عموماً فتح یا معاہدے کے ذریعے سے اور کبھی کبھی مختلف گروہوں کے اتفاقی اتحاد کے ذریعے سے پورا ہوتا تھا۔

۹۱۔ جسم اجتماعی

رفتہ رفتہ وہ چیز بن گئی جسے جسمِ اجتماعی کہتے ہیں یعنی ایک جماعت جس کے بہت سے حصے ہیں جو ایک دوسرے سے بہت گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک دوسرے حصوں یعنے تمام جسم سے جڑا ہوا ہے۔ جسم اجتماعی کے معنی ہی یہ ہیں کہ اس کے تمام اعضا ایک دوسرے سے اور کل جسم سے جڑے ہوئے ہوں۔ لیکن ان کا جڑا ہونا جسمانی انفصال کے لحاظ سے نہیں بلکہ نفسیاتی عمل کے لحاظ سے ہے۔ گو افراد اپنی قوتِ ارادی کی بدولت نقل وحرکت میں آزاد ہیں مگر ان کے ملنے سے مستقل جماعتیں بن جاتی ہیں اور چونکہ ہر فرد کے ہٹنے کے بعد دوسرا اس کی جگہ لے لیتا ہے اس لئے یہ جماعتیں ہمیشہ قائم رہتی ہیں۔ مثلاً وہ جماعت جو بنکوں میں کام کرتی ہے جدید معاشرے کی بقائے حیات کے لئے ضروری ہے اسی طرح وہ جماعتیں بھی جو مبادلے کا یا نقل وحمل کا کام انجام دیتی ہیں مجلسِ وضعِ قوانین کے ارکان، یا پولس کے ملازم، یا کلب کے یا دری مستقل جماعتوں کے نمائندے ہیں جو مجموعی معاشرے کے مختلف کاموں کو انجام دیتے ہیں۔

۹۲۔ معاشرتی تنظیم

مگر معاشرے کو ایک جسم سے اور اس کے حصوں کو اعضا سے تشبیہ دینا کافی نہیں کیونکہ وہ تنظیم بھی کرتی ہے وہ اجتماعی اعمال کی بنیاد ڈالتی ہے اور ارادۂ اجتماعی سے کام لے کر ہر فرد کے لئے مناسب محل کا تعیّن کرتی ہے اور جماعتوں کے اور افراد کے حقوق مقرر کرتی ہے۔ فردِ انسانی محض خیالی اور نفسی عناصر سے مرکب جسم نامی نہیں بلکہ اس سے بڑھ کر ہے کیونکہ وہ اپنی ذہنی اور جسمانی قوتوں کو خاص مقاصد کے لئے منظم کر سکتا ہے۔ معاشرہ اپنی شعوری

ذہنی کوشش کے سبب سے جو وہ اپنی تنظیم میں صرف کرتی ہے ایک اعلیٰ جسم نامی بھی ہے اور ایک منظم ادارہ بھی۔

۹۳- معاشرے کے اعضا یا حصوں کی تفریق

جب معاشرہ ایک علٰحدہ ہستی یا ایک متحد اور مستقل جسم بن گیا تو اس کے اندر علٰحدہ علٰحدہ جماعتیں قائم ہونے لگتی ہیں۔ یہ بات خاص طور پر معاشی زندگی میں تقسیم محنت کی صورت میں نظر آتی ہے۔ پہلے ہر فرد یہ کوشش کرتا ہے کہ اپنا ہر کام خود کرے۔ آگے چل کر وہ صرف ایک کام اپنے لئے اور دوسروں کے لئے کرتا ہے اور اس کے بدلے میں بقیہ کام دوسروں سے لیتا ہے۔ تھوڑے ہی دنوں میں شکاری، معمار اور خانہ داری کا کام کرنے والے علٰحدہ علٰحدہ ہو جاتے ہیں اس کے بعد کچھ لوگ کاریگر اور تاجر بن جاتے ہیں۔ آگے چل کر کاشتکار، صراف، حمال وغیرہ کے پیشے جدا ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح ابتدا میں ایک ہی شخص طبیب اور پجاری دونوں کا کام کرتا ہے مگر کچھ عرصے کے بعد یہ دونوں کام علٰحدہ ہو جاتے ہیں اور ایک جماعت تاجروں کی اور ایک پجاریوں کی بن جاتی ہے۔ یہی تفریق حکومت میں نظر آتی ہے یہاں تک کہ وضع قوانین، انتظام اور عدالت کے صیغوں کی حدود بالکل الگ ہو جاتی ہیں اور ان میں سے ہر ایک کے متعدد شعبے بن جاتے ہیں۔ اس طرح جسمِ اجتماعی کے مختلف اعضا یا حصے وجود میں آتے ہیں جو ایک دوسرے سے مربوط ہوتے ہیں۔

۹۴- نظامِ اجتماعی

وہ عناصر جن سے مل کر معاشرہ بنتا ہے معاشرے کے اعضا کہلاتے ہیں۔ اگر ہم معاشرے کی موجودہ حالت کا مشاہدہ کریں اور اس کے تمام حصوں پر نظر ڈالیں تو معلوم ہو جائے گا کہ باہم مربوط جماعتوں سے جنھیں ہم نے جسمِ اجتماعی کے اعضا کہا ہے کیا مراد ہے۔

سب سے پہلے تو وہ بڑی معاشی جماعت ہے جسے پرورش کرنے والی

جماعت کہتے ہیں کیونکہ وہ بلا واسطہ معاشرے کی جسمانی پرورش کا کام انجام دیتی ہے۔ اس میں معاشرے کی وہ سب شاخیں شامل ہیں جو انسانی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے ہر قسم کی اشیا پیدا کرتی ہیں، وہ جو اشیا کے مبادلے اور نقل و حمل میں مصروف رہتی ہیں اور وہ جو ایک شے سے دوسری شے بناتی ہیں۔

دوسری قسم بقائے نوع میں مدد کرنے والی جماعتوں کی ہے مثلاً خاندان جس کا اصل کام بقائے نسل ہے اور وہ تمام طبی اور حفظانِ صحت کے ادارے جن کے پیش نظر تحفظِ حیات کا مقصد ہوتا ہے۔

پھر وہ صنعتیں ہیں جن کا کام اطلاع رسانی ہے اور جن کا وجود آج کل پرورش کرنے والی جماعتوں کے لئے ناگزیر ہے۔ اس میں معلومات کو منتقل کرنے اور پھیلانے کے کل طریقے شامل ہیں مثلاً تار، ٹیلیفون اور مطبع، کتابیں، اخبارات، رسالے اصل میں نشر معلومات ہی کے ذریعے ہیں۔

معاشرے کے وہ اعضا بھی نہایت اہم ہیں جنھیں ہم تہذیبی ادارے کہتے ہیں مثلاً کلیسا، تعلیمی ادارے، علمی ادبی، جمالی اور اخلاقی انجمنیں۔

اس طرح کی تقسیم میں ہم معاشرے کے ہر عضو یا جماعت کی قسم اس کے سب سے اہم کام کے لحاظ سے معین کرتے ہیں ورنہ ایک ہی جماعت کا شمار مختلف اصناف میں کیا جاسکتا ہے۔

آخر میں ایک نہایت دلچسپ اور اہم جماعت کا ذکر کرنا ضروری ہے جس کا کام نظم وضبط اور حفظِ امن ہے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ وہ معاشرتی زندگی میں نظم و ترتیب پیدا کرتی ہے اور اسے قائم رکھتی ہے۔ اگر ہم ریاستہائے متحدہ کو بطور مثال کے لے لیں تو ہمیں اس معاشرے کے تحت میں متعدد نظام نظر آئیں گے۔ وہ بین الاقوامی نظام جو ایک قوم کے تعلقات دوسری قوموں کے ساتھ معین کرتا ہے اور مستقل قومی زندگی قائم رکھتا ہے۔ پھر قومی حکومت کے اور مختلف ریاستوں کے وضع قوانین کے ادارے عدالتی اور انتظامی ادارے، حکومت بلدیہ، مستقل فوج اور پولس۔ اس کے علاوہ سرکاری تعلیم کا نظام ہے جس کا اصل مقصد تہذیب کی اشاعت نہیں بلکہ

حکومت کی حفاظت اور معاشرے کا نظم و ضبط ہے

اسی زمرے میں وہ رضاکار انجمنیں بھی ہیں جو معاشرتی نظم و ضبط کے قائم کرنے میں اور مختلف جماعتوں کی حفاظت کرنے میں بہت کچھ داخل رکھتی ہیں۔ منجملہ اُن کے مزدوروں کی انجمنیں، بیمہ کمپنیاں، مذہبی برادریاں، باہمی دستگیری کی انجمنیں اور خیراتی انجمنیں ہیں۔

۹۵۔ معاشرے کے اجزائے ترکیبی یا اعضا

معاشرے کے اجزائے ترکیبی کا حسب ذیل نقشہ ہمیں اس بحث کے سمجھنے میں مدد دے سکتا ہے بہ شرطیکہ ہم اس بات کو مدنظر رکھیں کہ یہ تقسیم ہر عضو کے وظیفے یا مخصوص کام کے لحاظ سے اور گو بعض اوقات ایک عضو کے بہت سے وظیفے ہوتے ہیں مگر اس کی قسم کا تعین اس کے سب سے اہم وظیفے یا کام کے لحاظ سے کیا جاتا ہے۔

۱۔ پرورش کرنے والی جماعتیں

خام اجناس پیدا کرنے والی جماعتیں
قدرتی خزانوں کو حاصل کرنے والی جماعتیں
صناع (ایک شے سے دوسری شے بنانے والی جماعتیں)
نقل و حمل کرنے والی جماعتیں
مبادلہ کرنے والی جماعتیں

۲۔ بقائے نسل کی ضامن جماعتیں

خاندان
طبّی انجمنیں
حفظانِ صحت کی انجمنیں

۳۔ اطلاع رسانی کے نظام (جو معاشی جماعتوں کے لئے ناگزیر ہیں)

الف۔ مطبع اور اس کے متعلقات، کتابیں، اخبار، رسالے وغیرہ۔
ب۔ ٹیلیفون کا انتظام کرنے والی جماعت

ج۔ تار کا انتظام کرنے والی جماعت۔

۴۔ تہذیبی جماعتیں

کلب

تعلیمی اِدارے

علمی انجمنیں

ادبی، جمالی، اخلاقی انجمنیں

مجلسی کلب اور انجمنیں

تفریحی انجمنیں

۵۔ تنظیم اور حفظ امن کا انتظام

بین الاقوامی انجمنیں

ریاست

وضع قوانین کے ادارے

عدالتیں

انتظامی اِدارے

پولس

سرکاری سررشتۂ تعلیم

غیر سرکاری انجمنیں

مزدوروں کی انجمنیں

بیمہ کی کمپنیاں

مذہبی برادریاں، باہمی دستگیری کی انجمنیں

خیراتی انجمنیں اور ادارے

سیاسی پارٹیاں

طالب علم بطور خود ان چیزوں کی مزید تحلیل کر سکتا ہے مگر فی الحال ہمارے مقصد کے لئے یہ نقشہ کافی ہے۔

۹۶- تفریق ترقی کی علامت ہے

سماج کے اعضا یا شعبوں کی تفریق کا عمل جو ہمیشہ جاری رہتا ہے ترقی کی علامت ہے۔ ہر نئی تحریک کے پیدا ہونے سے یعنی معاشرے کے نئے عضو یا شعبے کے بننے سے اجتماعی زندگی میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ معاشرے کی نشوونما کئی صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ پہلے نظامِ حکومت کے مختلف شعبے مختلف کاموں کے لئے مخصوص ہو جاتے ہیں یعنی حفظِ امن اور شہریوں کی حفاظت کے لئے نئی جماعتیں قائم ہوتی ہیں۔ اس کے بعد صنعتوں میں تخصیص پیدا ہوتی ہے یعنی ہر جماعت ایک صنعت کو اختیار کرتی ہے۔ تقسیمِ محنت کا عمل روز بروز مزدوروں کو علحدہ جماعتوں میں تقسیم کرتا جاتا ہے نئی صنعتیں تیزی سے پیدا ہوتی ہیں جن کے سبب سے جماعتوں کی تعداد اور بڑھ جاتی ہے۔ جوں جوں تہذیب کا قدم آگے بڑھتا ہے ان افراد کی تعداد جو معاشرتی کام انجام دیتے ہیں زیادہ ہوتی جاتی ہے اور وہ نئی جدوجہد کے لئے نئی نئی راہیں ڈھونڈھتے ہیں۔ اس طرح معاشرہ یا جسمِ اجتماعی دو باتوں کے لحاظ سے نشوونما پاتا ہے۔ ایک تو یہ کہ اس میں نئے شعبوں اور طبقوں کا اضافہ ہوتا ہے اور دوسرے یہ کہ اس کے ہر مخصوص شعبے میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ مثال کے لئے مبادلے کے کام کو لے لیجئے۔ ابتدا میں یہ شعبہ کس قدر ناقص اور نامکمل تھا مگر اب اپنی ترقی یافتہ صورت میں یہ ایک وسیع اور زبردست نظام بن گیا ہے۔ یا حکومت کے ایک شعبے کی مثال پر غور کیجئے۔ مجلسِ عام (پارلیمنٹ) کسی زمانے میں ایک کمزور سی جماعت تھی جسے محض چند امور میں مشورہ دینے کا حق حاصل تھا مگر اس میں تغیر تبدل کرنے کا نہ تھا۔ رفتہ رفتہ اس کی طاقت بڑھتی گئی یہاں تک کہ بعض ممالک مثلاً انگلستان اور ریاستہائے متحدہ میں مجلسِ عام سب سے اہم مجلس وضعِ قوانین ہے۔

۹۷- معاشرے میں یک رنگی کی جگہ تنوع پیدا ہونا

عمل تفریق کی بدولت معاشرہ بجائے ایک متحد النوع جماعت کے مختلف النوع

جماعت بن جاتی ہے۔ اُس میں سادگی کی جگہ پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے اور اُس کی زندگی غیر معین نہیں رہتی بلکہ معین ہو جاتی ہے۔ یہ چیزیں معاشرتی ارتقا کی اہم خصوصیات ہیں۔ معاشرے کے شعبے یا اعضا جتنی زیادہ وضاحت کے ساتھ معین کر دئیے جائیں اور اُن کے عمل میں جتنی زیادہ صحت پیدا ہو جائے اُسی حد تک معاشرہ مکمل سمجھا جاتا ہے اور چونکہ اِس تفریق کی کوئی حد نہیں اس لئے معاشرے کے متعلق یہ کبھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ مکمل ہو گیا ہے۔ معاشرے کے ارتقا کا اندازہ کرنے کے لئے محض یہ معلوم کر لینا کافی ہے کہ وہ صحت و سلامتی کے ساتھ نشو و نما پا رہا ہے اور دوسری جماعتوں کے مقابلے میں اُس راہ پر قدم بڑھا رہا ہے جس کا ہم نے ذکر کیا یعنی اس میں نئے وظیفے پیدا ہو رہے ہیں اور جو پہلے سے موجود ہیں وہ وسیع ہوتے جاتے ہیں۔

۹۸۔ جسم اجتماعی کی تشریح

معاشرے کی ساخت کی تحقیق کو بعض اوقات تشریح جسم اجتماعی کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اِس سے مراد ہے معاشرے کے مختلف شعبوں کی تحلیل تفصیل کے ساتھ کرنا۔ اگر ہمیں اس طرح کی تحلیل کرنا ہو تو نقطۂ آغاز فرد کو قرار دینا چاہیئے۔ وہ جسمِ اجتماعی سے ایک خاص قسم کا تعلق رکھتا ہے۔ یوں تو وہ جسم اجتماعی کا ایک جز ہے لیکن جب وہ مر جاتا ہے تو کوئی دوسرا اس کی جگہ لے لیتا ہے بلکہ یہ کہیئے کہ معاشرے کی جو خدمت وہ انجام دیتا تھا وہ اب دوسرا شخص انجام دیتا ہے۔ گویا معاشرہ افراد کا ایک دھارا ہے جو زندگی کے دریا میں بہتا ہے اور فنا کے سمندر میں گر جاتا ہے۔ اس کی موجیں آپس میں ٹکراتی رہتی ہیں اور جو سمندر میں گر کر معدوم ہو جاتی ہیں ان کی جگہ دوسری موجیں آ پہنچتی ہیں۔

مگر معاشرے کی نفسی ترکیب کچھ ایسی واقع ہوتی ہے کہ ہر فرد کئی کام کر سکتا ہے اور کئی اعضائے اجتماعی کا جز ہو سکتا ہے۔ مثلاً ایک معمولی شہری بعض اوقات مجلس وضع قوانین (انتظامی جماعت) کا رکن بھی ہوتا ہے اور کلیسا (تہذیبی جماعت) کا بھی بینک (مبادلے کی جماعت) کا ممبر مجلس بھی ہوتا ہے

اور صنعتی کمپنی (اشیا کو پیدا کرنے والی جماعت) کا حصہ دار بھی، سرکاری یونیورسٹی کی مجلسِ عاملہ (انتظامی جماعت) کا ممبر بھی ہوتا ہے، بیمہ کمپنی (محافظ جماعت) کا شریک بھی اور فراشنوں کی انجمن یا اسی قسم کی کسی انجمن کا رکن بھی۔ غرض اسی طرح وہ بہت سے اِداروں کا رکن ہو سکتا ہے کیونکہ اس کے جسم اور نفس میں یہ صلاحیت ہے کہ جسمِ اجتماعی کی مختلف خدمات انجام دینے کے لئے مختلف قسم کے ماحول سے مطابقت پیدا کر سکے۔

۹۹۔ فرد کا تعلق جسمِ اجتماعی کے کسی عضو یا شعبے سے

ایک فرد کا ایک ہی وقت میں معاشرے کے مختلف اعضا یا شعبوں کا جزُ ہونا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ جسمِ اجتماعی ایک مخصوص ماہیت رکھتا ہے۔ جسم حیوانی یا نباتی میں ہر تخرُماۓ کا عمل ایک خلیے تک محدود ہوتا ہے اور وہ اپنے دائرے کے اندر ایک حصۂ جسم کا جُزوِ ترکیبی ہوتا ہے بس اس کے علاوہ اس کا کوئی کام نہیں۔ جسم کے ذرات تحلیل ہوتے رہتے ہیں اوران کے ساتھ تخرُماۓ بھی مگر ان کی جگہ دوسرے پیدا ہو جاتے ہیں اور جسم اپنی شکل پر قائم رہتا ہے۔ مگر معاشرے کے اندر فرد کی جدوجہد محدود نہیں ہوتی اس لئے وہ بہت سی جماعتوں کا رکن ہو سکتا ہے۔ غرض جسمِ اجتماعی کی تشریح سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ افراد جن پر وہ مشتمل ہوتا ہے ان مختلف معاشرتی خدمتوں کے لحاظ سے جو وہ انجام دیتے ہوں معاشرے کے ایک شعبے یا حصے سے دوسرے میں منتقل ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح ہر معاشرتی شعبہ جو افراد سے مل کر بنتا ہے مختلف خدمات انجام دے سکتا ہے۔

۱۰۰۔ انسانوں کا ابتدائی گروہ

معاشرہ افراد کے مجموعے کا نام ہے لیکن فرد باوجود معاشرے کا جُزوِ ترکیبی ہونے کے معاشرہ نہیں کہا جا سکتا۔ معاشرے کی ابتدا کے لئے بھی کم سے کم دو افراد کی ضرورت ہے۔ فرد مر جاتا ہے لیکن وہ گروہ جس کا وہ رکن ہے

اپنی اصل شکل میں باقی رہتا ہے۔ سب سے پہلا مستقل گروہ جو افراد کے ملنے سے بنا خاندان تھا۔ اس کی بنیاد کا پہلا عنصر تو وہ باہمی کشش تھی جو مرد اور عورت میں فطری طور پر ہوتی ہے اور دوسرا اس حقِ مالکانہ کا تحفظ جو شوہر کو بیوی پر ہوتا ہے۔ خاندان کے قیام سے بچوں کی مستقل حفاظت کا سامان بھی ہوگیا اور وہ لوگ جن میں اتحادِ خون تھا ایک سلسلے میں مربوط ہوگئے۔ خاندان کی باضابطہ تنظیم میں غالباً اتحادِ خون کی کشش سب سے بڑی قوت تھی اس کے بعد مذہب کا دخل ہوا اور ایک مشترک قربان گاہ کے گرد عبادت کرنے سے خاندان والوں میں رشتۂ اتحاد اور مضبوط ہوگیا۔ خاندان اس سے زیادہ وسیع معاشرتی جدوجہد کا بھی مرکز تھا۔

۱۰۱۔ معاشرے کے دوسرے اعضا یا شعبے

گو خاندان تقریباً ایک عالمگیر نظام ہے اور اس کے ذریعے سے ایک وسیع معاشرے کے قریب قریب تمام افراد باہم مربوط ہوتے ہیں لیکن بعض اور گروہ بھی ہیں جن میں افراد مختلف پیشوں کے لحاظ سے جماعتوں میں تقسیم کئے گئے ہیں۔ چنانچہ مجلسی، کاروباری اور سیاسی تعلقات کی بنا پر بہت سے مخصوص گروہ بن گئے ہیں جو مخصوص کام انجام دیتے ہیں۔

۱۰۲۔ معاشرتی نسیج

نسیج بہت سے گروہوں سے مل کر بنتا ہے جن میں سے ہر گروہ بہت سے افراد پر مشتمل ہے۔ یہ افراد مخصوص رشتوں میں مربوط ہیں اور ہر گروہ دوسرے گروہوں سے کم و بیش تعلق رکھتا ہے۔ اس طرح جسمِ اجتماعی میں معاشرتی جدوجہد کا ایک جال سا پھیلا ہوا ہے۔ اس معاشرتی نسیج کو جسمِ حیوانی کے نسیج سے تمثیل دے سکتے ہیں۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ان دونوں کی مشابہت محض تمثیلی ہے۔

جیسے جسمِ حیوانی میں ہڈی، پٹھے اور دوسرے نسیج اپنے مخصوص وظائف رکھتے ہیں اسی طرح معاشرے میں بھی مختلف جماعتیں ہیں اور ان کے مخصوص مقاصد

ہیں۔ جسم حیوانی کی طرح معاشرہ بھی ایک مربوط نظام اعضا کا رکھتا ہے جس کا سلسلہ شعوری قوت کے مرکز سے ملتا ہے۔ معاشرتی اعمال بھی قوتِ محرکہ کے مرکزوں کے ماتحت ہیں اور معاشرے کی زندگی بھی قوتِ حیات کے مرکزوں کی پابند ہے۔ اگر جسم حیوانی اپنے ماحول سے موافقت نہ پیدا کر سکے تو وہ ہلاک ہو جاتا ہے اسی طرح معاشرہ بھی مخصوص حالات اور قوانین کا پابند ہے اور اگر ان پر عمل نہ کرے تو منتشر اور برباد ہو جاتا ہے۔

اس تمثیل پر زیادہ زور دینے سے کوئی خاص فائدہ نہیں۔ البتہ اس بات کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے کہ جسمِ اجتماعی کی ترکیب بھی ایک جسم نامی کی سی ہے اُس کی زندگی کے بھی خاص قوانین ہیں اور وہ بھی بقا کی قوت اور صلاحیت رکھتا ہے۔

باب پنجم

خاندان کی تنظیم اور معاشرہ

۱۰۳۔ خاندان ایک معاشرتی واحدے کی حیثیت سے

خاندان کو اکثر معاشرتی واحدہ کہتے ہیں کیونکہ وہ افراد کا سب سے چھوٹا منظم گروہ ہے اور مختلف معاشرتی نظاموں میں ایک مشترک عنصر ہے۔ اس کے علاوہ یہ آج کل کی معاشرتی زندگی کا ایک نہایت اہم شعبہ ہے۔ اس میں وسیع تر معاشرے کے عناصر اس حد تک موجود ہیں کہ یہ فرد کو اجتماعی زندگی کی تربیت دینے کا ذریعہ بن گیا ہے۔

معاشی عنصر کی حیثیت سے خاندان دولت کا پیدا کرنے والا بھی، تقسیم کرنے والا بھی اور صرف کرنے والا بھی۔ یہاں انسان ملکیت کے حقوق اور شخصی حقوق سے واقفیت حاصل کرتا ہے اور اُن کا استعمال سیکھتا ہے۔ یہیں وہ ضبطِ نفس، اطاعت اور خدمت کی تعلیم حاصل کرتا ہے اور تجربے سے اپنے اور دوسروں کے تعلقات اور اپنے حقوق و فرائض پہچانتا ہے۔ یہیں مذہب واخلاق اور تہذیب کا سب سے پہلا اور سب سے گہرا اثر اس کے دل پر پڑتا ہے۔ کوئی معاشرتی نظام بھی رہو۔ خواہ وحشی گروہوں کی غیر متمدن زندگی، خواہ شاہی، عامری یا جمہوری نظام حکومت

سب میں خاندان ایک مشترک قوت کی حیثیت سے نظر آتا ہے جس سے معاشرہ کی مذہبی اور سیاسی زندگی کی نشو و نما اور بقا میں مدد ملتی ہے

۱۰۴۔ خاندان دور تمدن سے پہلے

یہ تحقیق کرنا بہت مشکل ہے کہ خاندان کی ابتدا کب سے ہوئی۔ تاریخ کی نظر جہاں تک پہنچتی ہے وہ خاندان کو کسی نہ کسی صورت میں موجود پاتی ہے۔ غالباً اور معاشرتی اداروں کی طرح اس نے بھی آہستہ آہستہ اور بے قاعدہ طور پر نشو و نما پائی ہوگی۔ مرد اور عورت کے جنسی تعلقات کے متعلق قدرتی طور پر یہ فرض کیا جاتا ہے کہ ابتدا میں یہ ہر طرح کی قید سے آزاد ہوں گے۔ لیکن نہ تو آجکل کوئی ایسا قبیلہ موجود ہے جس میں یہ بے قیدی پائی جائے اور نہ تاریخ سے اس کا پتہ چلتا ہے جن قبائل میں سب سے کم قیود تھیں وہاں مرد اور عورت ایک غیر معین مدت تک ساتھ رہتے تھے۔ ایسی صورت میں خاندان کو استقلال نصیب نہ تھا اور آپس کے رشتے غیر معین تھے۔ چونکہ خاندان کے وجود کا اصل مقصد بچوں کی تربیت ہے اس لئے اس کی تنظیم ہمیشہ تمدنی حالات کے لحاظ سے ہوتی رہی ہے۔ چنانچہ معاشرے کی نشو و نما کی تاریخ میں ہمیں شادی کے متعدد طریقے نظر آتے ہیں اور یہ انکشاف ہوتا ہے کہ موجودہ یک زنی خاندان جس کے باہمی رشتے معین ہیں صدیوں کی ارتقا کا نتیجہ ہے۔ خاندانی زندگی کے تغیرات میں اور معاشرے کی نشو و نما میں اس قدر گہرا تعلق ہے کہ بعض لوگوں کے نزدیک خاندان کی ارتقا کا مطالعہ تمدنی ترقی کے اندازے کے لئے کافی ہے۔

۱۰۵۔ شادی کے ابتدائی طریقے

بعض مصنفین مثلاً ملک لینن[1] نے یہ کوشش کی ہے کہ طریقِ ازدواج کی ارتقا بے قید جنسی تعلقات سے لے کر یک زنی شادی تک دکھائیں۔ اگرچہ ان لوگوں

---

[1] Mc Lennan

ان مدارجِ ارتقا میں جو ترتیب قائم کی ہے وہ مدلّل نہیں ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ شادی کے یہ سب طریقے مختلف معاشروں میں موجود تھے۔ آج کل بہت سے غیر متمدن قبیلے موجود ہیں جن کے یہاں خاندانی رشتے بہت غیر معین ہیں اور شادی کے طریقے ہم سے بہت مختلف ہیں۔ مگر یہ کہنا مشکل ہے کہ کل نوعِ انسانی جنسی بے قیدی سے لے کر آج کل کی یک زنی شادی تک طریق ازدواج کے تمام مدارج سے گزر چکی ہے۔ پھر بھی اگر ہم غیر متمدن معاشرے پر نظر ڈالیں تو ایسی شادی کی مثالیں نظر آتی ہیں جو بغیر کسی رسم کے ہوتی ہے۔ بلکہ قریب قریب جنسی بے قیدی کا رنگ دکھائی دیتا ہے کم سے کم یہ حالت تو ضرور پائی جاتی ہے کہ عورت مرد بغیر نکاح کی رسم کے بے تکلف ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ ایک صورت یہ ہے کہ دونوں اس وقت تک ازدواجی تعلقات رکھتے ہیں کہ بچہ پیدا ہو جائے یا وہ بڑا ہو کر ماں کی نگرانی سے آزاد ہو جائے۔ ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ مرد جب تک چاہے عورت کے ساتھ رہے اور جب چاہے دوسری بیوی کرلے۔ اس کے علاوہ بعض قبیلوں اور قوموں کی نشو و نما میں ایک دور ایسا بھی گزرا ہے جب ان کے یہاں تعددِ ازواج اور تعددِ شوہران کے طریقے اُن صورتوں میں رائج تھے جو انھوں نے بعد میں اختیار کرلی تھیں۔ کہیں مرد کو کئی بیویاں رکھنے کا حق تھا کہیں عورت کے کئی شوہر ہوتے تھے۔ کہیں چند بھائی مل کر چند بہنوں سے شادی کرتے تھے۔ پھر آگے چل کر خانگی رکھنے کا طریقہ نکلا۔ یہ سب طریقے رفتہ رفتہ مٹ گئے فقط ایک مرد اور ایک عورت کی شادی کا طریقہ باقی رہا۔ غرض یہ تو ثابت نہیں ہو سکتا کہ ساری نوعِ انسانی یکے بعد دیگرے ازدواجی زندگی کے کل مدارج سے گزر چکی ہے مگر اس میں شک نہیں کہ موجودہ پاک گھریلو زندگی صدیوں کے ارتقا کا نتیجہ ہے اور پرانے اور نئے خاندانی رسم و آئین میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

۱۰۶۔ خاندانی زندگی دورِ تمدّن سے پہلے

عہد قدیم کی خاندانی زندگی کے ماحول میں بہت سی ایسی چیزیں تھیں جو اب

موجود نہیں ہیں۔ اُس زمانے میں صنعت و حرفت آج کل کی طرح منظم نہیں تھی، غذا کا ذخیرہ محدود تھا۔ لباس اور مکان بھی ایسے نہ تھے کہ موسمی اثرات سے پوری طرح محفوظ رکھ سکیں۔ جو تھوڑی بہت صنعتیں موجود تھیں اُن کے کاریگر اپنے کام میں ماہر نہیں تھے۔ مشین اور قدرتی قوت سے کام نہیں لیا جاتا تھا۔ سیاسی تنظیم ہنوز قائم نہیں ہوئی تھی جہاں کہیں عام معاشرتی نظم ابتدائی حالت میں نظر بھی آتا تھا وہاں بھی وہ چیزیں نہ تھیں جنھیں ہم آج کل سیاست اور ریاست کہتے ہیں۔ مذہب اکثر صورتوں میں غیر منظم ضعیف الاعتقادی کا نام تھا جس میں نظم و ضبط کی وہ قوت نہ تھی جو ایک اخلاقی عامل میں ہونا چاہیے۔ ایسے ماحول میں رہنے والے خاندان کو باہر سے کسی قوت یا آئین کی مدد نہیں ملتی تھی۔ وہ اپنی مستقل اور جداگانہ زندگی رکھتا تھا اور معاشرتی نظم کی قریب قریب ساری ذمہ داری اُسی پر تھی۔ اس لئے بہ حیثیت ایک منظم قوت کے جوں جوں اُس کا بوجھ بڑھتا گیا اور اس کی راہ میں مشکلات زیادہ ہوتی گئیں وہ اور مستحکم ہوتا گیا۔ چنانچہ جب وہ غیر معین بے اصول حالت سے نشو و نما پاکر ایک معین اور متحد النوع اِدارہ بن گیا تو اُس کی قوت، اُس کے فرائض اور اس کی ذمہ داری میں بہت بڑا اضافہ ہوگیا۔

۱۰۷۔ قدیم یک زوجی خاندان

یونانیوں کے یہاں، اور دوسری آری قوموں کے یہاں جہاں تک ان کی تاریخ کی تحقیق ہوی ہے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ یک زوجی خاندان کا دستور عام تھا اور قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اُس پاک گھریلو زندگی سے جو مرد عورت کی عمر بھر کی رفاقت پر مبنی تھی آریوں کی سیرت کی نشو و نما ہمیشہ متاثر ہوتی رہتی تھی۔ خاندان والوں کا یہ چھوٹا سا حلقہ، جس کا مرکز میاں بیوی کی رفاقت تھی، اپنی جداگانہ زندگی اور اپنی مخصوص معاشرتی صفات رکھتا تھا۔ اور اس کے دامنِ عاطفت میں چھوٹے بڑے سب پناہ لیتے تھے۔ یہ حلقہ کچھ تو قدرتی افزائش کی بدولت اور کچھ دوسرے لوگوں کو خاندان میں شریک کر لینے سے وسیع ہوتا گیا۔ بچے بڑے ہونے کے بعد بھی خاندان ہی میں رہتے تھے اس لئے کہ

قدیم منظم دائرہ بہت سے عزیزوں پر مشتمل تھا جو رشتۂ اتحاد میں منسلک تھے۔

۱۰۸۔ سر قبیلی خاندان

قدیم خاندان کی ایک خاص شکل سر قبیلی کہلاتی تھی۔ یہ خاندانی زندگی کی ابتدائی صورت نہیں تھی بلکہ آگے چل کر پیدا ہو گئی تھی۔ اس کا زیادہ زور سامی اور آری نسلوں میں تھا۔ غیر متمدن قوموں میں اس طریقے کا رواج نہیں تھا۔ اس میں جماعت کا سب سے زیادہ سن رسیدہ رکن اس کا سردار ہوتا تھا۔ اس کے ماتحت ایک خاندان یا کئی خاندان ہوتے تھے جو آپس میں اتحادِ خون یا شادی بیاہ یا موالات کے رشتے میں مربوط ہوں۔ یہ سردار اپنی ساری جماعت کا حاکمِ مطلق اور عملی طور پر اس کی کل املاک کا مالک ہوتا تھا۔ ہر فرد کی موت اور زندگی اس کے اختیار میں تھی۔ وہ مذہبی پیشوا بھی تھا، حاکمِ عدالت بھی، بادشاہ بھی، سپہ سالار بھی، واضع قانون بھی اور تمام معاشرتی امور کا انتظامی افسر بھی۔ اس منظم اور مربوط خاندان نے اپنی مستقل ہستی قائم رکھی اور اس کی قوت بہت بڑھ گئی۔ اس خاندان میں قانون اور ضابطے کی حکومت نہیں تھی بلکہ رسم و رواج کا دور دورہ تھا۔ فرد کے پیدائشی حقوق قانون پر مبنی نہیں تھے بلکہ خاندان کے دستور پر۔ خود سردارِ خاندان بھی اپنے آبا و اجداد کے رسم و رواج کا پابند ہوتا تھا۔ لیکن اصل میں اس رسم و رواج میں آہستہ آہستہ تغیر یا نشو و نما ضرور ہوئی ہوگی ورنہ قانون اور ریاست کا وجود میں آنا ناممکن تھا۔

۱۰۹۔ مذہب کا اثر خاندانی زندگی پر

خاندان کی ابتدائی زندگی پر مذہب کا اثر اس قدر گہرا تھا کہ بعض مصنفوں نے اسے خاندان کی بنیاد قرار دے دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کا یہ خیال غلط تھا کیونکہ خاندان کی بنیاد مذہبی نہیں بلکہ حیاتی تھی مگر اس میں شک نہیں کہ مذہب نے ہمیشہ خاندان کو متحد رکھنے میں ایک مضبوط رابطے کا کام دیا ہے اور اس کی بدولت اس کی قوت میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ شادی بیاہ کے دستور کی نشو و نما پر مذہب کا

بہت گہرا اثر پڑا ہے۔ یہ بات کل معاشرتی نظاموں میں نظر آتی ہے مگر قبیلی نظام میں خاص طور پر نمایاں ہے۔ خصوصاً آری قوموں میں مذہب نے خاندان کے رابطے کو بہت مضبوط کر لیا۔ اس کے نام کو بڑی اہمیت دی اور اُسے اتحاد، قوت اور عظمت بخشی۔ ہر خاندان اپنی جداگانہ قربان گاہ رکھتا تھا۔ اور علحدہ عبادت کرتا تھا۔ خاندانی عبادت کے مقدس دائرے میں کوئی باہر کا آدمی داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ ہر خاندان کی عبادت میں ایک مستقل خصوصیت یہ تھی کہ مورثِ اعلیٰ یعنی بانیٔ خاندان کی پرستش کی جاتی تھی۔ اس کی روح کی حُرمت میں شراب وغیرہ زمین پر چھڑکی جاتی تھی اور اس کے نام کے بھجن گائے جاتے تھے۔ اس رسم کی بدولت خاندانوں میں اتحاد پیدا ہوا اور اُسے یہ قوت حاصل ہوئی کہ تنازع للبقا میں دوسروں کا مقابلہ کرے۔

مذہب نے آپس کے میل جول کو بھی محدود کر دیا۔ جو لوگ مذہبی دائرے کے باہر تھے وہ اتحاد تو ایک طرف ملنے جُلنے کے قابل بھی نہیں سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ یہودی غیر یہود کو اور یونانی اور رومی دوسری قوموں کو جنھیں وہ وحشی کہتے تھے حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ غرض مذہبی زندگی کو ہمیشہ اور خصوصاً قبائلی زندگی کے استحکام کے بعد مخصوص نسلی خصوصیتوں کی نشو و نما میں بہت دخل رہا ہے۔

۱۱۰۔ نفسی اثرات اور خاندانی تنظیم

مگر اجتماعی نشو و نما کے آخری نتائج پر مذہب سے بھی زیادہ نفسی عوامل کا اثر پڑا۔ خاندانی زندگی کی بدولت نوعِ انسانی میں محبت کا جذبہ پیدا ہوا اور اسے اجتماعی نظم کے پیدا کرنے اور قائم رکھنے میں بڑا دخل ہے۔ جس چیز کی حیثیت محبت کے بغیر بقائے نسل کے ایک حیاتی فعل سے زیادہ نہ ہوتی اُسے محبت نے اُنس اور ہمدردی کے لطیف جذبات کا سرچشمہ بنا دیا۔ خاندان اور گھر کے طفیل میں بنی نوع کی محبت کے جذبے نے نشو و نما پائی۔ اگر اس جذبے کے اثرات معدوم ہو جائیں تو انسان کی وحشیانہ جبلتیں دم بھر میں اجتماعی شیرازے کو توڑ کر رکھ دیں۔ وہ احساسِ خیال اور ارادے کی ہم آہنگی جس کی بدولت

لوگ مل جل کر رہتے ہیں ان نفسی تعلقات ہی سے پیدا ہوئی ہے جن پر خاندانی رشتے مبنی ہیں۔ غرض مفید اور منظم اجتماعی زندگی کی بنیاد محبت کا جذبہ ہے اور اس کا منبع خاندان ہے۔

۱۱۱۔ خاندانی زندگی کی معاشی بنیاد

معاشرۂ انسانی کا وہ واحدہ جو دولت کو پیدا کرتا ہے اور تقسیم کرتا ہے خاندان ہے۔ غذا یا دوسری اشیا پہلے خاندان میں آتی ہیں پھر افراد میں تقسیم ہوتی ہیں۔ قدیم زمانے کے منظم خاندان میں شکارگاہ اور کھیت سے جو کچھ حاصل ہوتا تھا وہ خاندان میں لاکر مشترک ملکیت کی حیثیت سے رکھا جاتا تھا اور سب ارکان میں تقسیم ہوتا تھا۔ آگے چل کر گلہ بانی کے دور اور کاشتکاری کے دور میں اشتراکی ملکیت کا رواج نظر آتا ہے۔ اراضی اور مویشی کے گلّے قبیلے کی ملکیت ہوتے تھے جو ایک وسیع خاندان کی حیثیت رکھتا تھا اور گھر کے سامان کے مالک چھوٹے خاندان یا اُن کے افراد ہوتے تھے۔ مگر ہر صورت میں دولت کی تقسیم کا مرکز خاندان ہی تھا۔ آج کل قریب قریب کل آمدنی ایک فرد یعنی بزرگِ خاندان کے ہاتھ سے صرف ہوتی ہے۔ البتہ دوسرے لوگ گھر کی چیزوں کی حفاظت اور صحیح استعمال میں مدد دیتے ہیں۔ بعض خاندانوں میں اور ارکان بھی اپنے کل مصارف یا اُن کا ایک جز و خود کما کر ادا کرتے ہیں اور اس طرح خاندان کی مجموعی آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے۔ خاندانی زندگی کے معاشی پہلو کی عمدہ مثال اُس زمانے میں نظر آتی ہے جب نوآبادیاں نئی نئی بسائی گئی تھیں۔ کتائی، بنائی اور سلائی کا کام گھروں میں ہوتا تھا اور گھر کے اور کھیت کے قریب قریب کل اوزار اور آلات گھر ہی میں بنتے تھے۔ ان خاندانوں کی حالت بڑی حد تک وہی تھی جو غیر متمدن خاندانوں کی اُس عہد میں تھی جب نہ تقسیم محنت کا رواج تھا اور نہ صنعت و حرفت میں طبعی قوتوں سے کام لیا جاتا تھا۔ آج بھی امریکہ میں بہت سی چیزیں گھروں میں بنتی ہیں۔ عموماً ملک کی دولت آفریں قوتوں کا اندازہ کرتے وقت ان

گھریلو صنعتوں کا لحاظ نہیں رکھا جاتا حالانکہ ان کی سالانہ پیداوار کئی بلین ڈالر کی ہوتی ہے۔

خاندان کو معاشی مرکز قرار دینے کا اثر معاشرے پر یہ پڑتا ہے کہ صنعت وحرفت کی بنیاد پائدار اور آمد و خرچ کی نسبت معین رہتی ہے۔ مگر اب اجتماعی زندگی میں جو تبدیلیاں ہو رہی ہیں ان کی بدولت افراد کا رابطہ خاندان سے کم ہوتا جاتا ہے۔ عورتوں میں کسب معاش کی صلاحیت بڑھ گئی ہے اور انھیں اپنی روزی آپ کمانے کا موقع ملتا ہے اس لئے انھیں بڑی آزادی حاصل ہو گئی ہے۔ قدیم خاندانی اتحاد ٹوٹتا جاتا ہے اور انفرادی زندگی نشو و نما پا رہی ہے۔ گھر کو خاندان کے افراد قیام گاہ سمجھتے ہیں۔ ہر شخص اپنا خرچ خود برداشت کرتا ہے اور اپنی علٰحدہ معاشی زندگی رکھتا ہے۔

۱۱۲۔ خاندان کا رتبہ نظامِ اجتماعی میں

اوپر کے صفحات سے یہ واضح ہو گیا ہو گا کہ خاندان نظامِ اجتماعی کا واحدہ ہے۔ اس کے پاک دائرے کے اندر تربیت پا کر لوگ وسیع اجتماعی زندگی کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ وہ نہ صرف دولت آفرینی، تقسیم دولت اور حقوقِ ملکیت کی تعلیم حاصل کرتے ہیں بلکہ یہ بھی سیکھتے ہیں کہ جماعت میں رہنے والے افراد کے حقوق و فرائض کیا ہوتے ہیں۔ یہیں وہ مذہب کے مبادیات سے واقف ہوتے ہیں کیونکہ تہذیب کے ہر شعبے کا سرا خاندان ہی میں ملتا ہے۔ سیاسی حیثیت سے دیکھئے تو گو شہریت کے حقوق و فرائض کے لحاظ سے خاندان ریاست سے بالکل علٰحدہ چیز ہے مگر سیاسی زندگی کی تربیت بھی خاندان ہی میں ہوتی ہے۔ یہیں مسائلِ عامہ پر گفتگو ہوتی ہے اور افرادِ خاندان سیاسی امور پر رائے زنی کرنا سیکھتے ہیں۔

عموماً بچے اپنے والدین کی سیاسی رائے کی تقلید کرتے ہیں اور انھیں کی پارٹی میں ہوتے ہیں۔ لیکن اصل میں ہر فرد کو ریاست سے بلا واسطہ ذاتی تعلق ہے جو خاندانی رشتوں کا اور خاندانی اثرات کا پابند نہیں۔ نظامِ اجتماعی کی تاریخ

میں ایک زمانہ ایسا گزرا ہے جب صورتِ حال بالکل مختلف تھی۔ فرد کو شہریت کے حقوق خاندانی تعلقات کی بنا پر ملتے تھے۔ بعض مشرقی قوموں مثلاً چینیوں میں جہاں قدیم رسم و آئین قائم ہے آج بھی یہ اصول رائج ہے۔ لیکن جدید معاشرے میں جہاں ولادت اور موت کے رجسٹر رکھے جاتے ہیں عام مدنی حکومت کے مسائل ہیں خاندانی تعلقات ریاست کے ماتحت ہوتے ہیں۔

باب ششم

ریاست کی ابتدا اور نشو ونما

۱۱۳ - ریاست کی ماہیت

ریاست کے معنی ہیں کسی جماعت کے افراد کی تنظیم مفادِ عامہ کی غرض سے۔ اِسے اتحادِ عمل پر مبنی مدنی حکومت کا مظہر یا مجسمہ سمجھنا چاہیے۔ اس کا مقصد جماعت کی اور ضمناً فرد کی حفاظت اور بقا ہے۔ اصل میں ریاست افراد کے ایک مجموعے کا نام ہے جن میں سے ہر ایک کو کل مجموعے سے وہی تعلق ہے جو جسمِ نامی کے اعضا کو پورے جسم سے ہوتا ہے۔ یہ ایک عام ادارہ ہے جس میں اور سب ادارے شامل ہیں اور اس سے زیادہ جماعت کی تعاملی زندگی کی نمائندگی کوئی نہیں کرسکتا۔ یہ چیزیں یعنی سیاسی اتحادِ عمل، فرد اور جماعت کا مخصوص تعلق، اور سب اداروں کو محیط ہونا اور مفادِ عامہ کا مقصد وہ خصوصیتیں ہیں جو ریاست کو دوسرے اجتماعی اداروں سے ممیز کرتی ہیں۔

ہمیں اپنے ذہن میں ریاست اور حکومت کے تصورات کو ایک دوسرے سے الگ رکھنا چاہیے۔ حکومت وہ آلہ ہے جس کے ذریعے سے ریاست کارفرما ہوتی ہے یعنی رائے عامہ اور ارادۂ عامہ کو عملی جامہ پہنایا جاتا ہے خواہ حکومت اشتمالی ہو یا

سر قبیلی یا شاہی یا جمہوری۔ بہرحال وہ محض ایک شکل ہے ریاست کی قوت کو عمل میں لانے کی۔ دوسری طرف ریاست میں اور محض معاشرتی جماعتوں میں چاہے وہ جمہور کہلاتی ہوں یا قبیلہ یا قوم، فرق کرنا چاہیے۔

ریاست کی ابتدا کا پتہ چلانا مشکل ہے۔ مثل دوسرے اداروں کے اس کی تشکیل متعدد اثرات اور مختلف حالات کے ماتحت آہستہ آہستہ غیر محسوس طور پر ہوئی۔ علے ہذالقیاس اس کی ارتقا کی رفتار یکساں اور مسلسل نہیں رہی۔ یہ نہیں کہہ سکتے کہ ریاست کی نشو و نما ترتیب وار مختلف شکلوں میں ہوتی رہی اور ایک شکل دوسری شکل میں جذب ہوتی گئی۔ بلکہ سچ پوچھیے تو یہ زندگی کا ایک ضابطہ ہے جو جماعت کی ہر شکل میں موجود ہوتا ہے۔ منطقی ترتیب اور زمانی ترتیب دونوں کے لحاظ سے خاندان کا وجود ریاست کی باضابطہ تشکیل سے مقدم ہے۔ لیکن غیر متمدن گروہ جس میں خاندان کی تقسیم غیر معین ہوتی، سر قبیلی خاندان اور قبیلہ ان سب میں اکثر ریاست کے عناصر نظر آتے ہیں۔ اس لئے کہ جہاں کہیں مفادِ عامہ کے لئے اتحادِ عمل ہو، جہاں کہیں مدنی زندگی کی خفیف سی جھلک بھی نظر آئے وہاں یہ سمجھنا چاہیئے کہ ریاست کی ابتدا ہو گئی۔

ریاست روز بروز تکمیل کی طرف قدم بڑھاتی ہے مگر مکمل ریاست کے تصور نے کبھی عملی جامہ نہیں پہنا۔ مفادِ عامہ کا بہتر علم حاصل ہونا، سیاسی اتحادِ عمل کی ترقی، روحِ اجتماعی کی ہم آہنگی، فرد کے حقوق کی محافظت، نظامِ سیاسی کا استحکام یہ سب چیزیں ظاہر کرتی ہیں کہ ہم منزل سے قریب ہوتے جاتے ہیں مگر وہاں تک پہنچنا ناممکن ہے کیونکہ ہمارے نصب العین کے بدلنے سے منزلِ مقصود اور دور ہو جاتی ہے۔

۱۱۴۔ ریاست کی نسلی بنیاد

قدرتی نسلوں میں خاندانی تعلقات کے کل مدارج کی جھلک نظر آتی ہے۔ ان میں یہ تعلقات اور سب چیزوں سے زیادہ نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ مگر ان میں سے اکثر معین اور واضح عمل سیاسی پایا جاتا ہے۔ ہم بے تکلف یہ کہہ سکتے

ہیں کہ دنیا میں نسلوں کی تقسیم ریاست کی باضابطہ ابتدا سے پہلے ہو چکی تھی۔ اس دوران میں فرد کو کل جماعت سے جداگانہ تعلق شاذ و نادر ہی ہوتا تھا۔ اس کے سارے تعلقات اپنے خاندان تک محدود تھے۔ گو بچوں کے نام باپ کے نام پر رکھے جاتے تھے مگر معاشرتی نظام کا مرکز ماں کی ذات تھی۔ جن قبیلوں میں سر قبیلی نظام رائج تھا وہاں مرکزی قوت زیادہ مستحکم ہوتی تھی، خاندان میں رابطۂ اتحاد زیادہ مضبوط ہوتا تھا اور حاکم و محکوم الگ الگ نظر آتے تھے۔ ان میں سے اکثر قبائل کو جدید ریاست کی شکل اختیار کرنے سے پہلے نسلی زندگی کے اعلےٰ مدارج سے گزرنا پڑا جس زمانے کی تاریخ موجود ہے اس میں فینیقی[1]، عبرانی[2]، یونانی، رومی اور ٹیوٹن قومیں نسلی زندگی سے مدنی زندگی میں داخل ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ رفتہ رفتہ خاندانوں اور قبیلوں کے حقوق کی جگہ فرد کے حقوق اور مفادِ عامہ کا دور دورہ ہو گیا۔

۱۱۵۔ نسلوں کی نزاع اور ان کا مخلوط ہونا

لیکن جب کبھی خاندان وسعت پا کر قبیلے کی شکل اختیار کرتا تھا یا قبیلہ قوم بنتا تھا تو سوائے شاذ صورتوں کے ہمیشہ نسلیں مخلوط ہوتی تھیں۔ جب خاندان یا قبیلے مستقل بنیاد پر قائم ہو جاتے تھے تو تنازع للبقا شروع ہو جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ بعض خاندان یا قبیلے معدوم ہو جاتے تھے اور جو بچ رہتے تھے وہ مل کر ایک ہو جاتے تھے۔ مفتوح غلام بن کر فاتح کے ساتھ متحد ہو جاتے تھے یا دونوں بالکل گھل مل جاتے تھے۔ انھیں آپس میں نزاع کرنے والے قبیلوں کے تعلقات کے انضباط سے ریاست کی بنیاد پڑی۔ جو قبیلہ مغلوب ہوتا تھا وہ یا تو غلام بنا لیا جاتا تھا یا کم سے کم غالب قبیلے میں ادنےٰ طبقے کی حیثیت سے رکھا جاتا تھا۔ دوسری صورت میں اس کے حقوق اور فرائض

---

[1] Phoenicians

[2] Hebrews

وغیرہ مقرر ہو جاتے تھے اور دونوں جماعتوں کی سیاسی حیثیت ایک دوسرے کے مقابلے میں معین ہو جاتی تھی۔ ایک ہی قبیلہ کا نشو و نما پاکر ریاست کے درجے پر پہنچ جانا بھی ممکن ہے لیکن قدرتی عمل یہی ہے کہ کئی قبیلوں کے متحد ہونے سے ریاست کی تشکیل ہو۔ متمدن قوموں میں ایتھنس اور روم والے اور قدرتی نسلوں میں ارو کواس[1]، ہاپی[2] اور ازٹک[3] لوگ متحدہ یا متفقہ قوموں کی مثالیں پیش کرتے ہیں۔ نسلوں کے متحد اور مخلوط ہونے کے دوران میں فرد کا تعلق کل جماعت سے زیادہ واضح اور معین ہو گیا۔ ریاست کی نشو و نما مختلف نسلوں کے کامل اتحاد اور کل طبقوں کے حقوق تسلیم کیے جانے کے اصول پر ہوئی۔ ریاست سیاسی اتحادِ عمل پر مبنی ہے جس کے لیے مختلف طبقوں کی مصالحت لازمی ہے۔

۱۱۶۔ نسلی معاشرے کا مدنی معاشرے کی صورت میں منتقل ہونا

نسلی یا خاندانی تعلقات پر مبنی جماعتوں کے عام مدنی معاشرے میں منتقل ہونے کی بہت سی دلچسپ مثالیں ہیں۔ اسی تغیر کی بدولت ریاست کی نشو و نما کی رفتار بہت تیز ہو گئی۔ یوں تو بہت سے قبیلوں کے ہاتھ میں سیاسی قوت آگئی تھی اور ان میں ریاست کی متعدد صفات پائی جاتی تھیں لیکن جدید ریاست کی باضابطہ تشکیل اسی وقت ہوئی جب نسلی تعلقات بالکل ہٹ گئے۔ جیساکہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں غیر متمدن معاشرے میں خاندان اجتماعی نظم کا سب سے بڑا ذریعہ تھا۔ نظم اجتماعی کے قائم کرنے اور قائم رکھنے میں اکثر خاندان ایک ابتدائی صورت میں، ریاست کے تمام اہم فرائض اکثر انجام دیتا تھا۔ خاندان کی تعداد، قدرتی افزائش اور موالات کی بدولت بڑھتی گئی یہاں تک کہ وہ ایک

---

[1] Iroquois

[2] Hopi

[3] Aztecs

قائد یا سردار یا سر قبیلہ کے ماتحت ایک بہت بڑا قبیلہ بن گیا۔ اب یہ ضرورت پیش آئی کہ نظم و ضبط کے طریقے اختیار کیئے جائیں۔ قریب قریب کل قوت بزرگ خاندان کے (جو آگے چل کر سر قبیلہ کہلانے لگا) ہاتھ میں دے دی گئی۔ اس کا یہ فرض تھا بزرگوں کے رسم و رواج پر عمل کرائے اور نئے حالات کے لحاظ سے قواعد و ضوابط بناتا رہے۔ آگے چل کر جب ریاست قائم ہوئی تو یہی قواعد نشو و نما پاکر قانون بن گئے۔ سر قبیلہ اپنے قبیلے کے افراد کی باہمی نزاعوں کا فیصلہ بھی کیا کرتا تھا۔ اس لئے وہ اس جماعت کا اعلےٰ حاکمِ عدالت بن گیا۔ آگے چل کر یہ اختیار دوسرے افسروں کی طرف منتقل ہوگیا اسی طرح جیسے قانون بنانے کا اختیار قبیلے یا قوم کے سردار سے اس جماعت کی طرف منتقل ہوگیا جو اس مقصد کے لیئے منتخب کی جاتی تھی۔ اس ابتدائی زمانے میں حکومت کے کل عدالتی، انتظامی اور وضعِ قوانین کے اختیارات اور وظائف ایک شخص کی ذات میں جمع تھے۔ یونانیوں، رومیوں، اور عبرانی قوموں میں ریاست کی نشو و نما کی تاریخ اصل میں ان اختیارات کی توسیع اور تفریق اور ان کے افراد اور مجالس کی طرف منتقل ہونے کی تاریخ ہے۔

۱۱۷۔ اسباط بہ حیثیت معاشرے کی وحدات کے

سر قبیلی خاندان کی توسیع کے دوران میں بعض گروہوں نے جو آپس میں زیادہ قریبی رشتۂ اتحاد رکھتے تھے اور اسباط کہلاتے تھے سیاسی نظم و قانون کی تاسیس میں نہایت اہم خدمات انجام دیں۔ سبط چند ایک جدی خاندانوں کے مجموعے کا نام تھا جس کی تنظیم نسلی بنیاد پر ہوتی تھی۔ سر قبیلی خاندان میں سبط کی بعض خصوصیات تھیں اور یہ ہر معاشرے میں جس میں خاندانی زندگی نے کافی نشو و نما پائی باقی رہیں۔ ایک سبط کے کل افراد ایک مشترک مذہبی عقیدہ رکھتے تھے اور ایک ہی دیوتا کی پرستش کرتے تھے اس لیئے ان کے رسومِ عبادت بھی مشترک تھے۔ ہر سبط کا نظم و ضبط بہت سی رسوم اور چند قوانین کے ماتحت تھا۔ مثلاً یہ ایک مسلّمہ دستور تھا کہ کوئی فرد سبط کے اندر شادی نہیں کر سکتا، اسے باہر سے بیوی بیاہ کر لانا چاہیئے اور اس بیوی پر یہ لازم تھا کہ اپنے سبط کے دستور اور قانون کو خیرباد کہے اور جس سبط میں

وہ آن کر رہی ہے اس کا رسم و آئین اختیار کرے۔ جن عورتوں کی شادی سبط کے باہر ہوتی تھی وہ اپنی املاک اپنے ساتھ لے جایا کرتی تھیں اس لئے ورثے میں دولتِ کثیر پانے والی لڑکیاں اس قاعدے سے مستثنےٰ کر دی گئی تھیں۔ انھیں سبط کے اندر شادی کرنے کی اجازت تھی تاکہ ان کی املاک باہر نہ جانے پائے۔ جب حکومت نے نشو و نما پائی تو ابتدا اس فرد کے پیدائشی حقوق خاندان کے دستور پر مبنی تھے مگر آگے چل کر قانون کے ماتحت ہو گئے۔ رسم و رواج سے قانون کی طرف قدم بڑھانے کے دوران میں اسباط کے سردار بڑے قبیلے کے حاکم کے، جو آگے چل کر بادشاہ بن گیا، مشیر ہو گئے۔ حاکم قبیلہ کی یہ کونسل آگے چل کر سینیٹ یعنی ان معمر لوگوں کی مجلس بن گئی جو مشورے کے اہل سمجھے جاتے تھے۔ اس لیے حکومت اور قانون کے معاملے میں اسباط کے سردار افراد قبیلہ میں خاص امتیاز رکھتے تھے۔ یہی لوگ معاشرے کو خاندانی زندگی سے ریاستی حکومت کی طرف لانے میں واسطہ بنے اور انھیں کی بدولت سیاسی حکومت نے نشو و نما پائی۔

۱۱۸۔ ریاست کی نشو و نما کے نمایاں عناصر

جن موثرات سے ریاست وجود میں آئی ان میں سب سے قوی اتحادِ خون کو سمجھنا چاہیئے۔ یہی قدیم خاندانی جماعتوں کی بنیاد تھا۔ جب خاندانی حکومت کا دائرہ اتنا وسیع ہو گیا کہ اس کا سنبھالنا دشوار تھا اور ریاست کی ضرورت محسوس ہوئی تو اتحادِ خون ہی کے علاقے نے نسلی معاشروں کے اساس کا کام دیا۔ مذہب کی قوت کا بھی ریاست میں اتحاد اور عصبیت پیدا کرنے میں بڑا حصہ تھا کیونکہ قبیلے کی توسیع کے ساتھ ساتھ خاندانی مذہب بھی وسیع ہوتا گیا اور جب معاشرے نے قبائلی زندگی سے ریاست کی طرف قدم بڑھایا تو وہ قومی مذہب قرار دیا گیا چنانچہ حضرت ابراہیم کے خاندان کا مذہب عبرانی سلطنت کا قومی مذہب بن گیا اور آریہ خاندانوں کے مذہب نے یونانیوں کے قومی مذہب کی شکل اختیار کر لی۔ لیکن بلا واسطہ عوامل کی حیثیت

سے نظم کی ضرورت اور افراد جماعت کے تحفظ کی خواہش نے ریاست کی تاسیس میں اتحادِ خون اور مذہب سے بھی زیادہ اثر دکھایا۔ یہ ایک آدمی کی قوت سے باہر ہے کہ ایک بڑی جماعت میں اس طرح کا نظم و ضبط اور انصاف قائم رکھے جیسا باپ اپنے بچوں میں قائم رکھتا ہے۔ معاشرتی زندگی اس قدر پیچیدہ ہو جاتی ہے کہ پدرانہ حکومت سے کام نہیں چلتا اس لئے بہت سی خدمات اور وظائف دوسروں کے سپرد کرنا پڑتے ہیں۔ اس طرح پر حکومت کے وظائف میں ہمیشہ تفریق ہوتی رہتی ہے اور یہی ریاست کی تاسیس کا عمل ہے۔ نیز دوسری قوموں اور قبیلوں کے دوران میں ایک پورے گروہ کو مدافعت کے لئے منظم کرنا پڑتا ہے اور حفاظت کا مقصد ریاست کی تاسیس کا ایک قوی عنصر بن جاتا ہے۔

۱۱۹۔ "برادری" کے مقاصد

یونان کی "برادریاں" معاشرتی مقاصد خصوصاً مذہبی اور سیاسی اتحاد کے لئے قائم کی گئی تھیں۔ ہر "برادری" چند اسباط پر مشتمل ہوتی تھی جو باہم قریبی رابطہ رکھتے تھے اور پاس پاس رہتے تھے اس لئے اس میں ایک حد تک محروسی حکومت کی شان موجود تھی۔ اسی طرزِ حکومت سے جس پر رومی معشروں کی بنا تھی موجودہ مقامی حکومت کا اصول نکلا ہے جو بلدیہ کے حلقوں کی صورت میں نظر آتا ہے۔ اسباط کے ارکان الگ الگ بھی رہ سکتے تھے مگر "برادری" کے افراد کے لئے ایک ہی مقام پر رہنا ضروری تھا۔ "برادری" کے کل افراد کی عبادت مشترک تھی اور وہ ایک ہی سیاسی قائد کے ماتحت ہوتے تھے۔ ایک لحاظ سے وہ مقامی حکومت کے اصول پر مبنی تھی اور گو وہ ایک متحد النسل جماعت تھی لیکن اس کے قیام کو نسل یا خاندانی حکومت سے انحراف کی تمہید سمجھنا چاہیئے کیونکہ اسی کی بدولت عہدِ قدیم کی کل قوموں میں محروسی حکومت کی بنیاد پڑی۔ خصوصاً یونانی نظام اجتماعی میں "برادری" نمایاں حیثیت رکھتی تھی۔ اروکواس اور امریکہ کے قدیم باشندوں کے دوسرے قبائل میں بھی یہ چیز نظر آتی ہے۔ چنانچہ اروکواس قبیلوں کی متفقہ حکومت میں جو "ششش قومی" کہلاتی ہے ہر قبیلے میں دو برادریاں ہوتی تھیں۔

مثلاً کیوگا[1] قبیلے میں دو برادریاں تھیں۔ پہلی میں پانچ اسباط تھے ریچھ، بھیڑیا، کچھوا، چھاپرند اور بام (مچھلی) اور دوسری میں تین تھے ہرن، سمور، اور شکرا۔ ہر برادری معین اور واضح سیاسی حقوق و فرائض رکھتی تھی مگر برادری کو ریاست کی تاسیس میں بس اتنا ہی دخل تھا، سبط اور قبیلے کی اہمیت اس سے کہیں زیادہ تھی۔

۱۲۰۔ قبیلے کی تنظیم

قبیلے کو ہم کئی برادریوں کا مجموعہ کہہ سکتے ہیں لیکن یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ قبیلہ کئی برادریوں میں منقسم تھا۔ قبیلے کی تنظیم بالخصوص فوجی خدمت پر اور تمام اسباط کی مشترک عبادت پر مبنی تھی۔ اس کی تنظیم کا خاص مقصد یہ تھا کہ کل جماعت ایک فوجی قائد کے ماتحت ہو۔ یہ قائد اسباط کے سرداروں میں سے چنا جاتا تھا جنگ کے زمانے میں وہ سپہ سالار کی حیثیت سے تمام قبیلے کی پیشوائی کرتا تھا اور امن کے زمانے میں سر قبیلہ صدر کی حیثیت سے اسباط کے سرداروں کی مجلس کی صدارت کرتا تھا۔ آگے چل کر جب تنظیم زیادہ مکمل ہوگئی تو وہ بادشاہ کہلانے لگا مگر ہر صورت میں انتظامی، عدالتی اور وضعِ قوانین کے کل اختیارات اُسی کے ہاتھ میں تھے بلکہ قبیلے کی عبادت کا نظم و ضبط بھی اُسی کی نگرانی میں تھا۔ رفتہ رفتہ سارے قبیلے میں سیاسی اور مذہبی اتحاد بڑھتا گیا اور یہ عمومی طرزِ عمل نظر آنے لگا۔ خصوصاً سیاسی اور مذہبی اعمال میں عمومیت پیدا ہوگئی کیونکہ قبیلے کا کام صرف یہ تھا کہ حکومت کے عمومی شعبوں کا انتظام کرے اور عام قوانین بنائے۔

۱۲۱۔ بلدیہ یا شہری ریاست

قدیم حکومت کی ایک شکل جس کی بنیاد مقامی وحدوں پر تھی بلدیہ یا شہری ریاست کہلاتی ہے۔ اس کی حکومت تو قدیم خاندانی تنظیم پر مبنی تھی لیکن اس میں

[1] Cayuga

حکومت کا قومی تصور موجود تھا اور اسی سے باضابطہ سیاست کا آغاز سمجھنا چاہیئے۔

شائد اس کی سب سے اچھی مثال شہر ایتھنس ہے۔ یہ ابتدا میں چند دیہی پنچایتوں پر مشتمل تھا۔ جو ایک وسیع رقبہ میں پھیلی ہوئی تھیں۔ پہلے یہ مختلف قبیلوں کے اجتماع کا مرکز بنا جو مقامی امور کے انتظام کے لئے جمع ہوتے تھے۔ اس قدیم شہر میں دیوتاؤں کے مندر تھے جہاں ہر قبیلہ اپنے طور پر عبادت کرتا تھا۔ یہاں تجارتی منڈی اور ضلع کے کاروبار کا مرکز بھی تھا۔ مذہبی تہوار اور قربانیاں، عدالتوں اور مجلسوں کے اجلاس یہیں ہوتے تھے۔ جنگ کے زمانے میں لوگ یہیں جمع ہوتے تھے اور بادشاہ یا قبیلے کا سردار چند انتظامی افسروں کے ساتھ یہیں رہتا تھا۔ مگر جمہور چھوٹے چھوٹے قبیلوں کی شکل میں دوسرے مقامات پر رہتے تھے اور قبائلی زندگی بسر کرتے تھے۔ اس شہر کی بنا قدیم خاندانی زندگی کے زوال کی محض تمہید تھی کیونکہ وہ وقت ابھی دور تھا کہ یہ معاشرتی اور سیاسی زندگی کا مرکز بنے جس کی بدولت لوگوں کی زیادہ تعداد کھنچ کر یہاں آجائے اور خاندانی طرزِ معاشرت مٹ کر جمہوری نظام قائم ہو۔ شہر کی آبادی اور اہمیت رفتہ رفتہ بڑھتی جاتی تھی مگر قبیلے اور سبط کی تنظیم بدستور قائم تھی۔ بزرگِ خاندان یا سر قبیلہ ہنوز مذہبی پیشوا، حاکم عدالت اور بادشاہ کی حیثیت سے حکومت کرتا تھا۔ وہی قانون بھی بناتا تھا اور انتظامی اور عاملی اختیارات بھی رکھتا تھا۔ تھوڑے دن کے بعد شہر میں مختلف قبیلوں کا مجموعی نظامِ حکومت قائم ہوگیا۔ اس کی صورت ابھی تک حکومتِ بلدی کی نہ تھی جس کے مختلف انتظامی حلقے ہوتے ہیں اور ہر ایک مقامی حکومت کے حقوق رکھتا ہے۔ یہ محض ایک مجلس تھی جس میں مختلف قبیلوں کے نمائندے جمع ہو جاتے تھے۔ تاہم نسلی معاشرہ رفتہ رفتہ جمہوری معاشرہ بنتا رہا اور کچھ دن میں یہ شہر ایک بلدیہ بن گیا۔ بلدی حکومت کے فروغ سے قبائلی حکومت کا دور گھٹ گیا اور شہری ریاست کو کامل اقتدار حاصل ہوگیا۔ اب یہ ایک ایسی جماعت بن گئی جو ابھی تک قبیلوں میں منقسم تھی مگر

قبائلی حکومت بلدی حکومت کے ماتحت تھی۔ رفتہ رفتہ قبائلی حکومت ہٹتی گئی اور جمہور بہ حیثیت افراد کے ایک مرکزی حکومت کے ماتحت ہو گئے جس کے وہ ارکان بھی تھے۔

شہری ریاست یا بلدیہ جس کے بانی یونان والے تھے "مدینیہ" سے جس کی بنیاد رومیوں نے ڈالی مختلف تھا۔ مقدم الذکر آج کل کے بلدیے یا مینوسیپلٹی سے مشابہ تھا مگر فرق یہ تھا کہ اُسے حکومت کے کامل اختیارات حاصل تھے جو مینوسیپلٹی کو نہیں ہوتے۔ مدینیہ موجودہ زمانے کی ریاست سے زیادہ مشابہہ تھا۔ مدینیہ اس اصول کی توسیع پر مبنی ہے کہ ایک مرکزی فرماں روا یا مرکزی قوت کی عمومی حکومت ہو جسے مقامی یا ماتحت حکومتوں پر پورا اقتدار حاصل ہو۔ رومیوں کی ریاست کا اصول یہ تھا کہ حکومت بادشاہ سے شروع ہو کر جمہور تک پہنچتی ہے۔ یہ شہنشاہیت کا نظام تھا۔ شہری ریاست جو قبیلوں کے نمائندوں کے ملنے سے قائم ہوئی تھی آگے چل کر جمہور کی حکومت بن گئی جس کا رجحان حقیقی جمہوریت کی طرف تھا۔ برخلاف اس کے رومیوں کی ریاست ایک عالمگیر سلطنت بن گئی۔ شہر روما کو مرکز بنا کر یہ سلطنت ساری دنیا پر حکومت کرنا چاہتی تھی اور واقعی جتنے ممالک اس کی قلمرو میں داخل ہوئے سب میں اسی کا حکم نافذ تھا۔

۱۲۲۔ سیاسی شعبوں اور وظیفوں کی تفریق

حکومت کی ان مختلف شکلوں کی نشو و نما کے دوران میں انتظامی اور عاملی اختیارات کے حال بدلتے رہے۔ یہ تبدیلیاں بھی حکومت کی ارتقا کے مطابق ہوئیں۔ بادشاہ جس معاشرتی عمل سے بنے وہ اس طبیعی عمل سے کم واضح اور معین نہ تھا جس سے درختوں کی نشو و نما ہوتی ہے۔ یہ بالکل قدرتی بات تھی کہ بزرگِ خاندان اپنے خاندان کا حاکم اور قائد ہو اور جب خاندان وسعت پا کر قبیلہ بنا تو اسی اصولِ قیادت کے مطابق اس کے سب سے معمر رکن کا سردار بننا ضروری تھا۔ ظاہر ہے کہ جب حکومت میں مذہب کا دخل ہو گیا تو جس خاندان کا

سلسلۂ نسب اور خاندانوں کے مقابلے میں زیادہ دور تک یعنی دیوتاؤں سے زیادہ قریب پہنچتا تھا اسی کو سب سے زیادہ قوت و اقتدار حاصل ہونا چاہیے تھا۔ یہی وجہ تھی کہ قبیلے کے فرمانروا کے انتخاب میں وراثت کا اصول رائج ہوگیا۔ جب رفتہ رفتہ حکومت پیچیدہ ہوگئی اور قبائل متفرق ہو گئے تو انھیں موروثی سرداروں یا قائدوں میں سے ایک بادشاہ بن گیا۔ مگر بادشاہ بغیر مشیروں کے کام نہیں چلا سکتا تھا اس لئے اُس کا یہ دستور ہوگیا کہ ان معمر اشخاص کو، جو اسباط کے سردار اور بزرگ تھے، بلا کر اُن سے اُس زمانہ کی ابتدائی ریاست کے نظم و نسق میں مدد لے۔ انھیں مشیروں کی مجلس سینیٹ بن گئی جو ہمارے جدید نظامِ حکومت کی ایک بہت بڑی قوت ہے۔ اور چونکہ بادشاہ ہر کام خود نہیں کرسکتا تھا اس لئے رفتہ رفتہ حکومت کے انتظامی امور بھی ان مشیروں کے سپرد ہونے لگے۔ اس کے علاوہ بادشاہ نے جنگ میں قیادت کرنے کے لئے مذہبی امور کے انصرام کے لئے بلکہ ریاست کے تمام جزوی معاملات کے سرانجام کے لئے خاص عہدہ دار مقرر کئے۔ اس طرح رفتہ رفتہ بادشاہ علاوہ جمہور کا فرماں روا ہونے کے متعدد انتظامی عدالتی، عاملہ اور وضع قوانین کی مجلسوں کا اور بہت سے عہدہ داروں کا افسر ہوگیا۔

بادشاہ کے لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ جماعت کے تمام افراد کے باہمی معاملات کا تصفیہ کرسکے اس لئے اس نے اپنے قائم مقام مقرر کئے۔ یہ دستور رفتہ رفتہ قانون بن گیا۔ جو عہدہ دار بادشاہ کی قائم مقامی کرتے تھے ان کی اہمیت بڑھتی گئی یہاں تک کہ ایک عدالتی نظام قائم ہوگیا جس میں خاص خاص اہم معاملات کا مرافعہ بادشاہ کے یہاں کیا جاتا تھا۔ لیکن جب حکومت نے اور نشو و نما پائی تو بادشاہ کے بجائے عدالت العالیہ مرافعہ کی آخری عدالت قرار دی گئی۔

مگر جمہوری حکومت کی اہمیت بڑھتی جاتی ہے۔ پہلے تو انھیں بادشاہ یا سینیٹ کے احکام کی منظوری یا نامنظوری کا اختیار دیا جاتا ہے۔

اس کے بعد یہ حق ملتا ہے کہ دوسروں کی پیش کی ہوئی تجویزوں کے متعلق رائے دیں اور آخر میں خود اپنی مجلس میں قانون کے مسودے پیش کرنے اور منظور کرنے کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ پہلے یہ کام ساری جماعت کرتی تھی مگر آگے چل کر یہ اس کے نمائندوں کے سپرد کر دیا گیا جو خاص وضع قوانین کے مقصد کے لئے منتخب ہوتے تھے۔ اس طرح وہ مجلسِ عوام وجود میں آئی جسے یونان اور روم میں اس قدر اہمیت حاصل تھی اور جو آج انگلستان اور امریکہ کے نظام حکومت کا جزو اعظم ہے۔ اس طرح خاندان جو اپنی خاص روایات اور رسم و رواج اور قبائلی حکومت رکھتا تھا وسیع ہوتے ہوتے ریاست بن گیا جسے خاندانی رشتوں سے کوئی سروکار نہیں بلکہ اس میں فرد کل جماعت سے بلا واسطہ تعلق رکھتا ہے اور بادشاہ یا سرقبیلہ کے کلی اختیارات رفتہ رفتہ متفرق اور منقسم ہوتے گئے یہاں تک کہ وہ شعبے اور محکمے قائم ہو گئے جو آج موجود ہیں۔

۱۴۴۔ ریاستوں کے وفاقی نظام کی ابتدا

ریاست کی نشو و نما کے دوران میں جو تغیرات ہوئے ان کی بدولت معاشرے میں ایک خاص طرزِ حکومت کا رجحان پیدا ہو گیا۔ چونکہ ریاست قوموں، قبیلوں اور مقامی جماعتوں کے متفق ہونے سے بنی تھی اس لئے خیال ہوتا ہے کہ اسی اصول کی بنا پر آگے چل کر ریاستوں کو بھی متحد ہو جانا چاہیے۔ یونانیوں نے ایٹولین لیگ[1]، آکین لیگ[2] اور لیسین لیگ[3] اسی بات کی کوشش میں قائم کی تھیں۔ ان کا یہ مقصد تھا کہ اکثر یونانی ریاستوں کا ایک متفقہ نظامِ حکومت قائم ہو جائے لیکن یہ کوششیں اس لئے ناکامیاب ہوئیں کہ مقامی حکومتِ خود اختیاری کا عنصر بہت قوی تھا اور ریاستیں آپس میں رقابت رکھتی تھیں۔ بعض

---

[1] Aetalian League

[2] Achean League

[3] Lycian Leaguo

کے لحاظ سے یہ ناکامیابی بہت افسوسناک ہے کیونکہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر یونان متحد ہوتا تو دشمنوں کے حملوں کا مقابلہ آسانی سے کر سکتا تھا۔ متفقیت کا ایک عالمگیر اصول ہونا اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ امریکہ کے اروکواس قبیلوں نے بھی متفقہ حکومت قائم کرنے کی کوشش کی تھی میکسیکو کے ازٹیک قبیلوں اور دوسرے قبائل میں بھی اس کی مثال نظر آتی ہے۔ متفقیت اصل میں مختلف عناصر کو ملانے کا نام ہے۔ جہاں کہیں یہ نظام زیادہ دن تک رہا ہے مثلاً نشیبستان[1]، سوئستان[2] اور ریاستہائے متحدہ میں وہاں یہی رجحان غالب رہا ہے کہ کل ریاستیں مل کر ایک قوم بن جائیں عام معاشرتی یا سیاسی نشو ونما پر نظر ڈالئے تو افراد کی مختلف جماعتوں میں اتحاد کا عمل برابر جاری ہے مگر فرد کو جو تعلق ریاست سے ہے اس کے لحاظ سے ریاست کی قوتوں اور وظیفوں میں تفریق ہوتی جاتی ہے۔

۱۲۴۔ جدید معاشرتی ریاست

ریاست کی تعریف عام طور پر یہ کی جاتی ہے کہ وہ ایک سیاسی حیثیت سے منظم جماعت ہے جو ایک خاص محروسے میں رہتی ہے۔ سیاسی حیثیت سے منظم ہونے کے یہ معنی ہیں کہ ایک ضابطۂ قانون موجود ہو اور حکومت کا نظم ونسق بااصول ہو۔ یہ جماعت جس محروسے میں رہتی ہے اس کی مالک ہوتی ہے اور اُسے بیرونی حملہ آوروں سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔

لیکن جدید ریاست میں معاشرتی عنصر بھی بہت قوی ہوتا ہے اور اس لحاظ سے ہم اُسے ایک متحدہ جماعت کہہ سکتے ہیں جس میں خدمات کی تفریق بہت تفصیل سے کر دی گئی ہے۔ آج کل ریاست ایک جسمِ نامی ہے جس کی ساخت معاشرتی اصول پر ہوئی ہے اور جس میں چند افراد حکومت کرنے کے لئے

---

[1] Netherlands (Holland and Belgium

[2] Switzerland

منتخب کیے جاتے ہیں اور باقی سب لوگ ان کی اطاعت قبول کرتے ہیں۔ لیکن ہر فرد اپنا ایک معینہ محل اور معینہ خدمت رکھتا ہے۔ جدید جمہوری نظام میں ریاست کا وجود جمہور سے علٰحدہ تسلیم نہیں کیا جاتا اور جماعت کے کل افراد کی تنظیم محنت، خدمت اور ضبطِ نفس کو مد نظر رکھ کر کی جاتی ہے۔ خاندان سے ریاست تک کے سلسلۂ ارتقا میں حکومت کے تمام اصول برتے جا چکے ہیں۔ ابتدا میں حکومت محض حفاظتِ عامہ تک محدود تھی۔ رفتہ رفتہ اس کا کام نظمِ اجتماعی کا قائم رکھنا اور آخر میں کل جماعت کی معاشرتی فلاح کے لیے شعوری سعی کرنا ہو گیا۔ چنانچہ آج ریاست ایک زندہ اور نامی مجسمہ ہے۔ کسی جماعت کے خیالات، جذبات اور ارادے کا جس کا موضوع اجتماعی نظم و ضبط، اجتماعی فلاح اور افراد کے حقوق و فرائض کا تعین ہے ایک دوسرے کے مقابلے میں اور کل معاشرے کے مقابلے میں۔

بابِ ہفتم

ریاست کا نظریہ اور اُس کے وظائف

۱۲۵- اِرتقا اور نظریہ

ریاست کی ارتقا کے دو پہلو ہیں ایک داخلی دوسرا خارجی. پہلے سے مراد ہے افکار وخیالات کی ارتقا اور دُوسرے سے ریاست کی ہیئت خارجی کی ارتقا۔ پہلا فلسفۂ ریاست یا علم ریاست ہے۔ یہ سیاسی زندگی کے اصول معاشرتی نصب العین کے ماتحت قائم کرتا ہے، عملی حیثیت سے تو کسی عالمگیر سلطنت کا وجود نہیں ہے. جو کل متمدن قوموں کی سیاسی تنظیم کو محیط ہو لیکن علمی حیثیت سے ریاست کے کلی اصول اور تصوّرات موجود ہیں جو قومی یا ملکی حدود کے پابند نہیں۔ ریاست کا یہ تصور عموماً اِس فرضیے پر مبنی ہوتا ہے کہ ریاست کیسی ہونا چاہیئے۔ اِس میں اُن سب تصوّرات کا امتزاج ہوتا ہے جو مختلف قومیں اپنے اپنے نقطۂ نظر سے قائم کرتی ہیں۔ اسی لئے ریاست کے تصور کی ارتقاء میں مختلف قوموں کے فلسفی ہمیشہ اِس بارے میں متفق الرائے نہیں ہوتے کہ مکمل ریاست کسے کہتے ہیں۔

ارتقاء کا دوسرا پہلو ریاست کی محسوس نشو ونما ہے۔ اس کا مطالعہ کرنے کے لئے ہر ریاست پر علٰحدہ علٰحدہ نظر ڈالنا چاہیئے کہ اس کی تعمیر کے غیر شعوری اور شعوری دور میں اس کی عملی نشو ونما کیونکر ہوی۔ اس کا مشترک ماحصل بین الاقوامی

قانون ہے اور جداگانہ ماحصل ہر ریاست کا دستورِ اساسی ہے۔ ارتقاء کے یہ دو پہلو ہمیشہ ایک دوسرے سے علاقہ رکھتے ہیں خصوصاً جدید ریاستوں کی نشو و نما میں۔ یہ سچ ہے کہ کسی ایک ریاست کی ارتقاء کی تاریخ عام نظریۂ ریاست کی نشو و نما کا آئینہ نہیں ہے بلکہ اس سے صرف یہ پتہ چلتا ہے کہ خود وہ ریاست کیونکر وجود میں آئی لیکن ہر ریاست اپنے عملی تجربے سے ریاست کے عمومی تصور کے قایم کرنے میں مدد دیتی ہے۔ دوسری طرف نظریہ ریاست بھی منفرد ریاستوں کی عملی زندگی پر اثر ڈالتا ہے۔

ریاست کی ارتقا کا بہترین خارجی مظہر نظم حکومت ہے جو اسی کا ایک ادارہ ہے لیکن نظم حکومت کی نشو و نما سے صرف منفرد ریاستوں کے مدارج ارتقا کا اظہار ہوتا ہے کیونکہ سیاسی نظم و اصلاح میں تسلسل نہیں ہوتا۔ ایک ریاست کا نظم حکومت اسی تک محدود ہوتا ہے، بہ خلاف اس کے اصول حکومت ایک عہد سے دوسرے عہد میں اور ایک قوم سے دوسری قوم میں منتقل ہوتے رہتے ہیں مثلاً یونان اور روما نے جو اصول حکومت قائم کئے تھے ان سے بعد میں آنے والی ریاستیں ہمیشہ متاثر ہوتی رہیں۔ روم کی حکومت کا شیرازہ بکھرنے کے بعد جو دور آیا اس میں نئی ریاستیں قائم ہوئیں لیکن انھوں نے رومیوں کی بلدی اور مدنی حکومت کے اصول کو اپنے دستورِ اساسی میں شامل کر لیا۔ عہد جدید کی شاہی حکومت کا اصل اصول رومی شہنشاہی سے ماخوذ ہے مگر چونکہ اس زمانے میں جمہور حق حکومت کے مدعی ہیں اس نئے پرانے نظام میں بہت کچھ تغیر کرنا پڑا یعنی شہنشاہ یا بادشاہ کے اختیارات دستور اور آئین کے ذریعے سے محدود کر دئیے گئے۔ اسی طرح آج کل کی جمہوری حکومت کے بعض اصول صدیوں کی ارتقاء کا اور بہت سی ریاستوں کے اثرات کا نتیجہ ہیں۔

۱۲۶۔ ریاست کے نظرئیے

ریاست کی تعمیر مذکورہ بالا دونوں پہلوؤں کے علاوہ چند نظرئیے ایسے بھی ہیں جو ریاست کی اصل اور علت غائی عقلی نقطۂ نظر سے دریافت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نظریہ قائم کرنے والا پوچھتا ہے "ان چند لوگوں کو جن کے ہاتھ میں قوت ہے

کیا حق ہے کہ دوسروں کو اپنے نظم حکومت کے ذریعہ سے ایک خاص طرز عمل پر مجبور کریں" نظریۂ ریاست کا علمی ماحصل عمرانی کے لئے جو سیاسی عمل مرتب کرنا چاہتا ہے۔ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس سے یہ اندازہ کرنے میں مدد ملتی ہے کہ معاشرۂ انسانی کی اصلاح و ترقی میں ریاست بہ حیثیت ایک شعوری عامل کے کیا حیثیت رکھتی ہے اور حقیقی ارتقاء کے لحاظ سے اس کے اختیارات اور وظائف کی کیا حدود ہیں۔ نظریۂ ریاست، حق ریاست اور فن ریاست یعنی سیاست مدن دونوں کے نصب العین سے بحث کرتا ہے۔ اس کے ذریعہ سے اس تصرف کی حدود متعیّن ہو جاتی ہیں جو سیاسی عمل معاشرتی زندگی میں کرتا ہے۔ عمرانی نظریۂ ریاست کے مقابلے میں ہم چند اور اہم نظریے اختصار کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

۱۲۷ معاہدۂ حکومت

معاہدۂ حکومت کا نظریہ ان واقعی حالات پر مبنی ہے جو مدنی حکومت کے نشوونما کے مختلف زمانوں میں موجود تھے۔ اس کی رو سے حکمرانوں کے حقوق ایک معاہدے پر قائم ہیں جو ان میں اور جمہور میں ہوا تھا، جاگیرداری حکومت کی بناء اسی قسم کے معاہدے پر تھی، بلکہ اس سے پہلے اس کی مثالیں نظر آتی ہیں کہ حکمرانوں کو معاہدے کی رو سے اختیارات حاصل ہوئے۔ اس نظریے کو کبھی زیادہ اہمیت نہیں حاصل ہوئی مگر اس کے بنیادی اصول کو اور نظریوں نے اختیار کیا اور تکمیل کو پہنچایا۔ سچ پوچھئے تو یہ اصول انتخاب کے اظہار کی ایک ناقص شکل تھی اس کا ماحصل اس بات کا اعتراف تھا کہ حق حکومت اصل میں جمہور کو حاصل تھا اور انھوں نے ایک معاہدے کی رو سے یہ حق حکمرانوں کی طرف منتقل کر دیا۔

۱۲۸۔ معاہدۂ عمرانی

جتنی نزاع اور بحث "معاہدۂ عمرانی" کے نظریے پر ہوئی ہے شاید کسی نظریہ ریاست پر نہ ہوئی ہو گی اور جتنا اثر اس کا فلسفۂ سیاست پر پڑا ہے اور کسی چیز کا نہ پڑا ہوگا۔ اس نظریے کے سب سے بڑے حامی ہکر[1]۔ ہابس[2]۔ لاک[3] اور روسو[4] تھے۔

---

[1] Hooker. [2] Hobbs. [3] Locke. [4] Rosseau.

ہر ایک نے اس نظریئے پر مختلف پہلوؤں سے بحث کی یہاں تک کہ ارتقائے فکر کا یہ عمل روسو کے "معاہدۂ عمرانی" کی شکل میں تکمیل کو پہنچا۔ روسو نے اس مسئلے کو سب سے زیادہ باضابطہ طریقے سے پیش کیا۔ یہاں اس کا موقع نہیں ہے کہ اس نظریئے کے مختلف مدارج ارتقا پر نظر ڈالی جائے۔ ہمارے مقصد کے لئے یہ کافی ہے کہ اس کی جو تفسیر روسو نے کی ہے اس کا لب لباب بیان کردیں۔

یہ نظریہ اس فرضیے پر مبنی ہے کہ انسان قانونِ فطرت کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے اور ہر شخص آزاد تھا۔ باہمی اُنس کے جذبے اور صحبت و مجانست کی احتیاج نے انھیں سیاسی معاشروں میں مربوط کردیا تاکہ انفرادی نشوونما میں رکاوٹ نہ واقع ہو۔ فطری زندگی میں ہمیشہ انفرادی حقوق اور اقتدار پر تزاع ہوا کرتی تھی، جس کے دور کرنے کی صرف یہی صورت تھی کہ معاشرتی نظم قائم کرنے کی غرض سے افراد باہم معاہدہ کرلیں اور ہر شخص آزادیٔ عمل کے بعض حقوق سے دست بردار ہوجائے۔ اس "معاہدہ کا مقصد تھا" ایک ایسی ہیئت اجتماعی قائم کرنا جو معاشرے کی مجموعی قوت سے اپنے ہر رکن کے جان و مال کی حفاظت کرے اور جس میں ہر انسان باوجود دوسروں سے اتحاد عمل کرنے کے اصل میں اپنی ہی اطاعت کرے اور ویسا ہی آزاد رہے جیسا پہلے تھا۔" روسو اس معاہدے کا لبّ لباب ان الفاظ میں ظاہر کرتا ہے "ہم میں سے ہر شخص اپنی ذات اور اپنی ساری قوت کو ارادۂ اجتماعی کا مطیع اور پابند کردیتا ہے اور اس کے عوض میں کل جماعت کا ایک جزو سالم بن جاتا ہے۔" اس طرح انسان اپنی مرضی سے ایک ہیئت سیاسی میں شامل ہوجاتے ہیں اور فطری حکومت کی جگہ مدنی حکومت قائم ہوجاتی ہے۔ اس میں ہر شہری اپنی فطری آزادی کھو دیتا ہے لیکن معاہدے عمرانی کی رو سے اسے مدنی آزادی حاصل ہوجاتی ہے۔

روسو نے اس نظریئے کو جس صورت میں پیش کیا ہے اس میں بڑا نقص یہ ہے

کو ایک مکمل فطری زندگی فرض کر لی گئی ہے۔ سچ پوچھیے تو انسان کا فطری حق صرف ایک ہے جو بقائے زندگی کی جبلت پر مبنی ہے۔ حکومت کے فطری حقوق جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ انھیں انسان مدنی حقوق کے عوض جماعت کے حوالے کر دیتا ہے، کوئی چیز نہیں معاشرتی زندگی کی ابتداء میں ایسا کوئی معاہدہ نہیں ہوا جس کی رو سے ہر شخص نے اپنے حقوق ہیئتِ اجتماعی کے سپرد کئے ہوں۔ یہ بھی صحیح نہیں کہ انسان خلقی طور پر کچھ سیاسی حقوق رکھتا تھا یا فطرت نے اسے آزادی اور مساوات بخشی تھی۔ یہ سب مفروضات ایک خیالی فطری زندگی اور خیالی معاہدے کی تصویر کے نقش و نگار ہیں۔ البتہ اس نظریے کا یہ اصول بالکل بجا ہے اور اس کی تائید مدنی معاشرے کی تاریخی نشو و نما سے ہوتی ہے کہ سیاسی فرمانروائی جمہور کا حقِ لاینفک ہے اور حکومت کا اختیار حکمرانوں کو انھیں سے ملتا ہے اور پھر انھیں کی طرف عود کرتا ہے۔ معاشرتی تاریخ میں بعض مثالیں ایسی ملتی ہیں جن میں معاہدۂ عمرانی کے بعض پہلو موجود ہیں چنانچہ مے فلاور جہاز کے مسافروں کے معاہدے[1] میں اور ریاست ہائے متحدہ کی مغربی سرحد کی ملتوں اور ریاستوں کی تنظیم میں جہاں افرادِ حکومت اور دستور کی اطاعت کا حلف اٹھایا کرتے ہیں معاہدۂ عمرانی کا شائبہ نظر آتا ہے لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ریاست اس طرح کے معاہدات سے ہزارہا سال پہلے موجود تھی اور جو نظمِ حکومت اور قوانین اس میں رائج تھے وہ مدنی معاشرے کی ارتقا سے وجود میں آئے تھے نہ یہ کہ وہ کسی خاص معاہدے پر مبنی ہوں جو حکومت کی علتِ اولی قرار دیا جا سکے۔ معاہدۂ عمرانی کے نظریے کو ریاست کی علتِ غائی کی تلاش میں کوئی واقعی معاہدے اولی یا شہریت کے ایسے حقوق جو معاہدے پر مبنی ہوں نہیں مل سکتے۔ انسانوں کے اجتماع کے بہت سے معاشرتی اسباب ہیں اور نظم و حکومت کے بہت سے سرچشمے ہیں لیکن فرد کو صرف حقوق و مراعات حاصل ہوتی ہیں جو معاشرہ، جس کا وہ ایک رکن ہے، اسے دیتا ہے۔

---

[1] Mayflower compact. (مے فلاور جہاز میں سنہ ۱۶۲۰ء میں انگلستان سے تارکانِ وطن کی ایک جماعت روانہ ہوئی اور اس نے نیو انگلینڈ (امریکا) میں پہلی مستقل نوآبادی قائم کی۔ ان لوگوں نے جہاز ہی پر آپس میں اشتراکِ عمل کا معاہدہ کر لیا تھا۔

مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نظم اجتماعی اسی طرح قائم ہو سکتا ہے کہ ہر شخص ایک ضابطۂ عمل کی اطاعت کرے اور انفرادی آزادی کو جماعت کی فلاح و بہبود کے لئے قربان کرنے پر تیار رہے۔

۱۲۹۔ شارعون یا واضعانِ قوانین کے متعلق روایات

معاہدۂ عمرانی کے نظریئے سے کلیتہً مختلف یہ روایت ہے کہ قدیم واضعان قوانین نے نظم اجتماعی قائم کرنے کے لئے حکومت کے نظام ترتیب دے کر اور قوانین وضع کرکے ریاست کی بنیاد ڈالی۔ ریاست کے آغاز کی توجیہ کا بہت آسان طریقہ یہ فرض کر لینا تھا کہ لکرگس[1] یا سولن[2] یا نوما[3] یا الفریڈ[4] نے اپنی حکمتِ فائقہ سے ضابطۂ قانون مرتب کیا یا ریاست کی بنیاد ڈالی۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ان واضعانِ قوانین نے قوموں کی زندگی کے بالکل ابتدائی دور میں حکومت کے نظام اور ضابطے مدون کئے تھے لیکن اس سے بہت پہلے سے ہر معاشرے میں رسم و رواج، بادشاہوں کے احکام، اور عدل و ضبط کی بدولت نظم اجتماعی قائم ہو چکا تھا اور قدیم حکما نے ان اصولوں اور دستوروں کو جن پر پہلے سے عمل ہوتا ہے قانون کی صورت میں منضبط کر دیا۔ اگرچہ انھوں نے بعض مروجہ دستوروں میں تغیر تبدل بھی کیا لیکن ان کا اختراعی کارنامہ اصل میں قوانین کا انضباط اور ان کی تشریح تھی نہ یہ کہ انھوں نے پہلے ریاست کا وجود تسلیم کیا اور حکومت کے نئے طریقے جاری کئے۔

۱۳۰۔ ریاست کا خداساز ہونا

اس سے بھی زیادہ حقیقت سے دور یہ نظریہ ہے کہ حکومت اور قوانین کو خود خداوند تعالیٰ نے بنایا ہے اس کی رو سے واضعانِ قوانین، مدبر اور حکمران خدا کے

---

[1] Lycurgus. (یونان کا مشہور مقنن)

[2] Solon. (یونان کا مشہور مقنن)

[3] Numa (Pompilius) [روما کا اولوالعزم بادشاہ (۷۱۴ تا ۶۷۱ ق م)]

[4] Alfred. [الفریڈ اعظم شاہ انگلستان (۸۴۹ تا ۹۰۱ء)]

نائب یا اس کی طرف سے مامور سمجھے جاتے ہیں جن کا کام یہ ہے کہ خلقِ خدا کے درمیان نظمِ اجتماعی قائم کریں۔ اسی نظریئے کا نتیجہ تھا کہ فرانس کا لوئی خاندان[1] اور انگلستان کا اسٹوارٹ[2] خاندان مطلق العنان بن بیٹھا اور مقدس رومی سلطنت[3] کی بنا بھی اسی پر تھی۔ یہ سچ ہے کہ حکومت بھی اسی طرح خدا کی پیدا کی ہوئی ہے جس طرح درخت یا پتھر یا فطرت کی قوتیں یا کل معاشرہ مگر ریاست کو خصوصیت کے ساتھ امرِ الٰہی سے منسوب کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ ہم بھی ریاست کو مخلوقِ ایزدی سمجھتے ہیں اسی کے ساتھ ہمارا یہ مشاہدہ ہے کہ اس نے انسان کے ہاتھ سے اور اس کی ضرورتوں کے مطابق نشو و نما پائی۔ اس نظریئے سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ بادشاہ اپنی رعایا سے برتر طبقہ کا مخلوق ہے۔ اس خیال کی کچھ جھلک آج کل بھی پائی جاتی ہے مگر اب دنیا پر یہ حقیقت واضح ہوگئی ہے کہ بادشاہ یا حکومت کے اعلیٰ عامل کی اہمیت کا راز یہ ہے کہ وہ اپنی قوم یا نسل کا نمایندہ ہوتا ہے۔ قوم کے اتحاد کا دار و مدار اسی کی ذات پر ہے اور جمہور کی آواز اسی کے توسط سے بلند ہوتی ہے۔

ریاست کے خداساز ہونے کے نظریئے نے ان ملکوں میں نشو و نما پائی جہاں مذہب اور حکومت، کلیسا اور ریاست بالکل مخلوط ہوگئے تھے۔ قدیم استبدادیت، جس میں بادشاہ اپنا سلسلۂ نسب دیوتاؤں سے ملاتے تھے، عبرانی مذہبی سلطنت، جس میں خدائے یہود حقیقی فرمانروا سمجھا جاتا تھا، خصوصاً قرونِ وسطیٰ کی ریاست جس میں کلیسا مدنی حکومت کے اور ذاتِ ایزدی کے درمیان واسطہ ہونے کا مدعی تھا، خداساز ریاست کے نظریئے پر مبنی تھیں۔

انسان میں حکومت کی صلاحیت اس سعی کی بدولت پیدا ہوئی

---

[1] Louises.

[2] Stuarts.

[3] Holy Roman Empire.

جو اس نے نظم اجتماعی کے قائم کرنے میں صرف کی۔ تقدیر الٰہی کو حکومت کی تعمیر میں بلا واسطہ دخل اس سے زیادہ نہیں جیسا کہ دخانی انجن کے بنانے میں یا ریل کے انتظام میں۔ ایک لحاظ سے بے شک یہ خدا کی بنائی ہوئی چیز ہے اور اس کی کارسازی کا نمونہ ہے۔

۱۳۱۔ سیاستِ ملل کے ماہروں کا استدلال

نظریۂ ریاست کی نشو و نما میں جن فلسفیوں نے ریاست کی تاریخی ارتقاء پر نظر ڈالی ہے انھوں نے اس کی حقیقت کے سمجھنے میں بہت مدد دی ہے انھیں کے ہاتھوں سچے نظریۂ ریاست کی داغ بیل پڑی کیونکہ ان کے استدلال کی بنا نوع انسانی کے تجربے اور مشاہدے پر ہے کسی ایسے اصول پر نہیں جو تجربے کے ماوراء ہو۔ انھیں ریاست کی وجہ وجود ثابت کرنا مدِ نظر نہیں بلکہ وہ یہ تحقیق کرنا چاہتے ہیں کہ ریاست کی ماہیت کیا ہے اور اس کی نشو و نما کیونکر ہوئی۔

غالباً قدیم فلسفیوں میں ارسطو سے زیادہ حکیمانہ وقت نظر اور قابلیت سے ریاست کے مسئلے پر کسی نے بحث نہیں کی۔ اس کا پہلا اصول یہ ہے کہ انسان ایک مدنی الطبع حیوان ہے جس کی جبلت میں نظم حکومت داخل ہے۔ یہی صلاحیت ریاست اور حکومت کے وجود کی علت اولیٰ ہے اور اسے کامیابی کے ساتھ عملی جامہ پہنانا صحیح اور درست حکومت کا معیار ہے۔ ارسطو کا سیاسی نظریہ کامیاب ترین قوموں کی عملی سیاست کے مشاہدے پر مبنی تھا۔ وہ پہلا شخص تھا جس کی نظر حکومت اور نظم اجتماعی کی تاریخی نشو و نما پر پڑی۔ اس نے طرز ہائے حکومت کا جو دَور مسلسل دریافت کیا اس کے دلچسپ ہونے میں شبہ نہیں مگر اسے بالکل صحیح نہیں کہہ سکتے۔ اپنے مشاہدات کی تحلیل کی بناء پر اس کا یہ خیال ہے کہ سیاسی حکومت کی پہلی صورت لازمی طور پر شاہی ہے اس کے بعد قدرتی ترتیب کے لحاظ سے اشرافیہ یا عمائدی حکومت کی باری آتی ہے پھر عدیدیہ کی پھر عمومیہ یا جمہوریہ کی اور آخر میں حکومت انبوہ کی۔ جب یہ نوبت پہنچ جاتی ہے تو مستبد حکمراں پیدا ہوتا ہے اور نظم اجتماعی کو

دوبارہ قائم کرتا ہے۔ یہ تو صحیح نہیں کہ طرز حکومت کا تغیر ہمیشہ اسی دور کے مطابق ہوا ہے لیکن تاریخ میں اس کی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ حکومت کے تین طریقوں کو ارسطو جائز اور صحیح قرار دیتا ہے۔ شاہی، اشرافی (عائدی) اور عمومی حکومت۔ اور سب کو ناجائز سمجھتا ہے۔ مگر ارسطو جسے عمومی حکومت کہتا ہے وہ اصل میں چند مخصوص طبقوں کی حکومت ہے۔ عمومی حکومت کا جو مفہوم آجکل ہے اس سے ارسطو نے بحث نہیں کی ہے۔ البتہ اسکے یہاں (Polity) کا نام آیا ہے جس سے مراد وہ عمومی حکومت ہے جس میں سب طبقے شامل ہوں اور اس کا تصور جدید جمہوریت سے ملتا جلتا ہے۔ یہ حکومت جب پوری طرح قائم ہو جائیگی تو "دور مسلسل" کا نظریہ بیکار ہو جائے گا۔

ارسطو نے حقوق انسانی کا کلیہ قائم کیا مگر اسی کے ساتھ یہ ثابت کیا کہ فرد کی خدمت جماعت کی فلاح و بہبود کے واسطے سے ہونا چاہئے۔ اس کے انفرادی حقوق بڑی حد تک جماعت کے حقوق میں جذب ہو جاتے ہیں۔

عہد جدید کے علما میں بلنشلی[1] کے خیالات کا دائرۂ اثر جتنا وسیع ہے اور کسی کا نہیں۔ اس ماہر سیاسیات نے جدید ریاست کا ایک نظریہ پیش کیا ہے جس میں اس کی نشو و نما خاندانی زندگی سے دکھائی ہے۔ وہ ریاست کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے "یہ ایک معینہ محروسے کے اندر رہنے والے لوگوں کی جماعت ہے جس کی تشکیل حکومت و محکومیت کی بنیاد پر ہوئی ہے اور جس کے اتحاد کا مرکز ایک منظم، صاحب قوت اخلاقی شخصیہ ہے"۔ یا مختصر الفاظ میں "ریاست ایک خاص ملک کے قومی شخصیے کا نام ہے جس کی تنظیم سیاسی اصول پر ہوئی ہے"۔ وہ ریاست کو ایک زندہ جسم نامی قرار دیتا ہے کیونکہ "یہ روح اور جسم یعنی حیاتی قوتوں اور مادی عناصر کے اتحاد سے وجود میں آئی ہے"۔ اور اس میں ایسے اعضا موجود ہیں جو مخصوص وظائف اور مخصوص صلاحیتیں رکھتے ہیں تاکہ مختلف طریقوں سے کل جسم کی مختلف ضرورتوں کو پورا کریں"۔ اس کے نزدیک "یہ جسم نامی اندر سے باہر کی طرف پھیلتا ہے اور اسکی نشوونما کا دائرہ بہت

[1] Blunt Schli.

وسیع ہے"۔ اس[1] کے بعد وہ دکھاتا ہے کہ یہ جسم نامی کیونکر وجود میں آیا، اس کی نشو و نما کیونکر اور کن مختلف اسباب کے ماتحت ہوتی ہے، اور اپنے نتایج کی تصدیق ان واقعات سے کرتا ہے جو نشو و نما کے دوران میں پیش آئے ہیں۔ اس کے معنی ہیں کہ وہ ریاست کی ارتقاء کا قائل ہے۔ بلنٹسلی اس پر زور دیتا ہے کہ ایک معینہ محروسہ ریاست کی تاسیس کا لازمی عنصر ہے۔ بخلاف اسکے پریسیڈنٹ ووڈرو ولسن[2] اپنی کتاب "ریاست" میں کہتا ہے "قبائلی ریاست کا وجود اس صورت میں بھی ممکن ہے کہ لوگوں کا کوئی معینہ مسکن نہ ہو"۔ فرنیک قوم میں کسی معینہ محروسے میں سکونت پذیر ہونے سے پہلے ریاست کے تمام ضروری عناصر موجود تھے۔ بہت سے سامی قبیلوں میں وہ کل قوتیں اور سرگرمیاں موجود ہیں جو ریاست میں ہونا چاہئیں۔ حالانکہ وہ کم و بیش خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ مگر یہ سب مثالیں نسلی جماعتوں کی ہیں نہ کہ عمومی معاشرے کی۔ جدید زندگی میں جو تصور ریاست کا ہمارے ذہن میں ہے اس میں یقیناً یہ بات شامل ہے کہ سیاسی حیثیت سے منظم جماعت ایک معین محروسے میں رہتی ہو۔

۱۳۲۔ ارتقائی نظریہ

عمرانیات کا ماہر ریاست کو اس نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے کہ یہ ایک تدریجی ارتقاء کا نتیجہ ہے جس کی بنا لوگوں کو ہم آہنگی سے مل جل کر رہنے کی کوشش ہے۔ تاریخی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ریاست کی بنیاد نہ تو امر الٰہی سے پڑی نہ انسان کے شعوری تدبر سے اور نہ کسی جماعت نے سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا کہ انصاف اور مساوات کے ساتھ متحدہ زندگی بسر کرے، بلکہ یہ محض افراد کی اس غیر شعوری سعی سے وجود میں آئی کہ اجتماعی زندگی کے ذریعے اپنی باہمی نزاعوں کو دور کریں اور اپنی فلاح و بہبود کا سامان کریں۔ ابتداء میں کسی کو ریاست کی تاسیس مدنظر نہیں تھی۔ لوگ اپنی دوسری خواہشوں کو پورا کرنا

---

[2] Woodrow Wilson: The State. [1] Blunt Schli.

چاہتے تھے اور اِس ضمن میں رفتہ رفتہ یہ چیز خود بخود پیدا ہو گئی۔ اس کی نشو و نما آہستہ آہستہ فطری ترتیب کے ساتھ ہوئی۔ ابتداءً خاندان سے ہوئی یہ پھیل کر سبط یا قبیلہ بنا، اور آخر میں جب معاشرے نے رسم و رواج سے قانون کی طرف اور خاندانی تعلقات سے سیاسی زندگی کی طرف قدم بڑھایا تو قبیلے نے ریاست کی شکل اختیار کر لی۔ ریاست کا صحیح نظریہ اصل میں نظریہ نہیں بلکہ واقعہ ہے۔ ہر نظریے میں جو فلسفیوں نے پیش کیا ہے تھوڑی بہت اصلیت ضرور ہے لیکن اس سے زیادہ سچی تفسیر اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ ریاست قانون اور نظم اجتماعی کی تدریجی نشو و نما کا نام ہے جو معاشرے کی فطری ارتقاء کا نتیجہ ہے۔ لیکن اس کے ساتھ اِس شعوری انتخاب کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے جس سے معاشرے نے طرز حکومت کے اختیار کرنے میں اور دانشمندانہ قوانین کے ذریعے لوگوں کے حقوق کا تحفظ اور فرائض کا تعین کرنے میں ہمیشہ کام لیا ہے۔ نفس اجتماعی کا یہ شعوری انتخاب معاشرے کی غیر شعوری نشو و نما کے بعد واقع ہوا۔ نظم اجتماعی کے قائم کرنے میں قانون کے ضابطے مدوّن ہو جانے سے جو مدد ملی اسے بھی نہیں بھولنا چاہیے۔ حکومت کے بہترین طریقوں اور انسانوں کے نظم و ضبط کے بہترین قاعدوں کا قلمبند ہو جانا ریاست کی تاسیس کا بہت بڑا محرک ثابت ہوا۔ پہلے ضابطۂ قانون کے شائع ہونے کا نظم اجتماعی پر اتنا بڑا اثر ہوا ہو گا کہ کوئی اس کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ مگر پھر بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ریاست کو واضعان قوانین نے بنایا۔

۱۲۳۔ حکومت کے لازمی وظائف

یہ سچ ہے کہ ریاستوں کی نشو و نما کے ساتھ ان کے اختیارات اور وظائف بڑھتے رہتے ہیں لیکن چند خصوصیتیں اور وظائف ایسے ہیں جن کے بغیر کوئی جماعت ریاست نہیں کہلا سکتی۔ ریاست کے ان لازمی وظائف کی فہرست حسبِ ذیل ہے جو ایک حد تک مصنف کے محترم استاد ڈاکٹر ولسن کے خاکے کے مطابق ہے:۔

۱۔ اجتماعی نظم۔ چاہے سب لوگ کتنے ہی نیک نیت ہوں اور آپس کے برتاؤ میں "اصول زرین" کو مدنظر رکھتے ہوں پھر بھی کسی ایسی قوت کا ہونا ضروری ہے جو ان کے افعال میں نظم و ترتیب قایم کرے اور قایم رکھے ورنہ بڑی ابتری پڑ جائے گی۔ مکمل نراجیوں کا یہ خیال غلط ہے کہ اگر ہر شخص اپنی خوشی سے صحیح طرز عمل اختیار کرے تو پھر حکومت کی کوئی ضرورت نہ رہے۔ ممکن ہے کہ معاشرے کا حقیقی نظم و ضبط جبر پر مبنی نہ ہو لیکن پھر بھی حکومت کی نگرانی لازمی ہے تاکہ نظام اجتماعی میں ہر شخص کی مناسب جگہ معین کرنے کے لئے ایک ایسی رہنما قوت موجود رہے جسے سب تسلیم کرتے ہوں۔

۲۔ جان اور مال کی حفاظت تشدد، چوری اور قزاقی سے۔ اعلیٰ درجے کے ترقی یافتہ معاشروں میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو اپنے عمل میں دوسرے کے جان و مال کا احترام مدنظر نہیں رکھتے۔ وہ بے تامل دوسروں کی چیز پر قابض ہو جاتے ہیں اور جب جی چاہتا ہے انھیں جسمانی ضرر پہنچا دیتے ہیں۔ اسی لئے ہر منظم جماعت میں اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ یہ لوگ ان حرکتوں سے باز رکھے جائیں۔ ایسا نہ ہو تو بقاءِ انفرادی کے قانون کا دور دورہ ہو جائے۔ یہ جان و مال کا تحفظ حکومت کے بنیادی فرائض میں سے ہے کیونکہ لوگوں کی معاشی اور معاشرتی زندگی کا اسی پر دار و مدار ہے۔ اگر حکومت کا یہ وظیفہ پوری طرح ادا نہ ہو تو اور سب وظائف مل کر بھی انصاف کے قائم رکھنے اور جماعت کی فلاح و بہبود کی سعی میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

۳۔ شوہر اور زوجہ، والدین اور اولاد کے قانونی تعلقات کا تعین۔ اگرچہ نشو و نما کی ترتیب میں خاندان ریاست سے مقدم تھا لیکن اب اس نے اپنے افراد کے حقوق کا تعین اور نظم ایک حد تک ریاست کے سپرد کر دیا ہے۔ ازدواجی تعلق بظاہر انفرادی معاملہ ہے لیکن اپنے نتائج کے لحاظ سے یہ ایک عام اجتماعی مسئلہ بن جاتا ہے۔ جہاں تک ان تعلقات کا اثر کل نظام اجتماعی پر پڑتا ہے اس حد تک ان کا نظم و ضبط حکومت کے ہاتھ

میں ہے۔ اسی طرح والدین اور اولاد کا تعلق قدرتی طور پر ایک ذاتی چیز ہے لیکن اس کے اثرات ہیئت اجتماعی پر اس قدر گہرے پڑتے ہیں کہ اس پر حکومت کی نگرانی لازمی ہے۔ گھر کے اندرونی معاملات میں حکومت کوئی دخل نہیں دیتی لیکن جس حد تک افراد کے حقوق اس کے متقاضی ہوں گھر میں نظم اجتماعی قائم رکھنے کے لیے قوانین بنانا اور ان پر عمل کرنا ضروری ہے۔ اکثر لوگوں کی جہالت، بعض کی خطائے اجتہادی اور بعض کی شرارت کی بنا پر یہ انتظام کرنا پڑتا ہے کہ خاندانی زندگی افراد کے ساتھ بے انصافی یا بدسلوکی کا ذریعہ نہ بنائی جائے، ورنہ خوف ہے کہ خاندان کی بدنظمی سے سارا معاشرہ برباد ہو جائیگا کیونکہ خاندان ہی اجتماعی زندگی کا بنیادی واحدہ ہے۔

۴۔ املاک کے قبضے، انتقال اور مبادلے کا انتظام۔ مال اور جائداد کے انتظام کی یہ صورت بھی ذہن میں آسکتی ہے کہ باضابطہ حق ملکیت افراد کو حاصل نہ ہو بلکہ کل جماعت کو ہو اور بعض معاشروں میں یہ طریقہ ایک حد تک رائج بھی تھا۔ اشتمالی اسی کے قائل ہیں اور نراجی بھی انفرادی حق ملکیت کے مخالف ہیں۔ پرودوںؔ[1] جو عہد جدید کے نراجیوں کا پیشوا تھا کہتا ہے کہ "ملکیت قزاقی ہے" اور مال و جائداد کے مالک قزاق ہیں کیونکہ انھوں نے مشترکہ املاک کو چھین کر ذاتی ملک بنا لیا ہے۔ اگر کل املاک پر جماعت کا قبضہ ہوتا تو حکومت کو اس کے استعمال کی نگرانی کرنی پڑتی اور اس کی ماہیت اور نوعیت کے بدلنے کے لحاظ سے ہمیشہ نئے قوانین بنانے پڑتے تا کہ ابتری اور ظلم نہ ہونے پائے لیکن موجودہ معاشرتی زندگی کی بنیاد انفرادی ملکیت پر ہے۔ یہ صورت حال معاشرے کی عملی ضروریات سے پیدا ہوئی ہے اور اس کے تعین اور تحفظ کے لیے قانون نے پورا اہتمام کیا ہے۔ خواہ یہ صحیح ہو کہ املاک کے حاصل کرنے میں جماعت کے کل افراد کی کوشش کو دخل ہے مگر ہر شخص کو اپنے حصے پر قبضے اور ملکیت کا حق دے دیا گیا ہے اور یہ ریاست کا فرض ہے کہ اس

[1] Proudhon

حق کا تحفظ کرے۔ ہر شخص مجاز ہے کہ اپنی املاک کو جس طرح چاہے استعمال کرے لیکن اس کے مبادلے یا انتقال کی نگرانی حکومت کے دائرۂ اختیار میں آجاتی ہے۔

۵۔ قرضے یا جرم کی ذمہ داری کا تعین۔ یہ پانچواں وظیفہ چوتھے وظیفے کا صریحی نتیجہ ہے۔ اگر ریاست اس میں دخل نہ دیتی تو لوگ قرضے کر اس کے ادا کرنے سے انکار کر دیا کرتے۔ بغیر ریاست کی نگرانی کے کاروبار میں باہمی اعتماد اس قدر محدود ہوتا کہ جماعت کی تجارت برباد ہوجاتی جس کا جی چاہتا لوگوں کا مال چھین لیا کرتا۔ اسی طرح چونکہ جرم سے قانون کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ اس لیے افراد سے اس کا مواخذہ کرنا ضروری ہے۔ ورنہ نظم اجتماعی قائم نہیں رہ سکتا۔

۶۔ افراد کے معاہدۂ باہمی کے حقوق کا تعین۔ یہاں ہمیں پھر اس کی مثال نظر آتی ہے کہ حکومت افراد کو ان کی باہمی ذمہ داریوں کے پورا کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ اس کے بغیر منظم معاشرے کا وجود ہی ناممکن ہے یوں تو آج کل کاروبار کے استحکام کا دارومدار اس پر ہے کہ افراد خود ہی آپس کے معاملات میں دیانت داری برتیں لیکن چونکہ ہمیں غیر ذمہ دار لوگوں کو اپنے معاہدوں کے توڑنے کا موقع ملتا ہے اس لئے یہ بہت ضروری ہے کہ حکومت مناسب قوانین کے ذریعے سے اس کا ذمہ لے کہ لوگوں کو معاہدوں کی پابندی پر مجبور کرے گی۔ پھر یہ بھی ممکن ہے کہ معاہدوں کے مفہوم اور ان کو پورا کرنے کے طریقے کے متعلق اختلاف رائے ہو اور اس سے ابتری پیدا ہو۔ اس لئے ان معاملات کی عام نگرانی بہت ضروری ہے۔ اور اس فرض کو صرف ریاست ہی انجام دے سکتی ہے۔

۷۔ جرم کی تعریف اور سزا کا تعین۔ اگر ریاست کی طرف سے ضابطہ یا قانون نہ بنایا جائے تو بھی رسم ورواج کی بدولت معاشرے میں تھوڑا بہت نظم قائم رہے گا۔ بعض افعال جماعت کی بہبود کے منافی سمجھے

جائیں گے۔ قدرتی طور پر ایک مجموعی رائے تشکیل پا جائے گی جو جائز اور ناجائز افعال میں تفریق کرے گی لیکن موجودہ صورت میں جرم کا تعین کرنا اور اس کی سزا دینا قانون کا فرض ہے۔ ابتدا میں جرم فرد کے خلاف سمجھا جاتا تھا اور اس کا کام تھا کہ اپنے طور پر مجرم سے نبٹ لے۔ مگر آگے چل کر نہ صرف فرد کا بلکہ کل جماعت کا تحفظ ریاست کا فرض قرار دے دیا گیا۔ اس لئے اب جرم معاشرے کے خلاف سمجھا جاتا ہے اور اس کا تعین کرنا اور اس کی سزا دینا حکومت کا کام ہے۔

۸۔ دیوانی کے مقدمات کی داد رسی۔ ہر جماعت میں شخصی حقوق اور ملکیت کے حقوق کے بارے میں تنازع ہونا یقینی ہے۔ ان جھگڑوں کا فیصلہ کسی بے تعلق فریق کو کرنا چاہئے۔ ایسی قوت جو انفرادی اغراض سے الگ ہو کر کام کر سکتی ہے صرف ریاست ہی ہے اس لئے قدرتی طور پر فریقین کے درمیان حکم بنتی ہے اور داد رسی کرتی ہے۔ اس داد رسی کے بغیر اجتماعی نظم یا عدل کا قائم رکھنا ناممکن ہے۔

۹۔ شہریوں کے سیاسی حقوق و فرائض اور ان کے باہمی تعلقات کا تعیّن۔ شہری کو جو حصہ حکومت میں ملتا ہے وہ حکومت کی نوعیت پر موقوف ہے لیکن ہر ریاست دو عناصر سے مرکب ہوتی ہے حاکم اور محکوم۔ فرمانروائی ریاست کا سب سے برتر اختیار ہے۔ خود اپنے ارادے سے ریاست اس اختیار کو برتتی ہے اور اس کا مظہر بادشاہ یا پارلیمنٹ یا دستورِ اساسی ہوتا ہے۔ یہی ریاست کا ارادۂ اجتماعی جو فرمانروائی کا حامل ہے۔ شہریوں کے سیاسی حقوق و فرائض معین کرتا ہے۔ جمہوری طرزِ حکومت، جو امریکہ میں رائج ہے، اس اصول پر مبنی ہے کہ جمہور اپنے نمائندوں کے توسط سے اپنے اوپر آپ حکومت کرتے ہیں۔ یہاں فرماں روائی کا حامل بالفعل دستورِ اساسی ہے جسے جمہور نے بنایا ہے، یعنی افراد کے حقوق و فرائض کا تعین، دستورِ اساسی، قوانین اور حکومت مجازہ کے ذریعے سے ہوتا ہے۔ حکومت کا فرض ہے کہ ایسے واضح قوانین و ضوابط بنائے جن کی رو سے رائے دہندگی کا حق، عہدے پانے کا حق، محصول ادا کرنے

کا فرض، ملک کی حفاظت کے لیئے لڑنے کا فرض اور عہدہ داروں کے سیاسی فرائض اور پابندیاں معین ہو جائیں۔

۱۰۔ اپنا تحفظ اور دول خارجہ سے تعلقات قائم رکھنا۔ ہر ریاست دوسری ریاستوں کے مقابلے میں علحدہ اور مستقل ہستی رکھتی ہے اور اس کا یہ استقلال قائم رہنا ضروری ہے۔ اس لیئے ریاست کو دول خارجہ سے تعلق کا اختیار ہونا چاہیے۔ اس کا کام ہے کہ قوم کو بیرونی خطروں سے یا دوسری ریاستوں کے حملے سے محفوظ رکھے اور دول خارجہ کے مقابلے میں اپنے اغراض کی حمایت کرے۔ اس کا فرض ہے کہ جب بین الاقوامی امور سے واسطہ پڑے تو اپنے حقوق اور اپنے شہریوں کے جان و مال کی حفاظت کرے۔

ریاست کا جو سب سے محدود تصوّر ہو سکتا ہے اس میں بھی یہ ضروری ہے کہ حکومت کو کم سے کم مذکورۂ بالا اختیارات حاصل ہوں تا کہ وہ اپنی ہستی کو قائم رکھ سکے اور اپنے کل ضروری وظائف پورے کر سکے جن وظائف کی تفصیل ہم نے کی ہے ان میں سے اگر ایک بھی ترک کر دیا جائے تو ریاست بے دست و پا ہو کر رہ جائے گی۔ ہر ریاست کسی نہ کسی صورت میں ان وظائف کو ادا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

۱۳۴۔ حکومت کے اختیاری وظائف

مندرجۂ بالا فہرست میں وہ کم سے کم وظائف گنائے گئے ہیں جو ریاست کے لیئے ناگزیر ہیں۔ ورنہ یوں اس کے عمل کی کوئی حد مقرر نہیں کی جا سکتی بشرطیکہ وہ جمہور کے اغراض و مقاصد کے لیئے مفید ہو۔ اسی لیئے مختلف قوموں میں اُن کاموں کی تعداد مختلف ہے جو ریاست فلاحِ عامہ کے لیئے انجام دیتی ہے۔ ریاست کے بہت سے اختیاری وظائف ہیں جنھیں کم سے کم چند ریاستوں نے اپنے ذمے لے رکھا ہے۔ ان میں سے بعض کی فہرست ذیل میں دی جاتی ہے

ا۔ تجارت اور صنعت و حرفت کی نگرانی

عہد جدید کی اکثر حکومتیں اس کام کو ریاست کی فلاح و بہبود کے لیے ناگزیر پاتی ہیں۔ سچ پوچھیے تو ہر قوم میں کسی نہ کسی حد تک تجارت اور کاروبار کے نظم و ضبط میں ریاست کی مداخلت ہوتی ہے۔ حکومت کو ضرورت پڑتی ہے کہ زر کے سکے بنائے، اوزان اور پیمانوں کے معیار مقرر کرے اور بعض چیزوں کی تجارت پر لیسنس کی پابندی عاید کرے۔ اس سے آگے بڑھیے تو حکومتیں جہاز رانی اور نقل و حمل کی نگرانی کرتی ہیں اور صنعت و تجارت کے نظم و ضبط کے لئے محصول عاید کرتی ہیں آج کل اس کام کا دائرہ بڑھتا جاتا ہے۔ اس معاملے میں ریاست کے عمل پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جاسکتی۔ سوائے اس کے کہ عقل سلیم سے کام لے اور اپنے اغراض و مقاصد اور اپنی قوم کی فلاح و بہبود کو ملحوظ رکھے۔ تاریخ عالم کے مختلف زمانوں میں کبھی ریاستوں نے صنعت کے نظم و ضبط میں ضرورت سے زیادہ مداخلت بھی کی ہے اور کبھی ضرورت سے کم بھی۔ بیجا مداخلت کی مثال یہ ہے کہ تجارتی محصول اس طرح عائد کیا جائے کہ ایک صنعت کو ترقی ہو مگر دوسری صنعتوں کو نقصان پہنچ جائے یا قوم کی بیرونی تجارت گھٹ جانے سے خود اس کا نقصان ہو۔ اس طرح کے امکانات اس پر دلالت کرتے ہیں کہ تجارت کے نظم و ضبط کے قوانین بنانے میں نہایت احتیاط سے کام لینا چاہیے۔

۲۔ مزدوری کا نظم و ضبط۔ عہد جدید کے کل ریاستوں نے کم و بیش مزدوری کے نظم و ضبط کی کوشش کی ہے۔ خواہ غلامونکی مزدوری ہو یا آزاد مزدوروں کی دونوں صورتوں میں ریاست کو ایسے قوانین بنانے کی ضرورت پڑتی ہے جن کی رو سے آقا اور غلام یا آجر اور اجیر کے تعلقات واضح ہو جائیں اور مزدوروں کے حقوق معین ہو جائیں۔ موجودہ صنعتی دور میں حکومت کا یہ وظیفہ بہت وسیع ہو گیا ہے اگر ان قوانین کو دیکھا جائے جو اتحاد امریکہ کی مختلف ریاستوں نے حال میں بنائے ہیں تو یہ نظر آئے گا کہ بہت سے قوانین مزدوری نظم و ضبط کیلئے بنائے گئے ہیں۔ بلکہ پچھلے بیس سال میں زیادہ تر قوانین صنعتی زندگی کے متعلق بنے ہیں جن میں مزدوری بھی شامل ہے۔ سیاسی حقوق کے خاص خاص مسائل تو بہت دن پہلے طے ہو چکے ہیں۔ لیکن ترقی پذیر صنعتی زندگی کے حقوق و فرائض کا تعین وقتاً فوقتاً موجودہ حالات

کے لحاظ سے ہوتا رہنا ضروری ہے۔

۳۔ صنعت و حرفت کا انتظام ریاست کی طرف سے۔ اِس عنوان کے ماتحت ریاست کے بہت سے مختلف النوع کام آجاتے ہیں۔ شلاً سڑکیں بنانا، ریل یا نہر کی ملکیت اور انتظام، بندرگاہوں اور گودیوں کی تعمیر، زمین کی ترقی آب پاشی یا بدررَوی آب کے ذریعے سے، اور دریاؤں کی ریت نکال کر انھیں کشتیوں کی آمد و رفت کے قابل بنانا، جنگلوں کی حفاظت اور دریاؤں میں مچھلیاں پالنا بھی اِس فہرست میں شامل ہے۔

اِسی عنوان کے تحت میں نظام خبر رسانی بھی ہے جو سڑکوں کے اِنتظام سے کسی قدر مختلف ہے۔ یہ ڈاک، تار اور ٹیلیفون پر مشتمل ہے۔ حکومت کو حق ہے کہ انکی ملکیت اور نگرانی اپنے ہاتھ میں رکھے۔ ڈاک کا انتظام اکثر حکومتیں خود ہی کرتی ہیں اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ تار اور ٹیلیفون بھی حکومت کی ملکیت اور انتظام میں نہ ہو۔

تیسرا کام ان چیزوں کی ملکیت اور تقسیم ہے جن کا استعمال عام ہے چنانچہ بعض بلدیوں نے یہ اہم کام کیا ہے کہ پانی، گیس اور بجلی کو سرکاری انتظام میں رکھا ہے۔

۴۔ حفظانِ صحت اور پیشوں کا نظم و ضبط اصولِ صحت کے مطابق۔ یہ کام جماعت کی معاشرتی بہبود کے لئے ضروری ہے اور حکومت کو حق ہے کہ اسے خود انجام دے کیونکہ جماعت اگر تندرست ہو تو اس کی محنت کی قوت بڑھ جاتی ہے، جرائم میں اور مفلسی میں کمی ہو جاتی ہے اور مرفہ الحالی اور ریاست کو نشو و نما ہوتی ہے، افراد اپنے ذاتی اغراض کے لئے تنگ نظری سے حفظانِ صحت کی طرف سے غفلت کرتے ہیں۔ جس سے بیماریاں پھیلنے کا اندیشہ رہتا ہے، اس لئے اِس معاملہ میں حکومت کا مداخلت کرنا ضروری ہے۔ یہ بات بالکل سچ ہے کہ "صحت عامہ دولت عامہ ہے" اور افراد کی آرام و آسایش سے نہ صرف دولت میں اضافہ ہوتا ہے، بلکہ یہ جماعت کی عام مرفہ الحالی کی ناگزیر شرط ہے۔

۵۔ تعلیم اکثر ریاستوں کو تعلیم عامہ میں بہت کچھ دخل ہے وہ یا تو امداد و مراعات کے ذریعہ مدارس کی ہمت افزائی کرتی ہیں یا اس کی ترویج

اور انتظام خود کرتی ہیں۔ یہ بات عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے کہ آزاد ملکوں میں جہاں جمہور حکومت میں شریک ہوتے ہیں تعلیم عمومی ہونا چاہئے اس کی صورت یہی ہے کہ ریاست خود مدرسوں کی کفیل ہو امریکہ میں ہم نے بہت سی باتوں میں ریاست کو فرد کے مقاصد کا پابند رکھا ہے اس معاملہ میں بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ ریاست فرد کو خود اس کے فائدے کے لئے تعلیم دیتی ہے۔ لیکن اصل میں تعلیم کی مصلحت اس سے زیادہ گہری ہے۔ یہ وہ طریقہ ہے جو ریاست جمہور کی حفاظت اور بہبود کے لئے استعمال کرتی ہے اور جس کے ذریعے سے وہ ان کو بہتر شہری بناتی ہے اور مختلف پیشوں اور شعبہائے زندگی کے لئے بہتر طریقہ پر تیار کرتی ہے، تاکہ خود ریاست قائم رہ سکے۔ ایسی ریاست ہونا ممکن ہے جو تعلیم عامہ کا انتظام نہ کرتی ہو لیکن آج کل کی اعلیٰ درجے کی ریاستوں کے لئے یہ ایک ناگزیر فرض ہوتا جاتا ہے۔

۶۔ مفلسوں اور معذوروں کی خبر گیری۔ اس وظیفے کو ریاستیں مختلف حد تک ادا کرتی رہی ہیں لیکن یہ کبھی ان کی بقا کے لئے ضروری نہیں سمجھا گیا۔ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ مفلس اور معذور اپنے حال پر یا اشخاص یا غیر سرکاری انجمنوں کے رحم پر چھوڑ دئیے گئے۔ ریاست کی طرف سے محتاجوں کی خبر گیری کی نمایاں مثال انگلستان میں نظر آتی ہے جہاں مشہور "قوانین مفلساں" پر عملدرآمد ہوتا ہے۔ انگلستان کی حکومت یہ چاہتی تھی کہ ہر شخص کو جسے مدد کی ضرورت ہو مدد دے، لیکن بد انتظامی کے سبب سے وہ خرابی جسے دور کرنا منظور تھا اور بڑھ گئی مفلسوں پر اس قدر ٹیکس لگائے گئے کہ وہ محتاج ہو گئے۔ شاید ریاستہائے متحدہ کے لوگوں سے زیادہ فیاضی سے کوئی قوم مفلسوں اور محتاجوں کی مدد نہ کرتی ہو گی۔ ایک طرف تو ہزارہا غیر سرکاری ادارے ہر طبقہ کے قابل امداد لوگوں کی مدد کے لئے موجود ہیں اور دوسری طرف سب ریاستوں نے غریبوں، اپاہجوں اور مجرموں کی فلاح و بہبود کا انتظام کر رکھا ہے۔ بلکہ اس عہد میں یہ بھی ضروری سمجھا جاتا ہے کہ خیرات کے انتظام یا خیراتی انجمنوں کی نگرانی کے لئے ایک مستقل مجلس ہو معذوروں کا یہ حق تو تسلیم نہیں کیا جاتا ہے کہ وہ ریاست سے امداد کا مطالبہ

کریں۔ مگر ریاست کا فرض سمجھا جاتا ہے کہ جب اسے ان لوگوں کی احتیاج کا علم ہو تو ان کی مدد کرے۔

۷۔ بعض اقسام کی غذاؤں کی تیاری، فروخت اور استعمال کے قوانین۔ ان قوانین کو بعض اوقات مبہم طور پر "قوانین مصارف" کہتے ہیں لیکن موضوع کے لحاظ سے ان کا یہ نام مناسب نہیں سوائے اس صورت کے جب یہ کسی چیز کے صرف کی ممانعت کرتے ہوں۔ شراب کی خرید و فروخت کے ضابطے کا، جس کی روسے الکوہلی مشروبات کا بنانا اور بیچنا ممنوع ہے۔ یہ مقصد ہے کہ صرف اشیاء پر پابندی عائد کرے اور لوگوں کی اخلاقی اور معاشرتی حالت کو سدھارے لیکن یہ بلا واسطہ "قانونِ مصارف" نہیں کہا جا سکتا۔ اسی طرح ماکولات کے معائنہ میں بھی، جو پاک صاف غذا مہیا کرنے کے لئے کیا جاتا ہے مصارف کو محدود کرنا مدنظر نہیں ریاست کا یہ فعل دانشمندی پر مبنی ہے کہ اس قسم کے امور میں جن کا تعلق اس کے شہریوں کی صحت اور فلاح سے ہے مداخلت کرے۔

یہ ہیں چند اختیاری وظائف جو حکومتوں نے کسی نہ کسی صورت میں اپنے ذمے لے رکھے ہیں، لیکن ان میں وہ سب باتیں شامل نہیں ہیں جو اس عنوان کے تحت آسکتی ہیں۔ پھر بھی ان سے حکومت کے فرائض کا تصور اور اس کے نظم اور طرزِ عمل کی مختلف صورتیں پوری طرح واضح ہو جاتی ہیں۔

۱۳۵۔ حکومت کے اختیارات کی حدود

مذکورۂ بالا اختیاری وظائف کی فہرست سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کسی قانون کے ذریعے سے یہ بات معین نہیں کی جا سکتی کہ ریاست کو کن چیزوں میں مداخلت کرنا چاہیئے اور کن چیزوں کو افراد کے ذاتی فعل پر چھوڑ دینا چاہیئے اس کا تعین جمہور کے ارادۂ اجتماعی کا کام ہے جو حالات کے تغیر اور ریاست کے نشو و نما کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ ایسی صورت میں یہ کہنا جائز ہے کہ ریاست ہر کام جو جماعت کی فلاح میں ممد ہو کر سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ الفاظ بہت وسیع ہیں۔ ان کی روسے ریاست کو فلاحِ عامہ کی خاطر بہت اختیار ہوتا ہے، لیکن انفرادی حقوق

کے تحفظ کی ضرورت بھی ملحوظ رہتی ہے، مثلاً ریاستہائے متحدہ میں ریل ٹیلیفون وغیرہ کی ملکیت اور انتظام افراد کے یا غیر سرکاری کمپنیوں کے ہاتھ میں ہے۔ اگر جمہور کے مفاد کے لحاظ سے یہ ضروری سمجھا جائیگا کہ ان چیزوں کے مالک اور منتظم خود ریاست بن جائے تو انھیں ریاست کے لازمی وظائف میں داخل کر لینے پر کوئی اصولی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ اِس زمانے کے عام رجحان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ریاست کے اختیارات بڑھتے جائیں اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ سلسلہ برابر جاری رہے گا، یہاں تک کہ ریاست تمام املاک اور صنعت و حرفت پر قابض اور متصرف ہو جائے، یعنی اشتراکی ریاست بن جائے، مگر یہ کوئی ضروری بات نہیں کہ ریاست کے اختیارات کی توسیع کا یہ نتیجہ ہو، اگر اب تک ریاست اپنے جائز وظائف سے کام لینے میں قاصر رہی ہے۔ یا ایسی صورت حال پیدا ہو گئی ہے کہ اس کے اختیارات میں اضافے کی ضرورت ہے تو لوگوں کو جھٹ پٹ اس نتیجے پر پہنچ جانے کا کوئی حق نہیں کہ کل صنعت و حرفت کا مالک اور منتظم اسی کو بنا دینا چاہیے۔

۱۳۶- ریاست عمرانی نقطۂ نظر سے

عمرانی کو ریاست کے اختیارات سے اس بناء پر سروکار ہے کہ معاشرتی اصلاح کی کوئی تجویز پیش کرنے سے پہلے اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ حکومت کن چیزوں کو عمل میں لا سکتی ہے اور کن کو نہیں لا سکتی بعض مصلح یہ سمجھتے ہیں کہ صرف قانون بنانے کی ہے۔ ادھر قانون بنا اور ادھر اصلاح ہو گئی۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ہزاروں قانون ایسے بنائے گئے جو اپنے حامیوں کا مقصد پورا کرانے میں ناکامیاب رہے بلکہ بعض تو ابتدا ہی سے بیکار ثابت ہوئے یہ مسلم ہے کہ معاشرے کی نشو و نما میں بعض طبعی قوانین ارتقا کار فرما ہیں اس بات کا فیصلہ کرنے میں کہ حکومت مجوزہ اصلاح کو کس حد تک عمل میں لا سکتی ہے ان قوانین کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ریاست یا حکومت کی سعی اسی حد تک کامیاب ہوئی ہے۔ جہاں تک وہ معاشرتی ارتقاء کے طبعی قوانین پر مبنی تھی۔ معاشرتی

تغیرات کی بلاواسطہ عوامل دو ہیں۔ ایک نفس اجتماعی ہے جس کا عمل شعوری ہے اور ہیئت سیاسی میں انقلاب پیدا کر سکتا ہے۔ دوسرا نفس انفرادی ہے جس کا ارادہ فرد کے آیندہ عمل کو معین کرتا ہے۔ اگر ان دونوں کی کوئی تجویز حیاتی قانون ارتقاء کے منافی ہوگی تو دونوں ناکام رہیں گے۔

باب ہشتم

دولت کی پیدائش اور صرف عمرانیات کے نقطۂ نظر سے

افراد کی باہمی وابستگی جس قدر واضح طور پر پیدائش دولت میں ظاہر ہوتی ہے۔ غالباً زندگی کے کسی شعبے میں نہیں ہوتی۔ نفس امر کے لحاظ سے پیدائش دولت کا تعلق معاشیات سے ہے لیکن عام معاشرتی وظیفے کی حیثیت سے یہ عمرانیات کے دائرے میں آجاتی ہے۔ یہاں ہمیں جس چیز سے بحث ہے وہ معاشی زندگی کا معاشرتی پہلو ہے۔ معاشی زندگی تمام شعبہائے معاشرت کی تہ میں موجود ہے اس لئے اسے معاشرے کی بنیاد قرار دے سکتے ہیں۔ یہ معاشرے کے آغاز سے نظر آتی ہے اور اس کے نشو و نما کے ہر دور میں قائم رہتی ہے۔ ہماری تعلیم ہمارے مذہب ہمارے جمالیات، ہمارے اخلاق سب کا دارو مدار معاشی زندگی کی نشو و نما پر ہے یعنی صنعت و حرفت پر جو ہماری مادی فلاح کے اسباب مہیا کرتی ہے۔ ہماری معاشی زندگی کی ارتقا کا اثر بالواسطہ ہماری ساری معاشرتی جد و جہد پر پڑتا ہے۔

۱۳۷۔ معاشی اشیا یا دولت ہماری خواہشوں کے پورا کرنے کیلئے پیدا کیجاتی ہے

انسان کی بعض مادی ضرورتیں ہیں جن کے پورا کرنے کے لئے وہ ہمیشہ سرگرم عمل رہتا ہے۔ بھوک کو رفع کرنے کے لئے سردی سے بچنے کے لئے

ذوق جمال کو تسکین دینے کے لئے، آرام و آسایش کا سامان مہیا کرنے کے لئے افراد مہد سے لحد تک جد و جہد کرتے رہتے ہیں اور جماعت کا فوری مقصد بھی انھیں خواہشوں کا پورا کرنا ہے۔ پیدایش دولت معاشرے کا پہلا اہم کام ہے۔ دولت پیدا کرنے کے معنی ہیں ان چیزوں کا مہیا کرنا جو کام میں لائی جاتی ہیں۔ انسان کوئی نئی چیز نہیں پیدا کر سکتا مگر وہ بیکار اور خام اشیا کو کار آمد بنا سکتا ہے۔

ایک درخت جو جنگل میں کھڑا ہے کچھ زیادہ کار آمد نہیں لیکن جب وہ مکان یا فرنیچر کی صورت میں تبدیل کر دیا جائے تو ہماری خواہشوں کو پورا کر سکتا ہے۔ معدنی اشیا جو پہاڑوں میں ہیں اپنی اصلی شکل میں کسی خواہش کو پورا نہیں کرتیں لیکن جب وہ کھود کر نکالی جاتی ہیں اور استعمال کے قابل بنا دی جاتی ہیں تو ان سے ہماری بہت بڑی ضرورتیں پوری ہو سکتی ہیں۔ اس سے ہمارا یہ مطلب نہیں کہ معدنیات یا درخت دولت میں داخل نہیں لیکن انھیں دولت اسی لحاظ سے کہتے ہیں کہ یہ آیندہ کار آمد یا خوشنما اشیاء کی صورت میں تبدیل ہو سکتی ہیں۔

۱۳۸۔ دولت کا آہستہ آہستہ جمع ہونا

ابتدا میں انسان کے پیدایش دولت کی رفتار بہت سست تھی پہلے تو اس کا سارا وقت اسی میں صرف ہو جاتا ہے کہ بقائے زندگی کے لئے کافی اور موسمی تکلیفوں سے محفوظ رہنے کے لئے لباس اور مامن فراہم کرے کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا کہ نہ اسے اتنی غذا ملتی تھی اور نہ ایسا مامن جو بقائے زندگی کے لئے کافی ہو۔ دولت کے جمع کرنے کی ابتدا اس وقت سے ہوئی جب غذا، لباس، اوزار اور آرائشی چیزیں اس مقدار میں مہیا ہو گئیں کہ انسان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے بعد بھی بچ رہیں۔ غذا کا ذخیرہ بڑھنے سے افراد اور قبیلے اس قابل ہو گئے کہ بہتر اوزار اور بہتر مکانات بنا سکیں اور انھیں پیدائش دولت کا زیادہ موقع ملنے لگا۔

ہر زمانے میں دولت کا صحیح اندازہ چیزوں کے ذخیرے سے نہیں بلکہ

دولت کی قوت، ذرائع اور مواقع کا بڑھ جانا ہے۔ ورنہ یوں تو جتنی معاشی اشیاء اب دنیا میں موجود ہیں وہ زیادہ تر پچھلے چند سال میں پیدا ہوئی ہیں لوگوں کے دل میں صحیح معنی میں دولت کے جمع کرنے یعنی آیندہ نسلوں کے لئے اٹھا رکھنے کا خیال قیمتی دھاتوں کے دریافت ہونے کے بعد سے ہوا ہے لیکن جب اجتماع دولت کی قوت ایک مرتبہ پیدا ہو جائے تو پھر ہندسی تناسب سے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اگر یہ قوت صحیح طور پر استعمال کی جائے تو یہی معاشی ترقی کا معیار ہے۔

۱۳۹-اجتماعی پیدایش دولت کی پیچیدگی

قدیم زمانے میں معاشی زندگی بالکل سادہ تھی۔ ہر فرد اپنی ذاتی فلاح کو مدنظر رکھتا تھا اور اس کا ہلاک ہونا یا زندہ رہنا خود اس کی سعی پر اور مواقع عمل پر موقوف تھا۔ لیکن جب لوگوں کو اشتراکِ مقاصد کا احساس ہوگیا تو افراد چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں متحد ہو کر ایک دوسرے کی خاطر کام کرنے لگے اس کے بعد تقسیم محنت کا عمل شروع ہوگیا بعض لوگوں نے غذا مہیا کرنے کا ذمہ لیا بعض نے اسے پکانے کا بعض نے مکان بنانے کا بعض نے کپڑے سینے کا اور بعض نے برتن وغیرہ تیار کرنے کا۔ آگے چل کر ایک جماعت تجارت کا کام کرنے لگی اور ایک نقل وحمل کا۔ اس طرح کام اور دولت کے بڑھنے سے معاشرے میں تفریق پیدا ہوئی اور مخصوص اغراض کے لئے چھوٹی چھوٹی جماعتیں بن گئیں جن میں سے ہر ایک کا کام کل معاشرے کے لئے ضروری تھا۔

تقسیم محنت کا آخری اثر معاشرتی زندگی پر یہ ہوا کہ جن لوگوں کے پیشے ایک تھے یا ایک دوسرے سے متعلق تھے ان میں زیادہ قریبی ربط پیدا ہوگیا اور معاشرتی تعلقات کے لحاظ سے الگ الگ جماعتیں بن گئیں۔ آج کل جماعتوں کا معاشرتی اتحاد زیادہ تر پیشے کی بناء پر ہے۔ قدرتی بات ہے کہ ایک ہی قسم کا کام کرنے والوں میں، جو آپس میں گہرے کاروباری تعلقات رکھتے ہیں، معاشرتی اتحاد ہونا زیادہ آسان ہے بہ نسبت ان لوگوں کے جنھیں ایک دوسرے سے بہت کم

سابقہ پڑتا ہے اِس لیے جماعت بندی جیسے صنعتی عمل پر مبنی رہی ہے اب بھی ہے لیکن ایسی صورتیں بھی نظر آتی ہیں کہ ایک ہی پیشے کے لوگ معاشرتی حیثیت سے ایک دوسرے سے علیحدہ ہیں مثلاً ایک قوم کے مزدوروں کا دوسرے قوم کے مزدوروں سے معاشرتی سابقہ اِس سے کم پڑتا ہے جتنا اپنی قوم کے تاجروں سے پڑتا ہے۔ لیکن ایک ہی علاقہ کے لوگوں میں عموماً معاشرتی تعلقات کاروباری سابقہ کی بناء پر ہوتے ہیں۔

اِس اصول کا مدنظر رکھنا ریاست ہائے متحدہ کے مسئلۂ اختلاف طبقات کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔ مہاجن کو مزدور سے دشمنی رکھنے کی یا کھنچنے کی کوئی وجہ نہیں اور ایک برتری کے انداز کے ساتھ اس سے ملنے میں بھی تامل نہیں ہوتا مگر قدرتی معاشرتی تقسیم کے لحاظ سے دونوں کے پیشے بالکل جدا ہیں۔ اِسی لئے دونوں میں اس قدر بُعد ہے۔ عام طور پر لوگ انھیں اشخاص سے میل جول رکھتے ہیں جن سے کاروباری تعلقات ہوں لیکن جب دولت بڑھتی ہے تو معاشرہ کم وبیش تمول کے لحاظ سے مختلف طبقوں میں تقسیم ہوجاتا ہے۔ معاشرتی حلقے آمدنی کی مقدار کے لحاظ سے بن جاتے ہیں۔ اس کی سب سے اچھی مثال امرا کی "سوسائٹی" ہے جہاں افراد روپیہ پانی کی طرح بہاکر شان نمود میں ایک دوسرے کی ریس کرتے ہیں۔

۱۴۰۔ اجتماعی دولت اور انفرادی دولت کا مقابلہ

اجتماعی نقطۂ نظر سے پیدائش دولت کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ اگر افراد کی دولت کی میزان جوڑی جائے تو اس میں اور جماعت کی مجموعی دولت میں فرق ہوتا ہے۔ کسی قوم کی دولت کی مقدار معلوم کرنا ہو تو اجتماعی (یا مشترکہ) دولت اور افراد کی کل دولت اُن دونوں کو جمع کرلیتے ہیں مگر اجتماعی دولت کا حساب کرنے میں قرضوں کے تمسکات کو شمار نہیں کرنا چاہئے اور انفرادی دولت کے شمار میں لکھے میں سے جو کھاگھٹا دینا چاہئے تاکہ حقیقی دولت باقی رہ جائے۔ مثلاً پرامیسری نوٹ جس شخص کے پاس ہے اس کے لئے تو وہ حقیقی دولت ہے۔ لیکن اس سے جماعت کی دولت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ ان حقایق سے عمرانیات یہ نتیجہ نکالتی ہے کہ جماعت کی مجموعی دولت اس کی قوت کا معیار ہوسکتی ہے۔ لیکن اس کی مرفہ الحالی کا معیار یہ ہے کہ افراد میں دولت کی تقسیم

کس تناسب سے ہوئی ہے۔ مثلاً اگر دولت معدودے چند افراد کے ہاتھ میں ہے اور باقی سب کو بھاری سود کے قرضوں، گرانی کی شدت یا عام افلاس نے جکڑ رکھا ہے، تو جماعت کی معاشرتی حالت یقیناً پست ہو جائے گی اس لئے دولت کی تقسیم اور اس کا استعمال اجتماعی مرفہ الحالی کا زیادہ صحیح مقیاس ہے بہ نسبت مقدار دولت کے۔

۱۴۱۔ مرفہ الحالی کی اہمیت

تکمیل سے زیادہ قریب وہی معاشرتی جماعتیں ہیں جو زیادہ ترقی پذیر ہیں اور ترقی وہی کر رہی ہیں جو افراد میں باہم انصاف قائم رکھتی ہیں، بلکہ سچ پوچھئے تو اجتماعی مرفہ الحالی بغیر انفرادی مرفہ الحالی کے ممکن ہی نہیں ہے۔ وہ معاشرتی جماعت جس کے پاس اوسط درجہ کی دولت ہے مگر تناسب کے ساتھ منقسم ہے اور خوش تدبیری سے استعمال کی جاتی ہے اس جماعت سے کہیں بہتر ہے جس کے پاس بہت زیادہ دولت ہے مگر افراد کی بڑی تعداد اس کی ملکیت اور استعمال سے محروم ہے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ اجتماعی مرفہ الحالی میں، جو ترقی کے لئے اس قدر اہم ہے، یہ بھی شامل ہے کہ افراد کے ساتھ انصاف کیا جائے اور ان کی راحت کا لحاظ رکھا جائے اِن میں سے ایک معاشی عنصر ہے اور ایک اخلاقی حصولِ دولت سے زیادہ اہم وہ طریقہ ہے جس سے وہ حاصل کی جاتی ہے۔ جو قومیں غارتگری سے دولت مند ہو جاتی ہیں وہ آخر کار اُن قوموں سے گھاٹے میں رہتی ہیں جو جائز محنت سے دولت کماتی ہیں۔ چنانچہ جس دن سے رومیوں کی قوم گھر کی محنت سے بے پروا ہو کر، فتوحات سے حاصل کی ہوئی دولت پر زندگی بسر کرنے لگی اسی دن سے اس پر زوال آنے لگا۔ اسی طرح جب اسپین نے دوسرے قوموں کو لوٹنا اپنا پیشہ بنا لیا تو اس کی صنعتیں برباد ہو گئیں اور اس کی خوش حالی رخصت ہو گئی۔ امریکی قوم نے جائز محنت سے دولت کمائی ہے۔ مگر اس کی ترقی کا صحیح معیار یہی ہے کہ اِس دولت کی تقسیم میں کل افراد کی مرفہ الحالی مدنظر ہے۔ غرض حصول دولت جو فرد اور جماعت کا سب سے بڑا کام ہے جو اجتماعی مرفہ الحالی کا مقیاس بھی بن سکتا ہے، جب طریقہ پیدائش اور طریقۂ تقسیم کے اہم

مسائل کا لحاظ رکھا جائے۔

۱۴۲۔ زمین یا طبیعی ماحول عمل اجتماعی کی بنیاد ہے

دولت کے مسئلے پر بحث کرتے وقت سب سے پہلے جو چیز قابل غور ہے زمین یا طبیعی ماحول ہے کیونکہ اسی سے نباتات اور معدنیات حاصل ہوتی ہیں۔ اور اسی سے جماعت کا دائرۂ عمل معین ہوتا ہے۔ دائرۂ عمل کا ایک پہلو زمین اور آبادی کا تناسب بھی ہے معاشرتی ترقی کی حد زمین کی پیداوار سے معین ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ پیداوار جتنی تعداد کے لئے کفایت کر سکے اس سے زیادہ آبادی نہیں بڑھ سکتی اصل میں سطح ارض کی کل آبادی کے لئے ہر زمانہ میں کافی زمین موجود رہی ہے۔ مگر اس قسم کی تقسیم کی بدولت کبھی کبھی ایسا ہوا ہے کہ بعض علاقوں میں آبادی حد سے زیادہ بڑھ گئی۔ اگر آبادی بہت چھدری ہو تو معاشرتی زندگی کے اعلیٰ درجے تک پہونچنا ناممکن ہے اور اگر حد سے زیادہ گھنی ہو تو بھی معاشرتی تنزل کا خوف رہتا ہے۔

۱۴۳۔ مالتھس کا نظریہ

مالتھس نے اس مشاہدے کی بناء پر کہ آبادی بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے اور اسباب معاش کے بڑھنے کی رفتار مقابلۃً سست ہے یہ حکم لگادیا کہ اگر آبادی کی افزایش روکی نہ گئی تو کچھ دن میں اتنی زیادہ ہو جائے گی کہ غذا کا ذخیرہ اس کے لیے کفایت نہیں کرے گا اور بہت سے لوگ ہلاک ہو جائیں گے۔ اس کی رائے تھی کہ آبادی میں اضافہ ہندسی تناسب سے ہو رہا ہے اور غذا کا ذخیرہ زیادہ سے زیادہ حسابی تناسب سے بڑھ سکتا ہے اس لئے سیدھا سا ریاضی کا مسئلہ ہے کہ آبادی ذخیرۂ معاش سے تجاوز کر جائے گی۔

عام اُصول کی حیثیت سے تو یہ صحیح ہے لیکن مالتھس نے بعض تلافی کن عناصر کو نظر انداز کر دیا تھا۔ مثلاً یہ کہ اب کاشت پیدایش بڑھانے والے اصول پہ کی جاتی ہے۔ جس سے اشیاء خوردنی کی پیداوار فی ایکڑ بڑھ گئی ہے، غذا بہتر طریقے سے تیار ہوتی ہے جس سے اس کی قوت پرورش میں اضافہ ہو گیا ہے، لوگ اعتدال پسند ہو گئے ہیں اور زمین کے بڑے بڑے رقبے قابل زراعت بنائے جا رہے ہیں

اس نے آبادی کی افزائش روکنے کے لئے حفظ ماتقدم کے طور پر یہ تجویز پیش کی کہ شادی دیر میں ہوا کرے اور بچے کم پیدا کئے جائیں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ گو غذا بہم نہ پہنچنے سے افراد فاقے کرتے ہیں بلکہ کہیں کہیں ساری قوم تکلیف اٹھاتی ہے۔ اگر دنیا میں غذا کی افراط ہے اور جہاں تک انسان پیش گوئی کر سکتا ہے اس ذخیرہ کے ختم ہو جانے کا کوئی اندیشہ نہیں۔ یہ بات تصور میں تو آ سکتی ہے کہ ایک زمانہ ایسا آئے جب زمین کی قوت کا استعمال انتہا کو پہنچ جائے اور غذا کی کمی سے دنیا کی آبادی گھٹ جائے مگر واقعے کی حیثیت سے وہ دن ابھی بہت دور ہے اس لئے اس پر غور نہیں کیا جا سکتا۔ جب تک انسان فطرت کے وسائل جو قریب قریب نامحدود ہیں نت نئے طریقوں سے کام میں لاتا رہے گا۔ آبادی کے طبعی اضافے کے لائق غذا کا سامان ہوتا جائے گا۔

۱۴۔ محنت پیدایش دولت کے ذریعے کی حیثیت سے

دولت پیدا کرنے میں اقدامی اور عملی عنصر محنت ہے۔ پیدایش دولت کی تاریخ میں ابتدا محنت ہی سے ہوئی تھی۔ محنت کی قوت سے انسان خارجی عالم فطرت کو قابو میں لا کر دولت پیدا کرتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ جدید معاشی زندگی میں سرمایہ محنت کی قیادت کرتا ہے اس لئے پیدایش دولت میں اسی کو تقدم حاصل ہے لیکن سرمایہ یعنی دولت کی وہ شکل ہے جو مزید دولت پیدا کرنے کے لیے مخصوص ہے، خود ہی ذہنی اور جسمانی محنت سے پیدا ہوا ہے۔ اگر آج کل کا پیدایش دولت کا نظام بغیر سرمایہ کے نہیں چل سکتا تو بغیر محنت کے اس کا چلنا بھی دشوار ہے کیونکہ محنت سے تو بغیر سرمائے کی مدد کے بھی کچھ نہ کچھ دولت پیدا ہو سکتی ہے۔ مگر سرمایہ بغیر محنت کے بالکل بے کار ہے۔

اس لئے اگر اور سب عناصر مساوی ہوں تو مختلف اقوام کی پیدایش دولت کی صلاحیت کا تعین ان کی مجموعی قوت محنت سے ہوگا۔ اس میں تین چیزیں شامل ہیں ایک تو کمیت یعنی مزدوروں کی تعداد، دوسرے کیفیت یعنی ان کے کام کا اچھا یا برا ہونا، تیسرے تنظیم۔ جہاں مزدوروں کی تعداد زیادہ ہوگی وہاں پیدایش

دولت کا موقع کم آباد مقاموں سے بڑھ کر ہوگا لیکن اس سے زیادہ اہم عناصر ہیں، مزدوروں کی قوت، قابلیت، جوش عمل، راحت اور جسمانی حالت۔ اگر کسی جگہ کے مزدور کفایت شعار اور دیانت دار ہیں اور ان کا دل راحت اور امید سے معمور ہے تو وہ ان ذلیل غلاموں سے کہیں زیادہ کام کریں گے جو جانوروں کی طرح کوڑے مار کر ہانکے جاتے ہیں۔ پھر کارکردگی تقسیم محنت پر بھی موقوف ہے۔ اگر ہر مزدور صرف ایک ہی کام کو اچھی طرح سیکھے تو اسے اس میں زیادہ مہارت ہو جاتی ہے اور وقت اور قوت کی بہت کفایت ہوتی ہے اس طرح مزدوروں کی کل جماعت کی قابلیت بڑھ جاتی ہے اس کے علاوہ محنت سے کام لینے کی قوت، مزدوروں کی تنظیم اور کاروبار کی تنظیم کا بھی قوت پیدایش پر بہت اثر پڑتا ہے۔

۴۵۔ صنعت و حرفت کی تنظیم کا اثر معاشرتی زندگی پر

تقسیم محنت اور تنظیم صنعت کا نتیجہ معاشرتی زندگی کے حق میں یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کی باہمی وابستگی بڑھ جاتی ہے۔ مثلاً سینے کی مشین، ٹوپی یا کوٹ کو مزدوروں کی بہت سی جماعتیں مل کر تیار کرتی ہیں۔ اب اگر ان میں سے ایک جماعت بھی اپنے حصہ کا کام نہ کرے تو یہ چیزیں نہیں بن سکتیں بلکہ سچ پوچھئے تو اگر ایک فرد واحد بھی ایسے موقعے پر اپنے کام سے قاصر رہے جب کوئی دوسرا اس کی قائم مقامی نہ کر سکتا ہو تو چیز کا تیار رہنا ناممکن ہے، اگر ایک بوٹ کے بنانے میں چالیس آدمی یا ایک قمیص کے تیار کرنے میں تیس آدمی شریک رہتے ہیں اور ان میں سے ایک بھی غیر حاضر ہو جاتا ہے، تو جب تک اس کی جگہ دوسرا شخص نہ رکھ لیا جائے سارا کام بند رہتا ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسی کسی پیچیدہ مشین کا کوئی ضروری پرزہ الگ کر دیا جائے اسی طرح کل معاشرے کے اندر ہر جماعت دوسری جماعتوں کی، ہر صنعت دوسری صنعتوں کی پابند ہے۔ نظام معاشرت کی بدولت تمام افراد ایک دوسرے سے وابستہ ہیں اور کل معاشرے کی کامیابی اس پر موقوف ہے کہ ہر چھوٹی جماعت کے اندر افراد ہم آہنگی سے کام کریں۔

۱۴۶۔ سرمائے کا کام پیدائش دولت میں

سرمائے کے معنی ہیں وہ زائد دولت جو معاشی پیدایش میں مدد دینے کے لئے مخصوص کردی جائے۔ یہ اِس طرح سے حاصل ہوتا ہے کہ آگے چل کر ایک دوسرے سے حاصل ہوتا ہے کہ انسان دولت جمع کرتا ہے یعنی اسے ایک خاص طرح سے صرف کرنے سے باز رہتا ہے تاکہ آگے چل کر ایک دوسرے طریقے سے صرف کرے، کیونکہ پیدایش میں بھی سرمایہ ہی صرف ہوتا ہے۔ سرمائے کی مدد سے پیدائش دولت سوگنی ہوجاتی ہے۔ بے سرمایہ کے یعنی بے آوزار، مشین اور زر یا آزاد سرمائے کے محض ہاتھ پانوں اور دماغ کی محنت سے محض زندگی کی اشد ضروری چیزیں پیدا کی جاسکتی ہیں۔ محنت، سرمائے اور کام لینے کی قوت اگر مناسب طریقے سے جمع ہوجائیں تو بعض اقسام کی دولت ایک گھنٹہ میں اتنی پیدا کی جاسکتی ہے جتنی پہلے ایک سال میں ہوتی تھی۔ لیکن معاشرتی زندگی پر سرمائے کے استعمال کا اثر بہت گہرا اور وسیع ہوا ہے۔ اسی کی بدولت بڑے بڑے کارخانے اور دکانیں قائم ہوئی ہیں اور اجیروں کا طبقہ وجود میں آیا ہے، اسی کی بدولت ایک سرمایہ داروں کی جماعت بن گئی ہے جو پیدایش دولت کے مادی وسائل فراہم کرتی ہے، ایک مزدوروں کی جو قوت بازو سے خدمت کرتی ہے اور ایک کاروبار کے منتظموں کی۔ انہی حالات کی وجہ سے آجروں اور اجیروں کے کل جھگڑے جو سرمایہ اور محنت کے تنازع کے نام سے موسوم ہے، پیدا ہوئے ہیں۔

۱۴۷۔ اجتماعی پیدایش دولت کا طریقہ بدلنے کے معاشرتی اثرات

بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کوئی چیز بہت سے لوگوں کی مجموعی محنت اور بہت سی قوتوں کے اتحاد عمل کے بغیر تیار ہوکر بازار میں پہنچ جائے۔ جیسے جیسے نئی قوتوں سے کام لیا جارہا ہے اور نئی صنعتیں جاری ہورہی ہیں، صنعت کے نظام میں اور صنعتی زندگی میں بھی برابر تغیر ہورہا ہے۔ جب اٹھارھویں صدی کے نصف آخر میں دستی صنعت کی جگہ مشینوں کی صنعت کا دور دورہ ہوا تو معاشرے کی

ہیئت میں کایا پلٹ ہو گئی۔ اب اُس کی ترتیب صنعتی طبقوں کے لحاظ سے ہونے لگی۔ یہ معاشرتی ارتقا روز افزوں رفتار سے اب تک جاری ہے۔ نئی مشینوں کا استعمال، بھاپ اور بجلی کے نئے نئے کرشمے، کاروبار کے نئے طریقے معاشرے کی ہیئت کو بدل رہے ہیں افراد کے تعلقات میں تغیر پیدا کر رہے ہیں۔ اس دور انقلاب میں صنعتی زندگی میں انصاف اور آزادی پیدا کرنا مشکل ہے۔ اُس میں بلکہ زندگی کے کل شعبوں میں ترقی بہت اسراف کے ساتھ ہوتی ہے یعنی اِس طرح کہ افراد کو اور اکثر پوری پوری جماعتوں کو بڑا نقصان پہنچتا ہے۔

۱۴۸۔ مختلف طبقوں کی باہمی نزاع

اگرچہ ریاست ہائے متحدہ میں اِس قسم کا اختلافِ مراتب نہیں ہے، جیسا یورپ میں قرونِ وسطیٰ کے آخر میں اور عہد جدید کے آغاز میں تھا تاہم صنعتی زندگی کی بدولت لوگ طبقوں میں تقسیم ہو گئے ہیں جو کم و بیش مستقل وجود رکھتے ہیں، پھر بھی افراد کو ایسے مواقع حاصل ہیں کہ افلاس کی حالت سے نکل کر تمول حاصل کر لیں ممکن ہے کہ آج جو شخص ایک معمولی مزدور ہے وہ کل سرمایہ دار یا منتظم کے رتبے کو پہنچ جائے چاہے معاشرتی طبقے بدستور باقی رہیں مگر افراد ایک طبقے سے دوسرے طبقے میں منتقل ہوتے رہتے ہیں کبھی کبھی صنعتی زندگی کی یہ آزادی مواقع کے نہ ہونے سے محدود ہو جاتی ہے پھر بھی عموماً طبقوں کی باہمی نزاع کے باوجود فرد آزاد رہتا ہے۔ موجودہ حالت کا محنت کی تنظیم مکمل ہو جانے اور صنعت کا انتظام تاجروں کی بڑی بڑی شرکتوں کے ہاتھ میں چلے جانے کے بعد باقی رہنا اِس پر موقوف ہے کہ معاشرے کے مختلف اجزا میں ہم آہنگی اور اشتراکِ مقاصد ہو اور ایسے قوانین بنائے جائیں جو انفرادی آزادی کو قائم رکھیں معاشرتی نظام کی مکمل صورت وہی ہو گی جو سب طبقوں کی مرفہ الحالی کو مدنظر رکھے۔

۱۴۹۔ اجتماعی صرفِ دولت

افراد کی خواہشیں ترقی کی محرک قوتیں ہیں۔ اگر مادی اشیاء کے صرف کی خواہش

نہ رہے تو ان کی پیدائش فوراً رک جائے۔ منطقی ترتیب کے لحاظ سے تو پیدائش کا عمل صرف سے پہلے ہوتا ہے مگر اصل میں صرف پیدائش کا سبب ہے۔ انسان کی داخلی خواہش معاشی جد وجہد کی حقیقی بنیاد ہے۔ معاشرتی زندگی کا یہ شعبہ اس قدر اہم ہے کہ نوع انسانی کی ترقی کا اندازہ خواہشوں کی تعداد، تنوع اور قوت سے ہو سکتا ہے۔ اس ترقی کا پورا پورا شمار تب ہی ہوگا جب ان خواہشوں کی تسکین کی مقدار نا پی جا سکے۔ کیونکہ جیسا وارڈ کہتا ہے "تمدن مادّی اشیا اور فطرت کی قوتوں سے کام لینے کا نام ہے" یہ سچ ہے لیکن کارکردگی کا معیار داخلی ہے کیونکہ انسان اصل میں اپنی خواہشوں کے پورا کرنے کے لئے سعی کرتا ہے اور یہ کارکردگی کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔

مگر تمدن پر جن خواہشوں کا اثر پڑتا ہے وہ مادّی اشیا تک محدود نہیں ہیں۔ آرٹ، مذہب، آزادی، انصاف، تعریف اور عزت کی خواہشیں بھی انفرادی اور اجتماعی جد وجہد کی محرک ہوتی ہیں اور معاشرتی تعلقات قائم پر اثر ڈالتی ہیں۔ اگر ہم دو نسلوں میں مقابلہ کریں جن میں سے ایک فطری اور ایک عمرانی زندگی بسر کرتی ہے تو دوسری اپنی خواہشوں کے کیف وکم کے لحاظ سے پہلی سے جو صرف چند محدود اور سادہ خواہشیں رکھتی ہے حیرت انگیز طور پر مختلف نظر آتی ہے۔ جب کوئی نسل ترقی کرتی ہے تو اس کی خواہشوں کی تدریجی تبدیلی اور نئی خواہشوں کے پیدا ہونے سے اس کی نشوونما کا اظہار ہوتا ہے۔ اسی ارتقائے خواہش کے سبب سے معاشرے کے نصب العین ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں اور ہر نئے نصب العین تک پہنچنے کے لئے افراد اور جماعت کو بہت کچھ سعی کرنا پڑتی ہے۔

۱۵۰۔ صرف دولت کا اقتصاد

معاشرے کی مرفہ الحالی کی بحث میں مادّی اشیا کے صرف کا مسئلہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ فرض کیجئے ایک جماعت کا معاشی نصب العین بھی صحیح ہے اور اس کی خواہشیں بھی مہذب اور معقول پھر بھی اسے صرف کرنے کا فن بڑی مشکل سے

آتا ہے۔ مادّی چیزوں سے پورا پورا فائدہ اٹھانا بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ صرفِ دولت کا اقتصاد افراد کا بھی اور جماعتوں کا بھی عموماً ناقص ہوتا ہے۔ نہ جانے کتنی مادّی اشیا بے اصول صرف کی وجہ سے برباد جاتی ہیں۔ جو دولت موجود ہے اُس سے پورا فائدہ نہ اٹھانے سے افراد کا دیوالہ نکل جاتا ہے اور جماعتوں کی سکت جاتی رہتی ہے۔ یہ چیز غریبوں اور جاہلوں میں بہت نمایاں ہے۔ ہزارہا آدمی محض اس لئے پیسے پیسے کو محتاج ہو کر غلامی پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ وہ تدبیر منزل کا فن نہیں جانتے اور نہیں برتتے۔ اگر وہ اپنی تھوڑی سی پونجی سے بھی مناسب طریقے پر کام لیتے تو انھیں فرصت اور فراغت نصیب ہو سکتی تھی۔ اسی اصول کے مطابق معاشرے کو دیکھا جائے تو یہ نظر آتا ہے کہ ذخیرۂ عمومی برباد ہو رہا ہے اور جماعت محصولوں کے بوجھ سے دبی جا رہی ہے یا اجتماعی قوتوں میں اقتصاد نہ ہونے کے سبب سے معاشرتی زندگی ناقص ہے اور قوتِ عمل ضائع ہو رہی ہے۔ اچھے سے اچھا معاشرہ بھی چاہے پیدائش دولت میں کامیاب ہو مگر مادّی اشیا کے صرف اور اجتماعی قوتوں کے استعمال میں معیار سے گرا ہوا ہے۔ معیارِ زندگی کو پست نہیں بلکہ بلند کرنا چاہیئے اور معقول خواہشوں کو بڑھانا چاہیئے لیکن بے کار مصارف کو جن سے کوئی مستقل فائدہ نہیں ہوتا اور مضر مصارف کو جن سے انفرادی یا اجتماعی زندگی کو تنزل ہوتا ہے موقوف کرنا چاہیئے۔ ضرورت سے زیادہ غذا یا نشہ لانے والی اور اعصاب کو سُن کرنے والی اشیا بیکار اور مضر صرف کی مثالیں ہیں۔

۱۵۱۔ تعیّشات

تعیّش ایک اضافی اصطلاح ہے جو ایک جماعت کے مختلف افراد یا مختلف زمانوں کے معاشروں کی باہمی نسبت سے استعمال کی جاتی ہے۔ ممکن ہے کہ جو چیز ایک فرد کے لئے تعیش میں داخل ہو وہ دوسرے فرد کے لئے ضروری ہو اور جو ایک زمانے میں سامانِ عیش سمجھا جائے وہ دوسرے زمانے میں معمولی زندگی کا لازمی جزو ہو۔ لیکن وہ معاشرہ جس کا ایک طبقہ ضروریاتِ زندگی کا محتاج ہو اور دوسرا دولت کو

پانی کی طرح بہائے بہت ہی ناقص کہلائے گا۔ اگر چند آدمیوں کے یہاں پُر تکلف دعوتیں، ناچ رنگ کے جلسے اور عیش و عشرت کے سامان ہیں اور اکثر لوگ زندگی کی آسائشوں کے محتاج ہیں بلکہ بعض فاقے کرتے ہیں اور ہر طرح کی انفرادی اور معاشرتی ترقی سے محروم ہیں تو عمرانیات کے نقطۂ نظر سے یقیناً اسراف ہو رہا ہے۔ ایسی صورت میں یہ کہنا غلط ہے کہ امرا کے مصارف زیادہ ہوں تو اشیاء کی طلب بڑھتی ہے اور بہت سے لوگوں کے لئے کام نکل آتا ہے۔ بعض اجتماعی اثرات کے لحاظ سے افلاس بھی وبا اور آتش زدگی سے کچھ کم نہیں۔ دولت کا صرف اور اختیارات کا استعمال اجتماعی مفاد کے لحاظ سے اسی حد تک جائز ہے جہاں تک اس سے متناسب نتائج حاصل ہوں۔

باب نہم

مبادلہ بہ حیثیت معاشرتی وظیفے کے

۱۵۲۔ مبادلے کی اہمیت

پیدائش دولت کا ایک اہم شعبہ جس کے نتائج بہت دور تک پہنچتے ہیں طریقہ مبادلہ ہے۔ تقسیم محنت کی طرح یہ بھی دولت آفرینی کا ذریعہ ہے۔ یہ چھوٹے پیمانے پر اشیا کے مبادلے کی صورت میں شروع ہوا تھا اور بڑھتے بڑھتے موجودہ نظام اعتبار کے مرتبے کو پہنچ گیا۔ اس کی باضابطہ ابتدا اس طرح ہوئی کہ ایک خاص قسم کی اشیا جو استعمال سے بچ رہتی تھیں دوسری قسم کی اشیا سے جو زیادہ مرغوب ہوں بدل لی جاتی تھیں۔ یا بقول ایک معاشی کے "نسبتہً غیر ضروری اشیا کا مبادلہ نسبتہً ضروری اشیا سے کیا جاتا تھا"۔ غیر متمدن معاشرے میں اشیائے خوردنی، پہننے کے کپڑے اور اوزار کا مبادلہ ہوتا تھا یہی طریقہ لوگ ہر قسم کی اشیا میں برتتے رہے یہاں تک کہ زر ایجاد ہوا اور مبادلہ کا واسطہ قرار دیا گیا۔

۱۵۳۔ مبادلے کے معاشرتی اثرات

ہمیں یہاں جس چیز سے بحث ہے وہ مبادلے کے معاشرتی اثرات ہیں اس کا اصلی فائدہ یہ ہے کہ صنعتوں میں تنوع پیدا ہوتا ہے۔ اس کی بدولت ہر فرد کو یہ موقع ملتا ہے

کہ وہ کوئی خاص پیشہ اختیار کرے یا کسی خاص چیز کے پیدا کرنے میں مشغول ہو جائے۔ مثلاً ایک کسان اپنی ساری قوتِ عمل گیہوں کی کاشت میں صرف کرتا ہے اور پیداوار کا ایک حصہ اپنی ضروریات کے لئے رکھ کر باقی کا مبادلہ دوسری اشیائے خوردنی، لباس، اوزار اور فرنیچر سے کرلیتا ہے۔ آج کل وہ یہ عمل زر کے واسطے سے کرتا ہے یعنی گیہوں کو بیچ کر جو روپیہ ملتا ہے اسے دوسری ضروری چیزوں کے خریدنے میں صرف کرتا ہے۔ اس طرح اُسے یہ موقع ملتا ہے کہ ایک کام اچھی طرح کرسکے۔

لیکن مبادلے کا معاشرتی وظیفہ یہیں تک محدود نہیں بلکہ اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ اس کی بدولت افراد میں، جماعتوں میں، ملکوں میں اور قوموں میں معاشرتی تعلقات پیدا ہوتے ہیں اور یہ تعلقات مختلف گروہوں کو ملا کر معاشرہ بنانے میں بہت کچھ مدد دیتے ہیں۔ مبادلے کے ذریعے سے طرح طرح کی اشیائے خوردنی باہر سے آتی ہیں، غذا کے ذخیرے میں نئی چیزوں کا اضافہ ہوتا ہے اور بقائے زندگی کی قوت بڑھ جاتی ہے۔ اسی طرح لباس میں تنوع پیدا ہوتا ہے، جو چیزیں فطرت اور صنعت سے جسم کی حفاظت اور آرائش کے لئے حاصل ہوتی ہیں اُن سے ہر قوم فائدہ اٹھا سکتی ہے۔ اس سے آرام بھی ملتا ہے اور کفایت بھی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ مبادلے کی بدولت لوگوں کو پیشے اور آب و ہوا کے مناسب لباس میسر آجاتا ہے اور ان کی کارکردگی بڑھ جاتی ہے۔ اس سے بھی زیادہ اہم فائدہ، گو وہ غیر محسوس ہوتا ہے، یہ ہے کہ مادی اشیا کے مبادلے کے ساتھ ساتھ تبادلِ افکار بھی ہوتا رہتا ہے۔ تجارت ہمیشہ سے ذہنی نشو و نما کی بہت بڑی محرک رہی ہے۔ مبادلۂ اشیا کی بدولت معاشرتی زندگی اور تعلیم کے متعلق خیالات ایک جماعت سے دوسری جماعت میں اور ایک قوم سے دوسری قوم میں پہنچ جاتے ہیں۔ تجارتی راستے ہر زمانے میں علم و ہنر، تہذیب و تمدن اور نئی ایجادوں کی اشاعت کے لئے شاہراہ کا کام دیتے رہے ہیں۔ مشرق کے قافلے شرقی ممالک سے تہذیب کی روشنی لاتے تھے اور جو جو ملک ان کے رستے میں پڑتے تھے انھیں اس نور سے منور کرتے جاتے تھے فینیقیوں نے تجارت کے سلسلے میں ایشیا کے ہنر مغربی دنیا میں پہنچائے۔ غالباً کاروبار کا اثر خیالات پر پڑنے کی سب سے نمایاں مثال وہ ہے جو

قرونِ وسطےٰ میں اطالیہ کے شہروں اور مشرقی ملکوں کے مابین تجارت میں نظر آتی ہے۔ اسی قسم کا اثر جرمنی کے ہانزا[1] شہروں کا تھا جن کی بدولت شمالی یورپ کی تجارت کو فروغ ہوا۔

قوموں کے مذہبی اور اخلاقی اثرات کاروبار کے ذریعے پھیلتے ہیں۔ بلکہ بعض اوقات نئی رسموں کو رواج دینے کا یہ طریقہ بلا واسطہ تبلیغ سے زیادہ موثر ہوتا ہے۔ جب دو قوموں میں تجارت کی بدولت آمدورفت اور میل جول ہوتا ہے تو وہ تقریباً غیر شعوری طور پر ایک دوسرے کی عادات و رسوم اختیار کر لیتی ہیں۔ اس کی سب سے نمایاں مثال بدکاری کے طریقوں کے پھیلنے میں نظر آتی ہے بہ خلاف اس کے مذہب کی تقلید بہت آہستہ آہستہ ہوتی ہے۔ مذہبی عقائد کی اشاعت کا عمدہ موقع تجارت ہی کے ذریعے سے ملتا ہے۔ صرف مذہب کی تبلیغ غیر مہذب قوموں میں تہذیب و تمدن کی نشو و نما کے لیے کافی نہیں۔ اگر اس کے ساتھ انھیں مہذب قوموں سے کاروبار اور آمدورفت کا موقع دیا جائے تو کوئی ترقی نہیں ہو سکتی۔ مسیحی مبلغوں نے جو جد و جہد ایشیا اور افریقہ میں کی ہے اس پر نظر ڈالنے سے یہ بات بہت اچھی طرح ثابت ہو جاتی ہے ان پر یہ حقیقت کھل گئی ہے کہ اگر صابی مذاہب کا مقابلہ کرنا ہے تو انھیں تہذیب کے فنون بھی سکھانا چاہئیں اور اسی کے ساتھ مہذب ملکوں سے تبادلِ خیالات اور آمد و رفت کا شوق دلانا چاہیے۔ اگر چین مہذب علوم و فنون کو رد کرتا رہا اور اپنی بندرگاہوں کو مہذب ملکوں کے لئے ممنوع قرار دیتے پر مصر رہا تو مسیحی مبلغوں کی ساری کوششیں بیکار جائیں گی۔ صابیت کا ہر حل سر اٹھاتا رہا بڑھتا اور پنپتا رہے گا اور کتابِ مقدس کے لطیف اثرات کو مٹا دے گا۔ اسی اصول کے مطابق ریل اور دوسرے وسائل تجارت جزائر فلپائن[2] کے باشندوں کو فنونِ تہذیب کی تعلیم دینے کا

۱۔ Hanstadte

۲۔ The Philippines

بہترین ذریعہ ثابت ہوں گے۔

لیکن یہ یاد رہے کہ تجارت سے حرص وطمع بھی بڑھتی ہے۔ ایک غیر متمدن ملک میں جہاں ایک قسم کی اشیا کی افراط ہو اور مبادلے کا کوئی ذریعہ نہ ہو، ان اشیا کی قدر نہیں ہوتی۔ اسی لیے لوگوں کو یہ خواہش بھی نہیں ہوتی کہ انھیں جمع کر کے رکھیں۔ لیکن دوسرے ملکوں سے تجارت شروع ہوتے ہی جمع کرنے کی ہوس پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ صورت مغربی امریکہ میں پھلوں اور زراعتی اشیا کی پیداوار کے سلسلے میں بارہا پیش آئی ہے۔ اکثر وہاں کی پیداوار منڈی نہ ہونے کی وجہ سے مقابلۃً بے قدر رہی ہے لیکن مبادلے کے شروع ہونے پر جب ان کی مانگ بڑھی تو لوگوں میں جمع کرنے کی خواہش بھی پیدا ہو گئی۔

قوموں اور قبیلوں میں لڑائیاں عموماً آپس کی نزاع، رقابت اور اقتدار کی خواہش کی بدولت ہوئی ہیں لیکن مالِ غنیمت کی ہوس بھی ہمیشہ جنگ کی ایک قوی وجہ رہی ہے۔ اور مہذب قوموں میں تو شاید ہی کوئی ایسی جنگ ہوئی ہو جس میں کسی نہ کسی شکل میں حصولِ دولت کی خواہش کو دخل نہ ہو۔ عبرانی قوموں کی تاریخ میں اس کا ثبوت ملتا ہے کہ دشمن پر فتح پانے کے بعد اسے لوٹ لیا کرتے تھے۔ مشرقی ملکوں کے مطلق العنان بادشاہ بھی جنگ میں غارتگری کو جائز رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ عظیم الشان رومی سلطنت بھی غیر ملکوں کی فتوحات میں مالِ غنیمت کی طرف سے غافل نہیں رہتی تھی گو بعض اوقات اس کا درجہ فتح کی شہرت اور عظمت کے بعد سمجھا جاتا تھا۔

۱۵۴۔ مبادلے کی آسانی کیلئے زر کا استعمال

جب تک زر کا استعمال نہیں تھا مبادلہ بہ حیثیت معاشرتی وظیفے کے نامکمل تھا۔ زر کی ابتدائی شکلیں بہت ناقص اور بے ڈول تھیں اور اس کا طریقۂ استعمال قدیم مبادلۂ اشیا سے کچھ زیادہ بہتر نہیں تھا۔ لیکن رفتہ

رفتہ اس کا انتظام مکمل ہو گیا اور زر کو مبادلہ کا ذریعہ بنانے سے نہ صرف دولت کے جمع کرنے میں بلکہ تہذیب کی ترقی میں بھی مدد ملی۔ بجائے اس کے کہ اشیاء میں بغیر کسی مقررہ معیار کے مبادلہ کیا جائے ایک چیز جس سے سب واقف تھے اور جس کی قیمت معین تھی اور سب چیزوں کی قیمت کا معیار قرار دے دی گئی ہے۔ شکار اور ماہی گیری کے دور میں یہ کام سمور وغیرہ سے لیا جاتا تھا۔ گلہ بانی کے دور میں پیدائشی زر کی جگہ پر استعمال کئے جاتے تھے اور چیز کی قیمت بیلوں کے حساب سے لگائی جاتی تھی، غیر متمدن قومیں گھونگے یا اور آرائشی چیزیں، جو ہر جگہ پائی جاتی تھیں، اس مقصد کے لئے استعمال کرتی تھیں۔ زرعی دور میں اکثر اوقات غلے قیمت کے پیمانے کا کام دیتے تھے مگر رفتہ رفتہ دھاتیں ذریعۂ مبادلہ کی حیثیت سے زیادہ مقبول ہونے لگیں۔ پہلے ادنٰے دھاتیں استعمال ہوتی تھیں مثلاً سیسا اور تانبا مگر آخر میں سونا اور چاندی پائیدار اور عالمگیر ہونے کی وجہ سے زر سکے کے لئے مخصوص کر دیئے گئے۔

زر کے بنانے کا پہلا اصول یہ ہے کہ جو چیز اس کے لئے استعمال کی جائے وہ بجائے خود پسندیدہ ہو اور اس معاشرے میں معروف ہو۔ پھر پسندیدہ اور معروف چیزوں میں وہ منتخب کی جاتی ہیں جو معیار قیمت اور ذریعۂ مبادلہ ہونے کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہوں اور جس میں جمع کر کے رکھنے میں آسانی ہو۔ ان کے انتخاب میں بادشاہوں یا حاکموں کے حکم کو زیادہ دخل نہیں بلکہ جن طریقوں سے اور چیزیں معمولاً رواج پایا کرتی ہیں اسی طرح یہ بھی استعمال ہونے لگتی ہے۔

زر کی بدولت تمدنی فنون کی ترقی کی رفتار بہت تیز ہوگئی لیکن آگے چل کر مبادلے کے بڑے بڑے معاملات میں اس کے استعمال میں بھی دقت محسوس ہونے لگی۔ اس وقت اعتبار کا طریقہ رائج ہوا اور اس کی بدولت کاروبار میں اس قدر آسانی ہوگئی کہ تجارت اور صنعت کی کایا پلٹ گئی۔ اعتبار کی ایجاد نے تجارت کے ساتھ وہی کیا جو بخارات اور بجلی کی ایجاد نے صنعتی فنون کے

ساتھ کیا تھا۔ یہ مبادلے کا بالکل مکمل آلہ ہے، اس کے رواج سے طریقے بہت بدل گئے اور معاشرے کی عادات و رسوم بھی متاثر ہوئیں۔ مبادے کے طریقے میں جو تغیرات ہوتے رہے ان کے ساتھ معاشرے کی تنظیم اور تقسیم بھی بدلتی گئی۔ اجتماعی نظم اور معاشرتی جدوجہد پر اس کا بہت بڑا اثر پڑا۔

۱۵۵۔ پیشہ ور تاجروں کے طبقے کا ظہور

مبادلے کے سبب سے معاشرے میں بہت سی نئی جماعتیں قائم ہوگئیں۔ ان میں سے پہلی جماعت سوداگروں یا تاجروں کی تھی۔ غیر متمدن معاشرے میں تو افراد خود ہی ایک دوسرے اشیا کا مبادلہ کرتے ہیں مگر جب تقسیم محنت کی بدولت معاشرتی زندگی زیادہ پیچیدہ ہو جاتی ہے تو اس کی ضرورت پڑتی ہے کہ کوئی شخص مبادلہ کرنے والوں یعنی بیچنے والے اور خریدنے والے کے درمیان آڑھت کا کام دے۔ پہلے تو وہ پھیری والے خردہ فروش کی حیثیت سے بعض اشیا خرید کر دوسری اشیا سے بدلتا تھا اور پھر ان کو بازار میں فروخت کرتا تھا۔ آگے چل کر ہر قسم کے مال کی تقسیم کے لئے منڈیاں کھل گئیں۔ پھر بڑی بڑی کوٹھیاں اور گودام قائم ہو گئے اور تاجروں کی فوج تیار ہو گئی۔ جوں جوں اس گروہ کے کام کی اہمیت بڑھتی گئی اس کے اندر اور تفریق ہوتی گئی۔ جدید زمانے میں اس گروہ کی تقسیم ہمیشہ بدلتی رہتی ہے۔ آج کل صانعوں کی ایک علیحدہ جماعت ہے، تھوک فروشوں اور حصوں کا کاروبار کرنے والوں کی الگ ہے اور بڑے تاجروں کے گماشتوں اور سفری ایجنٹوں کی الگ۔ چند سال سے صانعوں کا رجحان اس طرف ہے اپنی مصنوعات ڈاک کے ذریعے براہ راست صارفوں کے ہاتھ بیچیں۔ اس طرح پیدا کرنے والے اور صرف کرنے والے میں زیادہ قریبی تعلقات پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن حالات چاہے کتنے ہی سازگار ہوں بیچ کی جماعتوں کا معدوم کرنا ناممکن ہے۔

مبادلے کے سبب سے ایک اور گروہ مہاجنوں اور صرافوں کا پیدا ہو گیا ہے۔ جن کی وجہ سے کاروبار میں سہولت ہوتی ہے۔ لوگ تجارت کے

چلانے میں زر اور اعتبار سے مدد کرتے ہیں۔ ان کی صنعتی دنیا میں وہ حیثیت ہے جو انسان کے جسم میں نظام اعصابی کی ہوتی ہے اور ان کے بغیر اس زمانے کا مبادلہ خیل ہی نہیں سکتا کیونکہ جس طرح تاجر اشیاء کا کاروبار کرتے ہیں یہ زر اور اعتبار کا کرتے ہیں۔

۱۵۶۔ نقل وحمل مبادلہ کا پابند ہے

چونکہ وہ اشیاء جن کا مبادلہ ہوتا ہے سب کی سب کسی ایک خطے بلکہ کسی ایک ملک میں بھی نہیں پیدا ہو سکتیں اس لئے بڑے پیمانے پر تجارت کرنے کے لئے نقل وحمل کے ذرائع کی ضرورت ہوتی ہے۔ غیر متمدن جماعتوں میں سے دیسی امریکی آرائشی چیزوں کو فروخت کرنے کے لئے قبیلے قبیلے پھرتے تھے مشرق کی تجارت میں سب سے پہلے بڑے قافلوں کا رواج ہوا۔ تجارتی مال اونٹوں پر لاد کر ایک ملک سے دوسرے ملک میں لے جاتے تھے۔ جب جہاز رانی شروع ہوئی تو مال دریاؤں اور سمندروں کی راہ سے مختلف ملکوں میں بھیجا جانے لگا۔ اب نقل وحمل کرنے والوں کا ایک نیا گروہ پیدا ہو گیا اور چونکہ زاید مال کو دوسرے ملکوں میں بھیجنا ضروری تھا اس لئے یہ ایک اہم معاشرتی اور تجارتی گروہ بن گیا۔ جہاں دریا وغیرہ نہیں تھے وہاں اندرون ملک میں مال لے جانے کے لئے نہریں بنائی گئیں اور ایسے لوگوں تک پہنچانے کے لئے سڑکوں کی ضرورت پڑی۔ جدید زمانے میں مال اور مسافروں کو سمندر پار پہنچانے کے لئے جہازوں کی کمپنیاں۔ اور ریلوں کی بڑی بڑی شرکتیں جو ہر سال لاکھوں آدمیوں اور کروڑوں من مال کو براعظم کے ایک سرے سے دوسرے سرے پر پہنچاتی ہیں نقل وحمل کی انتہائی ترقی یافتہ صورتیں ہیں۔

غالباً معاشرے میں ایک معاشی جماعت کی نشو ونما کی سب سے اچھی مثال دنیا کی ریلوں کے نظام ہیں۔ یہ بہت بڑی منظم جماعتیں ہیں جو اس خاص مقصد سے قائم ہوئی ہیں کہ مال اور مسافروں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچائیں۔ ریلوے کا نظام ہر قوم کے لئے اس قدر ناگزیر ہو گیا ہے کہ اگر دس دن کے لئے ریلیں بند ہو جائیں تو سارا کاروبار رک جائے۔ ہمارے کسی بڑے شہر میں اگر ریل کا سلسلہ

منقطع ہو جائے تو ایک مہینے کے اندر ضروریاتِ زندگی کے بہم نہ پہنچنے سے فاقوں کی نوبت آ جائے۔

۱۵۷۔ معاشرتی تنظیم کی اصلاح۔

ہماری زندگی اب بہت متنوع ہو گئی ہے اس لئے صنعتی اور سیاسی طریقوں میں اصلاح اور ترقی کی ضرورت ہے۔ یعنی چونکہ معاشرے میں زیادہ پیچیدگی پیدا ہو گئی ہے اس لئے تنظیم کو بھی معیّن اور واضح شعبوں میں تقسیم کرنا چاہیئے۔ جس طرح ایک بڑی اور پیچیدہ مشین میں ایک چھوٹا سا پرزہ بگڑ جائے تو وہ رک جاتی ہے اسی طرح معاشرے کی عظیم الشان اور پیچ در پیچ تنظیم میں ایک چھوٹی سی جماعت ٹھیک کام نہ کرے تو کامیابی سے نہیں چل سکتی اور جس طرح پرانی بھدی مشینوں کی جگہ بہتر وضع کی نئی مشینیں استعمال میں آتی رہتی ہیں اسی طرح نظمِ اجتماعی کی مشین میں بھی ہمیشہ اصلاح اور ترمیم ہوتی رہنا چاہیئے۔ ورنہ وہ نئے کاموں کو جو پیدا ہوتے جاتے ہیں، انجام نہیں دے سکتی مثلاً اگر ایک جماعت اپنی قوم کے لئے کوئلہ بہم پہنچانے کا ذمہ لیتی ہے تو اسے اس فرض میں کوتاہی نہیں کرنا چاہیئے ورنہ کارخانے بند ہو جائیں گے اور لوگ جاڑوں مریں گے اور فاقے کریں گے۔ اگر ایک جماعت زرعی پیداوار فراہم کرنے کی ذمہ دار ہے تو اسے ایک سال بھی بیکار نہیں رہنا چاہیئے ورنہ ساری قوم ہلاک ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ ہر جماعت کے اندر بھی تنظیم مکمل ہونا چاہیئے۔ یعنی اگر ایک جماعت قوم کے لئے روشنی کا ذمہ لے اور مشینوں کے ناقص ہونے یا انتظام کے خراب ہونے کے سبب سے معقول قیمت پر روشنی فراہم نہ کر سکے تو لوگوں کو دوسرے ذرائع اختیار کرنا پڑیں گے ورنہ نظمِ اجتماعی میں نقص پیدا ہو جائے گا اور اسے اپنا سنبھالنا مشکل پڑ جائے گا۔

اسی طرح سیاسی نظام میں بھی اصلاح ہوتی رہنا چاہیئے ورنہ فرسودہ نظمِ حکومت اور قوانین معاشرتی اور صنعتی زندگی کی ترقی میں خلل انداز ہوں گے۔ سیاست کا مقصد لوگوں، کل طبقوں اور جماعتوں کی حفاظت ہے۔ اگر وہ لوگوں کے جان و مال کے تحفظ میں یا ان کے اغراض میں ہم آہنگی پیدا کرنے میں کامیاب نہ ہو تو

پیدائش دولت اور تقسیم دولت میں بہت خلل پڑ جائے گا اور اس کی وجہ سے معاشرتی ترقی رک جائے گی۔ مثلاً یہ ممکن ہے کہ حکومت کا تجارتی محصول کا ضابطہ مختلف صنعتوں پر آنا بوجھ ڈال دے کہ قوم کی معمولی صنعتی ترقی رک جائے۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کوئی قوم اپنے یہاں زر کے استعمال اور تجارت کے نظم و ضبط کے من مانے قاعدے بنا دے جو اس کی ترقی میں حائل ہوں۔

۱۵۸۔ حصولِ دولت کے طبعی طریقے

صنعتی نظام کی نشو و نما میں حصول دولت کے بعض طریقے مقرر کر دیئے گئے ہیں جو طبعی کہلاتے ہیں۔ ان میں سے خاص خاص طریقے حسب ذیل ہیں:۔ نئی اشیاء کا دریافت کرنا، زمین سے کوئی مفید کام لینا، خام قدرتی پیداوار سے کارآمد چیزیں بنانا بلکہ کوئی ایسی پسندیدہ چیز فراہم کرنا جو خود اپنی سعی سے یا کسی خدمت کے معاوضے میں حاصل ہوئی ہو۔ کل معاشرتی تنظیم کا یہ مقصد ہے کہ افراد ایک دوسرے کی خدمت کریں اور جو شخص دوسروں کے حقوق میں مداخلت کئے بغیر کوئی خدمت انجام دیتا ہے وہ معاوضے کا مستحق ہے۔ یہی تجارت کے معمولی طریقے ہیں جن کے ذریعے سے دولت حاصل کرنا جائز رکھا گیا ہے۔

۱۵۹۔ حصولِ دولت کے غیر معمولی اور ناجائز طریقے

اس سلسلے میں حصول دولت کے چند ایسے طریقوں کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے جو مفید پیشوں میں داخل نہیں مثلاً جوا، ٹھگبتی، چوری، سٹہ اور غیر منصفانہ وضع قوانین ان میں سے ہر ایک میں انسان دوسروں کی دولت ناجائز طریقے سے یعنے بغیر قیمت یا خدمت کے حاصل کرتا ہے۔

جب دو آدمی جوا کھیلتے ہیں اور ایک جیت جاتا ہے تو جماعت کی دولت میں کوئی زیادتی یا کمی نہیں ہوتی اور نہ اس کی کوئی خدمت انجام پاتی ہے۔ و دراصل جتنی دیر جوا کھیلنے میں مشغول رہیں اتنی دیر پیدائش دولت کے لحاظ سے بیکار رہیں بلکہ ان میں

سے ہر ایک بغیر معاوضے کے دوسرے کی دولت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ڈاکو جب کسی کے گھر میں گھستا ہے تو اس کا قصد جماعت کی دولت یا مرفہ الحالی میں اضافہ کرنے کا نہیں ہوتا بلکہ وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ جو دولت پہلے پیدا کی جاچکی ہے اس کا ایک حصہ ناجائز طریقے سے حاصل کرلے۔ سٹہ وغیرہ جب انتہا کو پہنچ جائے تو اس کا اصول معاشی اور اخلاقی حیثیت سے بالکل وہی ہوتا ہے جو قماربازی اور ڈکیتی کا۔ اس میں بھی انسان کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ دوسروں کو لوٹ لے اور جو دولت پہلے پیدا کی جاچکی ہے اس کا ایک حصہ اتفاق سے یا پیش بینی سے بغیر کسی معاوضے کے حاصل کرے۔ جب مجلس وضع قوانین کسی طرح کے دباؤ سے ایک خاص سمت میں ریل نکالے جس سے سب لوگوں کو زیر باری ہو اور معدودے چند آدمیوں کو نفع ہو یا بلدیہ مالی اثرات سے متاثر ہو کر ایسا کام کرے جس میں ایک شخص کا فائدہ اور دوسروں کا نقصان ہو تو یہ بھی معاشرے کو لوٹنے میں داخل ہے۔ اس میں عام لوگوں کا روپیہ چند آدمیوں کے نفعے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے یہ ایسا ہی ہے جیسا کسی جماعت کے ہر فرد سے روپیہ وصول کیا جائے اور جمع کر کے ایک شخص کو دے دیا جائے۔

یہ صورتیں ان مقامات پر عام ہیں جہاں سیاست صنعتی دنیا میں دخل دے کر اسے درہم برہم کردیتی ہے۔ یہ اصول دولت کے غیر صنعتی طریقے ہیں اس لئے ان کا شمار ڈکیتی، چوری، قماربازی وغیرہ کی ذیل میں ہونا چاہیئے۔ جب معاشرے کا انتظام مکمل ہو جائے گا تو یہ چیزیں معدوم ہو جائیں گی۔ یہ جدید معاشرے کی راہ میں بہت بڑی مشکل ہے۔ گو یہ عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ مدنی اور سیاسی حکومت معاشرے کے تمام افراد کی فلاح کے لئے ہونا چاہیئے لیکن اس اصول نے کہ ہر شخص بغیر دوسروں کی بہبود کا لحاظ کئے دولت جس طرح چاہے جمع کرے اور صرف کرے قدیم زمانے کی قزاقی اور رہزنی کو نئی شکلوں میں قائم رکھا ہے اور پردہ پوشی کے لئے لوگ انھیں "کاروبار" کے نام سے پکارتے ہیں۔

باب دہم

اخلاقیات کی ارتقاء

۱۶۰۔ اخلاقیات کی ماہیت

یوں تو معاشرتی زندگی میں ابتدا سے اخلاقی عمل اور اخلاقی نشو ونما کی جھلک نظر آتی ہے مگر یہ مسئلہ اس قدر اہم ہے کہ اس پر جداگانہ بحث کرنے کی ضرورت ہے۔ اسے خاندان، ریاست اور نظام اجتماعی کی دوسری صورتوں سے اس قدر گہرا تعلق ہے کہ یہ معاشرے کے وجود کے لئے ناگزیر عنصر بن گیا ہے۔ اخلاقیات میں معاشرے کے افراد کے باہمی تعلقات کی اور انسانی عمل کے خیر و شر کی بحث ہوتی ہے۔ اس کا موضوع یہ ہے کہ ہر فرد پر خود اسکی ذات کے متعلق اور دوسروں کے متعلق کیا فرائض ہیں۔ اخلاقی عمل ساری معاشرتی جد و جہد کا جزو لاینفک ہوتا ہے اس لئے اسی کو معاشرتی ترقی کی کنجی سمجھنا چاہئے۔

۱۶۱۔ اخلاقیات کی ماہیت

یہ مضمون عام موضوع کے لحاظ سے سہل اور سادہ معلوم ہوتا ہے لیکن

جب ہم اس کی تعریف کرنا یا اس کی حدود مقرر کرنا چاہیں تو مشکل پڑتی ہے یہ ساری اخلاقی زندگی پر یعنی کل خیالات، احساسات، ارادوں اور افعال پر حاوی ہے جن کا تعلق انسان اور اس کے بنی نوع کی معاشرت سے ہے اس میں خیر و شر کی بحث بھی آجاتی ہے اور یہ مسئلہ بھی کہ جماعت کے اعلیٰ معیار کے لحاظ سے انسان کا فرض کیا ہے۔

ہر جماعت کا اپنا معیار اخلاق اور ضابطۂ اخلاق ہوتا ہے۔ ابتدا میں یہ ضابطہ بن لکھا ہوتا ہے لیکن اس میں افراد کے وہ کل باہمی تعلقات آجاتے ہیں جو عموماً اخلاقی کہلاتے ہیں یہ رسم و رواج پر یا روایات پر مبنی ہوتے ہیں اگر دنیا کے مختلف اخلاقی نظام جو فلسفیوں نے مدون کئے ہیں ترتیب سے بیان کر دیئے جائیں تو یہ تاریخ اخلاقیات کہلائے گی۔ یہ افراد کے اخلاقی عمل کی نشو و نما کی تاریخ نہیں ہوتی بلکہ فلسفیوں کے خیالات کی اور اخلاقی نصب العین کے نظریوں کی۔ ارتقائی اخلاقیات البتہ ایک تاریخی سائنس کی حیثیت رکھتی ہے اور اخلاقی عمل کی ابتدا اور نشو و نما سے بحث کرتی ہے۔ اس میں یہ دکھلایا جاتا ہے کہ غیر متمدّن معاشرے میں افراد کے باہمی تعلقات کیا تھے، ایثار کی ابتدا کیونکر ہوئی اور اس نے کن مشکلوں سے رفتہ رفتہ نشو و نما پائی۔ عمرانیات کو اصل میں موجودہ اخلاقی زندگی سے سروکار ہے مگر اسی کے ساتھ اخلاقی عمل کی ارتقا سے بھی دلچسپی ہے، کیونکہ اس پر نظر ڈالنے سے جدید معاشرے کی ساخت اور اس کی جد و جہد کا ایک واضح تصور ذہن میں قائم ہو جاتا ہے۔ اخلاقیات کا یہی پہلو ہے جس سے کسی معاشرے کے اخلاقی مرتبے کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

۱۶۲۔ اخلاقیات کی ابتدا

یہ یقینی بات ہے کہ نوع انسانی میں ایک دن اخلاقی شعور کا آغاز ہوا ہوگا اس کی دو منزلیں ہیں پہلی نوعی اخلاق کی اور دوسری انفرادی اخلاق کی۔ ایک زمانہ ایسا گزرا ہوگا جب انسانی زندگی اخلاق سے خالی یا غیر اخلاقی

تھی۔ اخلاقی شعور کے اثر پڑنے سے پہلے لوگوں کا اخلاقی عمل رسم و رواج پر مبنی تھا اور اسے احساس سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس کا مقصد محض بقائے نسل تھا۔ قبائلی اخلاق رسم و رواج پر مشتمل ہے جس کی بنا ان قیود پر ہے جو بقائے نسل کی خاطر عائد کی گئی تھیں۔ وارڈ نے "نظری عمرانیات" میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اخلاقی تعلیم یا اخلاقی فلسفہ جسے بعض اوقات بڑے فخر سے "اخلاقی سائنس" کہتے ہیں اصل میں محض اخلاقی قیود کا نام ہے جو غیر متمدن نوعی اخلاق کی بچی کھچی یادگار ہیں اگرچہ معلمین اخلاق اس حقیقت سے واقف نہیں ہیں۔" معاشرے میں کم سے کم اتنا تو ہمیشہ سے ہے کہ انسان افعال و علت و معلول کے علاقہ کا مشاہدہ کرتا ہے اور ہر قسم کے طرزِ عمل پر غور کرتا ہے تاکہ ان نتائج سے محفوظ رہے جو افراد کے لئے یا پوری نسل کے لئے مضر ہیں۔ یہ چیز اخلاقی عمل کی بنیاد کا کام دے سکتی ہے۔ یعنی اگر انسان کے عمل کو قانون علت و معلول کے ماتحت منضبط کریں تو اخلاق کا اساس قائم ہو جائے گا۔

جس طرح معاشرے کے سیاسی یا مذہبی مظاہر ہوتے ہیں اسی طرح اخلاقی مظاہر بھی ہوتے ہیں ان کا مشاہدہ اسی طرح کرنا چاہئے جیسے سائنس داں طبعی مظاہر کا کرتا ہے۔ جوں جوں معاشرہ پیچیدہ ہوتا جاتا ہے یہ مظاہر بڑھتے جاتے ہیں۔ ابتدا میں ان کی تعداد بہت کم اور ان کی ماہیت بالکل سادہ تھی اس لئے آسانی سے معلوم کر لئے جاتے تھے۔ لیکن اخلاقی مظاہر کو دوسرے معاشرتی مظاہر سے جدا کرنا سہل نہیں ہے۔ بہر حال معاشرتی زندگی کے کسی شعبے کا وہ فعل جس پر نیک یا بد ہونے کا حکم لگایا جا سکے اخلاقی فعل کہلائے گا خواہ اس کا تعلق اجتماعی عمل سے ہو یا انفرادی عمل سے۔

انسان صرف سیاسی ہستی نہیں بلکہ اخلاقی ہستی بھی ہے کیونکہ جب اخلاقی عمل اس کی زندگی کا ایک وظیفۂ ادنے ہے تو اس کا اخلاقی ہستی کہلانا ناگزیر ہے۔ تو پھر ایسی صورت میں یہ قول کیونکر صحیح ہو سکتا ہے کہ کسی زمانے میں انسانی زندگی اخلاق سے خالی یا غیر اخلاقی تھی؟ اصل میں

"اخلاق سے خالی" یا "غیر اخلاقی" کی اصطلاح نوع انسانی کی اس حالت کو ظاہر کرنے کے لئے استعمال ہوتی ہے جب اس میں اخلاقی شعور موجود نہیں تھا فرد یا نسل کی بقا کے لئے جو افعال ضروری تھے وہ خود بخود بغیر کسی ردو قدح کے انجام پاتے تھے۔ لیکن جب انسان نے اس تعلق پر غور کرنا شروع کیا جو اسے اپنے بنی نوع سے تھا اور وہ احساس فرض کے ماتحت نیک و بد افعال میں تمیز کرنے لگا تو اس کے نفس میں اخلاقی شعور نے جنم لیا اور اب وہ گویا ایک نیا مخلوق بن گیا۔ ممکن ہے کہ نیک و بد میں تمیز کرنے کا احساس نوع انسانی میں بتدریج پیدا ہوا ہو اگرچہ بعض قبیلے ایسے پائے گئے ہیں جو اخلاقی شعور سے قریب قریب خالی ہیں۔ یہ اخلاقی شعور کا عمل ایک ذریعہ ہے زندگی کے بہترین عناصر کے انتخاب کا۔ اس میں انسان کی قوت انتخاب اس کے احساسات کی تحریک سے یہ فیصلہ کرتی ہے کہ کس فعل کو قبول کرنا چاہئے اور کسے رد کرنا چاہئے۔ اگر ہم اس پر غور کریں کہ معاشرے نے کن چیزوں کو انتخاب کیا ہے تو ظاہر ہو جائیگا کہ یہ عمل نوعی ترقی کے لئے کس قدر اہم ہے۔ زندگی کے نصب العین اس طرح معین ہوتے ہیں کہ نامناسب اور مضر افعال ایک ایک کر کے رد کر دئے جاتے ہیں اور صرف وہ فعل رہ جاتا ہے جو فرد یا نوع کے لئے سب سے زیادہ مفید ہو۔ یہ نصب العین سب قبیلوں اور نسلوں میں اجتماعی احساس کے ظہور کے بعد اور افراد میں اخلاقی شعور پیدا ہونے کے بعد پائے جاتے ہیں۔

۱۶۳۔ انسان کی اخلاقی ارتقا

لیکن خیر و شر کے معیار، فرد یا جماعت کے نصب العین اور معاشرہ کے اصول انتخاب اجتماعی زندگی کی ارتقا کے دوران میں بدلتے رہتے ہیں اس لئے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اخلاق میں بھی ارتقا واقع ہوئی ہے ہر قرن میں لوگوں کا معاشرتی احساس اور عمل مختلف ہوتا ہے۔ خیر و شر کا تصور وقتاً فوقتاً بدلتا رہتا ہے۔ یہ اختلاف نہ صرف مختلف قوموں کے اخلاقی

نصب العین میں پایا جاتا ہے بلکہ ایک ہی قوم کا معیار اخلاق ایک زمانہ میں کچھ اور ہوتا ہے اور دوسرے زمانے میں کچھ اور۔ سیو کسی دیسی امریکیوں[1] کے اجتماعی اخلاق اور فرانسیسی قوم کے اجتماعی اخلاق میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ مقدم الذکر کے یہاں قبیلے کی بقا کی خاطر قتل کا فن باقاعدہ سکھایا جاتا ہے اور جس منچلے نوجوان کے فتراک میں کئی سرنہ لٹکتے ہوں اس کے ہمچشموں کی نظر میں اس کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ موخر الذکر کے یہاں بقائے نسل کا ضامن قانون اور انصاف، تعلیم اور مذہب سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن اگر ہم فرانسیسیوں کی تاریخ کا، گال قوم کے زمانہ سے لے کر موجودہ زمانے تک مطالعہ کریں تو یہ نظر آئے گا کہ اخلاقی معیار میں اور خصوصاً اخلاقی عمل میں ہمیشہ تغیر ہوتا رہا ہے۔ افراد کا عمل چاہے جن احساسات اور ہیجانات پر مبنی ہو اس کے پرکھنے کے لئے ہمیشہ کوئی اجتماعی معیار موجود ہوتا ہے۔ ہر قوم کا ایک رواج ہوتا ہے، ایک بن لکھا ضابطۂ اخلاق ہوتا ہے اور پھر قوانین ہوتے ہیں جو رسم و رواج کی بنا پر مدون کئے جاتے ہیں۔

اس ماحول کا فرد کے اخلاقی عمل پر بہت نمایاں اثر پڑتا ہے۔ خود اس کا خیر و شر کا معیار چاہے جو کچھ ہو مگر اس کا عمل جماعت کے اخلاقی معیار کا پابند ہوتا ہے گو اس میں بھی خالص اخلاق اور دستور میں بہت فرق ہوتا ہے۔ بہت سے افراد جو عمل کرتے ہیں محض اس لئے کرتے ہیں کہ دستور یہی ہے چاہے ان کے ضمیر کا تقاضہ کچھ اور ہو۔ بعض صورتوں میں اخلاق اور دستور ایک ہو جاتے ہیں یعنی فرد کے اخلاقی اعمال معاشرے کے رواج کے مطابق ہوتے ہیں۔ ممکن ہے ایک شخص کا ضمیر یہ کہتا ہو کہ فلاں کام میری زندگی یا میری سیرت کے لئے مضر نہیں ہے اس لئے اس کے کرنے میں کوئی ہرج نہیں لیکن اگر وہ فعل معاشرے کے دستور کے خلاف ہے اور اس سے نظم اجتماعی میں خلل پڑتا ہے یا دوسرے انسانوں کے باہمی تعلقات کو کسی قسم کا ضرر

---

[1] Sioux Indians

پہنچتا ہے تو وہ منافی اخلاق سمجھا جائے گا۔ مثلاً اگر گرجے میں پادری کا وعظ ہو رہا ہو اور سامعین کی صف میں سے کوئی شخص یہ قصد کرے کہ میں اٹھ کر وعظ کے متعلق سوالات کروں تاکہ سننے والے اس کے موضوع کو اچھی طرح سمجھ جائیں تو انفرادی نقطۂ نظر سے اس کا یہ فعل سراسر مطابق اخلاق ہے لیکن جب ہم اس پر غور کریں کہ رسم عبادت پر اور حاضرین کی جماعت پر اس کا کیا اثر پڑے گا تو ممکن ہے کہ دستور کے نقطۂ نظر سے اس کے نتائج برے ثابت ہوں۔ اس لئے اس صورت میں دستور کی خلاف ورزی منافی اخلاق سمجھی جائے گی۔

۱۶۴۔ اخلاقی عمل کی نشوونما جذبۂ ہمدردی کی بدولت

انسانی احساسات سے جو اخلاقی قوتیں پیدا ہوتی ہیں ان کا سرچشمہ وہ محبت اور ہمدردی ہے جو ماں کو بیٹے سے ہوتی ہے۔ اس ہمدردی کا دائرہ رفتہ رفتہ وسیع ہوتا گیا اور اس میں ماں کے علاوہ اور قریبی عزیز اور دوسرے لوگ جو اسی گھر میں رہتے تھے شامل ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ اس نے قبیلے کے کل افراد کو جو مل جل کر رہتے تھے گھیر لیا۔ آگے چل کر یہ ہمدردانہ عمل کا وسعت پذیر دائرہ اتنا پھیلا کہ پورے معاشرے کو، جو ایک خاص خطے میں آباد تھا اور نظم اجتماعی کے رابطے سے مربوط تھا، محیط ہو گیا یہیں سے حب وطن کی ابتدا ہوتی ہے یہ اس محبت کا نام ہے جو انسان کو اپنے ملک سے، اس کے رہنے والوں سے اور اس کے رسم د آئین سے ہوتی ہے۔ حب وطن کی اعلےٰ شکل ہر ملک اور ہر قوم کے مصیبت زدوں کی دستگیری کرتی رہی ہے۔ ایثار کا دائرہ اتنا وسیع ہو گیا ہے کہ ساری دنیا کی مصیبت میں ہمدردی کرنا فرض سمجھا جاتا ہے، آج ایک عالمگیر ضابطۂ اخلاق موجود ہے جو تمام کرۂ زمین کو محیط ہے، ربع مسکون کے کل باشندوں کے حقوق کو تسلیم کرتا ہے اور بہت سے بیکسوں کی فریاد کو پہنچتا ہے۔

۱۶۵۔ معاشرتی نشوونما میں ایثار اور استیثار کا مقابلہ

انسان کی انفرادی زندگی اور راحت ہمیشہ قانون بقائے اصلح کی پابند

رہی ہے ابتدا ہی سے اسے تنازع للبقا میں فطرت کی قوتوں سے الجھنا پڑا ہے اپنی ہستی کو قائم رکھنے کے لئے اس نے خارجی طبعی ماحول کو مسخر کیا اور جہاں یہ نہیں کر سکا وہاں خود اپنی زندگی کو اس ماحول کے مطابق بنایا۔ لیکن ہر صورت میں اس کے عمل کی محرک وہی تسخیر کی کشمکش ہے جو بقا کی خواہش پر مبنی ہے۔ سچ پوچھئے تو اسی سعی پیہم نے انسان کو انسان بنا دیا۔ اس کی کشمکش صرف فطرت کی قوتوں کی تسخیر تک محدود نہیں رہی بلکہ اسے اپنے بنی نوع سے بھی غلبہ و اقتدار کے لئے جنگ کرنا پڑی۔ بعض صورتوں میں تو یہ جنگ بھی تنازع للبقا کی شان رکھتی تھی جس میں بے شمار انسانوں میں سے معدودے چند سلامت رہے۔ انسان کی ابتدائی کشمکش زیادہ تر استیثار پر مبنی تھی اور اس کی زندگی ہمیشہ اس جذبہ سے متاثر رہی۔

نوع انسان کی تاریخ کے ابتدائی یا غیر متمدن عہد میں استیثار کا غلبہ تو ضرور تھا مگر ایثار کی بھی خفیف سی جھلک نظر آتی تھی۔ ابتدا میں اس جذبے کی بنیاد کمزور اور ناپائیدار تھی مگر رفتہ رفتہ یہ قوت پکڑتا گیا اور اس کے اثر کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔ غرض انسان کے دل میں بقائے نفس اور بقائے نوع کی خواہش ہمیشہ پہلو بہ پہلو موجود رہی۔ ابتدا میں پہلی خواہش زیادہ قوی تھی مگر بتدریج دوسری کا زور بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ پہلی پر غالب آگئی۔ آج استیثار یعنی دوسروں سے اپنی راحت و بہبود کا خیال جدید معاشرتی زندگی کا بہت اہم جز بن گیا ہے۔ ذاتی اغراض اجتماعی اغراض میں جذب ہوگئی ہیں۔ اس لئے جب ہم انسان کی ارتقا پر انفرادی تنازع للبقا کے لحاظ سے نظر ڈالیں تو یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اس کے وحشی جانوروں اور فطرت کی قوتوں پر فتح پانے کا راز یہ ہے کہ وہ دوسروں کے ساتھ مل جل کر رہنے اور مشترکہ اغراض کی حفاظت کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ بغیر اس معاشرتی اتحاد کے انسان ہلاک ہو جاتا اور آج نوع انسانی کا نام و نشان بھی نہ ہوتا۔ غرض ایثار بھی انسانی معاشرے کی نشو و نما کا ایک عنصر رہا ہے اب یہ بھی استیثار کی طرح تنازع للبقا کے عمل اجتماعی کا ایک جز بن گیا ہے۔ اس کی نشو و نما معاشرے کی ابتدائی سادہ زندگی سے موجودہ پیچیدہ زندگی تک مسلسل رہی ہے۔

دوسری طرف معاشرہ بھی بہ حیثیت مجموعی فرد سے ہمدردی رکھتا ہے کیونکہ جو شخص مصیبت میں مبتلا ہو اُس کی طرف ساری جماعت کی توجہ اور ہمدردی مبذول ہو جاتی ہے۔ جس کسی کی زندگی مورد ہلاکت یا مورد ظلم ہوتی ہے اس کی حمایت کل معاشرہ کرتا ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایثار کا تصور معاشرتی زندگی کا جزوِ لاینفک بن گیا ہے اور انفرادی اور اجتماعی اغراض کی ہم آہنگی ناگزیر ہو گئی ہے۔ ایک طرف تو فرد کے لئے ضروری ہے کہ معاشرے کے سارے مطالبات کو پورا کرے، دوسری طرف معاشرے کا فرض ہے کہ فرد کو بقا اور ترقی کا موقع دے دونوں کی اغراض کا صحیح توازن جدید معاشرتی زندگی کا وسیلِ راہ ہے۔ اجتماعی اور انفرادی اغراض کی ہم آہنگی کو، جو ایثار کی زندگی کی بہترین شکل ہے، مکمل معاشرے کی اہم ترین خصوصیت سمجھنا چاہیئے۔

۱۶۶- عدل و انصاف کی نشو و نما-

جس طرح ایثار کا سرچشمہ ہمدردی ہے اسی طرح عدل کا بھی ہے اصل میں عدل کا جذبہ راحت و الم کے احساس ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ ہم کسی طرز عمل کو اپنی ذات کے لئے جائز یا ناجائز سمجھتے ہیں اور اس احساس کے دائرے کو وسیع کر کے اس میں اپنے بنی نوع کو بھی شامل کر لیتے ہیں ہم جس پیمانے سے اپنے آپ کو ناپتے ہیں اسی سے اُنکو بھی ناپتے ہیں جب کسی شخص کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اُس کے ساتھ بے انصافی کی گئی تو اُس کے دل میں آزردگی کا جذبہ اُٹھتا ہے اگر وہ یہی بے انصافی کسی دوسرے کے ساتھ ہوتے ہوئے دیکھتا ہے تب بھی اسی طرح آزردگی کا احساس پیدا ہوتا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عدل کی جڑ ہمدردی پر ہے۔ لیکن زیادہ ترقی یافتہ صورت میں یہ تحفظ نفس کے عمل پر مبنی ہوتا ہے جو اجتماعی تحفظ میں ضم ہو گیا ہے۔ اس کا اصل اصول یہ ہے کہ ہر شخص کو اُس کے صحیح حقوق دئے جائیں اور اس کے جائز مطالبات پورے کئے جائیں تاکہ کل جماعت

محفوظ رہے گو اس کی ابتدا ہمدردی سے ہوئی ہو مگر بہت جلد اس پر عقلی جدوجہد کے اخلاقی پہلو کا اثر غالب آگیا۔ یہ اس چیز کے نظم و ضبط کی کوشش تھی جسے نفسیات کے اصلاح میں فریب کہتے ہیں۔

وارڈ کا دعویٰ ہے اور دوسرے بھی اس کی تائید کرتے ہیں کہ عقلی عمل کا طبعی طریقہ فریب ہے۔ بقائے نفس میں بھی جو انسان کے نفس حیوانی کی سب سے قوی جبلت ہے، فریب سے کام لیا گیا ہے۔ بقول وارڈ کے "یہ حیلہ فریب کی سب سے سادہ شکل ہے اور اس سے یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ جس حد تک نفس کو ذی روح مخلوقات سے سابقہ ہوتا ہے فریب اس کی فطرت میں داخل ہے"۔ عام حیوانی زندگی کے اس کلیہ کی تصدیق اس فریب سے ہوتی ہے جو شکاری جانور اپنے شکار کے پکڑنے میں کرتے ہیں۔ خرگوش، لومڑی سے تیز دوڑتا ہے، یا بھٹ میں چھپ کر بچ جاتا ہے اس لئے لومڑی کے لئے ضروری ہے کہ اپنے شکار کی طرف چھپ کر دبے پاؤں بڑھے۔ بلی چوہے کو یا عقاب اپنے شکار کو بغیر فریب کے کبھی نہیں پکڑ سکتا۔ انسان بھی مچھلی پکڑنے میں یا شکار کرنے میں حیلے اور فریب سے کام لیتا ہے جن میں ادنیٰ جانوروں کے حیلوں سے کسی قدر مکاری زیادہ ہوتی ہے۔ وہ مچھلی پکڑنے کے لئے چارہ لگاتا ہے اور دوسرے جانوروں کو پھندے سے پکڑتا ہے۔ اس اعتبار سے وہ "شکاری گوشت خور جانور" ہے۔ اس سے آگے بڑھئے تو یہ نظر آتا ہے کہ وہ جانوروں سے کام لینے کے لئے انھیں پالتا ہے۔ انھیں سدھانے کے لئے ضروری ہے کہ وہ بچپن میں پکڑے جائیں اور غذا اور مناسب تربیت کی مدد سے انسان کی مرضی کے مطابق کام کرنے کے لئے تیار کئے جائیں۔ انسانوں سے کام لینے میں بھی یہی اصول برتا جاتا ہے۔ گو غلامی ایک حد تک تشدد کا نتیجہ ہے مگر بعض اوقات لوگوں کو غلام بنانے میں فریب سے بھی کام لیا گیا ہے۔ معاشرے کی جدید شکلوں میں خواہ وہ پادریوں کی حکومت ہو یا بادشاہ کی یا امرا کی، معدودے چند لوگ جن کے ہاتھ میں قوت ہوتی ہے فریب کو کام میں لاکر اور سب سے خدمت لیا کرتے

تھے۔ صنعتی و تجارتی دنیا میں جہاں مقابلے کا زور ہے فریب کاروبار کا ایک مستقل عنصر رہ چکا ہے۔ آج اگرچہ قوانین، ضابطۂ اخلاق اور انصاف پسندی کی بدولت کاروبار میں بہت کچھ نظم و ضبط پیدا ہو گیا ہے پھر بھی ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے لوگ دوسروں کو فریب دے کر کامیاب اور دولتمند بنجاتے ہیں۔ بڑے کاروبار میں بہت سے لوگوں کی ترقی کا راز یہی ہے کہ وہ دوسروں سے زیادہ چالاکی سے کام لیتے ہیں۔ اسی طرح اپنے مفید مطلب موقع نکالنا، فطرت کے ذخیروں پر قابض ہو جانا، خفیہ معاملہ کرنا، فائدے کی مقدار غلط بتانا اور بہت سے ذرائع جن سے انسان کامیابی حاصل کیا کرتے ہیں فریب میں داخل ہیں۔

اور سیاست میں جس فریب سے اکثر کام لیا جاتا ہے وہ بھی کچھ اس سے بہت مختلف نہیں ہے۔ یہ بھی ایک جنگ ہے جس میں دشمن کو دھوکا دینے کا پورا حق ہوتا ہے۔ کسی کو فریب دینا، کسی کو بیوقوف بنانا، فریق مخالف کو ہر جائز و ناجائز طریقے سے زک دینا یہی آج کل کی سیاست میں کامیابی کی تدبیریں سمجھی جاتی ہیں۔ اعلیٰ درجے کی حکومتوں کے یہاں بھی جنگ اور حکمت عملی فریب کی منظم اور باقاعدہ شکلیں ہیں۔ اسی طرح روزمرہ کے سابقے میں لوگ اپنی ذات کی بقا اور اپنی شخصیت کی حفاظت کے لئے چھوٹی چھوٹی باتوں میں دھوکا دیتے ہیں۔ یہ مسئلہ کہ یہ چیزیں کہاں تک روا ہیں اب تک فیصل نہیں ہوا۔ بہت سے لوگ اس کے مخالف ہیں اور اسے کسی طرح جائز نہیں سمجھتے حالانکہ وہ خود چھوٹی چھوٹی باتوں میں فریب سے کام لیتے ہیں ماں اپنے بچے کی سادگی سے فائدہ اٹھا کر اسی کے بھلے کے لئے اس کی رہنمائی کرتی ہے۔ پادری اپنے حلقے کے لوگوں یا اعتراف گناہ کرنے والوں کی جہالت سے فائدہ اٹھا کر انھیں سیدھی راہ پر چلاتا ہے۔ وکیل اپنا مقدمہ جیتنے کی کوشش کرتا ہے چاہے وہ دل میں یہ محسوس کر رہا ہو کہ مجھے فریق مخالف کی طرف سے پیروی کرنے میں زیادہ آسانی ہوتی۔ اس قسم کے فریب کی روک تھام عدالت کو کرنا چاہئے۔

۱۶۷- فطری انصاف کا آغاز

فلسفیوں نے فطری نظام انصاف کے متعلق بہت کچھ کہا ہے۔ اس میں کسی حد تک اصلیت بھی ہے مگر بہت بڑا حصہ غلط اور گمراہ کرنے والا ہے کیونکہ فطری انصاف اصل میں جسمانی طاقت کے قانون کا نام ہے۔ یہ محض ایک خود غرضانہ تنازع للبقا کی حالت تھی اور اس میں "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" کے اصول پر عملدرآمد ہوتا تھا۔ انسان جتنا کچھ لے سکتا ہے لے لیتا ہے اور اس پر قابض رہتا ہے۔ فطری انصاف میں انفرادی ملکیت کا اصول بس اس حد تک چلتا ہے کہ انسان جتنی زمین یا اشیاء دوسروں کے پنجے سے بچا کر رکھ سکے وہ اس کی ملکیت ہے۔ جب دو آدمیوں میں نزاع ہو تو فیصلہ اس طرح ہوتا ہے کہ قوی فریق کمزور فریق کو دبا کر اس کا مال چھین لیتا ہے یا اسے مار ڈالتا ہے۔ یہ ہے فطری انصاف کی اصلیت۔ فطری حقوق اور فطری انصاف کا وجود جسے فلسفی عرصے تک مدنی انصاف کا اساس قرار دیتے رہے محض ایک بے بنیاد تصور تھا۔ افراد کا باہمی تعلق ایک طرح کی معاشرتی حرکیات کے ماتحت تھا جسمیں ہر فرد کے افعال دوسروں کے عمل اور ردِ عمل، جذب اور دفع کے پابند تھے۔ انسان کی فطری زندگی کی ہمیشہ یہی حالت ہوتی ہے۔ وہاں یہ سوال نہیں ہے کہ افراد کے باہمی تعلقات میں کون چیز جائز ہے اور کون ناجائز ہے بلکہ فطری انصاف کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ قوی عناصر باقی رہ جاتے ہیں۔

۱۶۸- فطری انصاف سے مدنی انصاف کی طرف انتقال

معاشرہ فطری انصاف سے مدنی انصاف کی طرف بہت آہستہ آہستہ منتقل ہوا۔ اس انتقال کی ابتدا تو جذبہ ہمدردی کے روز افزوں اثرات سے ہوئی مگر اس کا سبب سے قوی عنصر عقل و فہم کی ترقی تھی کیونکہ اس کی بدولت افعال کی ماہیت کا مشاہدہ وضاحت سے کیا جا سکتا ہے۔ صحیح طرزِ عمل اختیار کرنے کے لئے صرف ہمدردی کافی نہیں بلکہ عقل کی رہنمائی اور نظم و ضبط کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ فطری انصاف کو نہ تو اس سے غرض ہوتی ہے کہ افراد پر کیا مصیبتیں پڑتی ہیں اور نہ اس سے کہ لوٹ مار کے کیا نتیجے ہوتے ہیں۔ ان چیزوں کا ادراک ہمدردی اور

فہم و فراست ہی کے ذریعے سے ہو سکتا ہے۔ جب افعال کے نتیجوں کا اندازہ ہوتا ہے کہ اور یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ کون سا کام ممکن ہے اور کونسا ناممکن ہے تو انفرادی عمل پر قیود عائد کئے جاتے ہیں تاکہ جماعت کی حفاظت کے ذریعے سے افراد کی حفاظت کی جا سکے۔ مثلاً اگر مشاہدے سے یہ معلوم ہو کہ مزاج کی حالت میں معاشرے کے برباد ہو جانے کا خوف ہے تو مدنی انصاف کے ذریعہ سے افراد کے حقوق و فرائض معین کر دیئے جاتے ہیں۔ نتائج کا صحیح اندازہ ہونے سے اخذِ دولت کی قوت آہستہ آہستہ محدود کر دی جاتی ہے۔ اس کی وجہ سے معاشرے میں ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے اور افراد کی قوت عمل پوری جماعت کی سلامتی اور راحت کے لئے صرف ہوتی ہے۔ تنازع للبقا کی تاریکی سے مدنی انصاف کی روشنی نمودار ہوتی ہے۔ وحشیانہ انفرادی کشمکش حیات کے پردے سے سیاستِ مدن کا ظہور ہوتا ہے جو فرد اور جماعت کی بقا اور بہبود کی ضامن ہے۔

۱۶۹۔ مدنی انصاف کی نشو و نما

جب ایک مرتبہ فرد اپنی غیر محدود آزادی عمل کو، جیسے دوسروں کی اغراض سے سروکار نہیں ہوتا، ترک کر دیتا ہے اور اجتماعی رسم و رواج یا قانون کو اپنا دلیل راہ بنا لیتا ہے تو پھر مدنی انصاف کی نشو و نما بہت تیزی سے ہوتی ہے۔ معاشرے کے اخلاقی احکام قانون کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور تھوڑے دن کے بعد فرد کا کوئی حق نہیں رہتا۔ سوائے ان حقوق کے جو جماعت عطا کرتی ہے۔ معاشرہ عقل و فہم کی مدد سے اجتماعی بقا اور بہبود کا ذمہ دار ہو جاتا ہے۔

بہت سے ایسے موثرات ہیں جو مدنی معاشرے کو عقل کی مدد سے کامل ترقی نہیں کرنے دیتے۔ مثلاً جب عقل کی بدولت انسان کو علت و معلول کا علم حاصل ہوتا ہے تو اس کی خواہشیں اور خواہشوں کے ساتھ ترغیبات بھی بڑھ جاتی ہیں اور حظِ نفس کے موقعے بھی زیادہ ملتے ہیں۔ لیکن عقل و دانش سے ترغیبات پر غالب آنے کی قوت میں بھی اضافہ ہوتا ہے اس لئے توازن قائم رہتا ہے۔ اگر اسی کے ساتھ ہمدردی یا ایثار بھی بڑھ جائے تو اتنا ضبطِ نفس پیدا ہو جاتا ہے کہ افراد کے باہمی تعلقات پہلے سے بہتر ہو جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات یاد رکھنا چاہیئے کہ عارضی انفرادی اغراض

کا اجتماعی اغراض سے یا خود افراد کے مستقل اغراض سے مطابق ہونا ضروری نہیں۔ ممکن ہے کہ کوئی فرد اپنے عارضی فائدے کی خاطر اجتماعی مفاد کو قربان کر دے لیکن اگر سب ہی کرنے لگیں تو جماعت نیست و نابود ہو جائے گی۔

برخلاف اس کے اگر ہر فرد جماعت کی فلاح و بہبود کی سعی کرتا ہے تو آخر میں انفرادی اغراض خود بخود محفوظ ہو جاتی ہیں۔ تاہم مدنی انصاف کی عملداری آمد میں کبھی کبھی قدیم وحشیانہ زندگی یعنی فطری انصاف کی جھلک بھی نظر آ جاتی ہے۔ مثلاً جب معاشرتی رسم و آئین کی سختیاں زیادہ بڑھتی ہیں تو کمزور اخلاق والے ارادۂ اجتماعی کی اطاعت سے سرتابی کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، اور مدنی اور اخلاقی قوانین کی زد سے بچنے کی فکر کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں وہ مجرم قرار پاتے ہیں۔ چنانچہ جوں جوں معاشرہ ترقی کرتا ہے جرائم کی سطح پست ہوتی جاتی ہے۔ جو چیزیں پہلے جائز تھیں وہ اب ممنوع قرار پاتی ہیں کیونکہ معاشرتی زندگی کے پیچیدہ ہو جانے سے انفرادی عمل پر اور زیادہ قیود عائد کرنا پڑتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جن لوگوں میں معاشرتی احساس مفقود ہے وہ قانون کی مزاحمت یا اس کی زد سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مگر اس کوشش میں پہلے کے مقابلے میں حیوانی قوت سے کم اور چالاکی سے زیادہ کام لیا جاتا ہے۔ لوگ ایک دوسرے کو جسمانی حیثیت سے نہیں بلکہ ذہنی حیثیت سے دباتے ہیں۔ جسمانی تشدد کی روک تھام ہوتی ہے مگر نفسی اقتدار کی کشمکش جاری رہتی ہے۔ اس کی مثالیں زیادہ تر تجارت اور کاروبار میں نظر آتی ہیں جہاں مقابلے کا دور دورہ ہے۔ ہر شخص دوسروں سے بڑھ جانے کی کوشش کرتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج کل کاروبار میں بہت سے ایسے طریقے رائج ہیں۔ جو اس زمانے کے اخلاقی معیار کے لحاظ سے قابل اعتراض ہیں۔ ان حیوانی مکائد کے مضر اثرات سے افراد کو محفوظ رکھنے کی صرف یہی صورت ہے کہ حکومت ایسی ہو جو سب کے ساتھ انصاف کرے اور اخلاقی اصول کو قوانین کی شکل میں مدون کرے۔

سچ پوچھئے تو حکومت کا سب سے بڑا مقصد عدل و انصاف ہی ہے اور اس کا فرض تبھی پورا ہوگا جب وہ ساری صنعتی دنیا کے حقوق کی ضامن ہو اور اس قزاقانہ طرز عمل کا جو حصول دولت میں برتا جاتا ہے استیصال کرے۔ صنعتی یا معاشی انصاف

نوعِ انسانی کی فلاح کے لئے اتنا ہی ضروری ہی جتنا مدنی یا سیاسی انصاف بلکہ آج کل اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔ کیونکہ ہمارا عہد اس عظیم الشان اصلاحی تحریک کا آخری دور ہے جو نشاۃ ثانیہ کے ساتھ شروع ہوئی تھی۔ اس کا آغاز ذہن اور خیال کی آزادی سے ہوا۔ اس کے بعد تجدید مذہب کی باری آئی جس نے مذہبی عقیدے کی آزادی بخشی۔ پھر سیاسی انقلاب اور سیاسی آزادی کا دور دورہ ہوا۔ اب اس کشمکش کا چوتھا دور یعنی صنعتی آزادی کا زمانہ آیا ہے۔ جب یہ چیز حاصل ہو جائے گی تو اخلاقی معاشرے کی آخری فتح کا ڈنکا بجے گا۔

باب یازدہم

مذہب بہ حیثیت ایک معاشرتی عنصر کے

۱۷۰۔ مذہب کا اثر معاشرتی زندگی پر

مذہب کو معاشرتی ارتقاء خصوصًا قبائل کی تنظیم اور نسلوں کی تفریق میں جو اہمیت حاصل ہے اسے تقریبًا سب عمرانیوں نے تسلیم کیا ہے۔ بعض نے تو اس پر اتنا زور دیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک غیر متمدن نسلوں کے معاشرتی اتحاد کا سب سے بڑا عنصر یہی تھا۔ کچھ ایسے بھی ہیں جنھوں نے اسے ناقابل توجہ سمجھا ہے یا معاشرتی ترقی میں مزاحم قرار دیا ہے۔ ان دونوں میں سے کوئی رائے بھی صحیح نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مذہب نے معاشرتی اتحاد پیدا کرنے میں اور معاشرتی رسم و آئین اور نظم و ضبط کی نشو و نما میں بہت مدد دی ہے۔ مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ معاشرے کی ابتدائی تنظیم کی بنیاد صرف اسی پر تھی یا یہ اس کا سب سے اہم عنصر تھا۔ اب رہی یہ بات کہ مذہب معاشرتی زندگی کی ارتقا میں حائل ہوتا ہے تو ممکن ہے کہ حضرات فلاسفہ تہذیب و تمدن کو ترقی دینے کا مذہبی تنظیم سے بہتر طریقہ نکال سکیں۔ مگر معاشرتی ارتقاء کوئی نظریہ نہیں جس میں خیال آرائی کی گنجایش ہو بلکہ ایک نفس الامری حقیقت ہے اور معاشرے کی تاریخی نشو و نما کا مطالعہ کرنے والے کو

یہ نظر آتا ہے کہ اس کے ہر دور میں مذہب کا عنصر موجود رہا ہے اور یہی نہیں بلکہ اسے ہمیشہ اہمیت حاصل رہی ہے۔ اور اس کی ایک عجیب خصوصیت یہ ہے کہ ایک طرف تو اس سے نسلوں کی تفریق میں اور جماعتوں کی جداگانہ نشوونما میں مدد ملی اور دوسری طرف معاشرے کے باہمی اتحاد کو بڑی تقویت پہونچی۔ یعنے اس سے قبیلے یا معاشرے کی اندرونی زندگی میں ہم آہنگی پیدا کردی۔

۱۷۱۔ غیر متمدن قوموں کے مذہبی عمل کی ناتراشیدگی اور یکتائی

مگر خود مذہب کی ترقی کی رفتار بہت سست ہے۔ گو یہ ابتدائی انسانی معاشروں میں برابر موجود رہا۔ مگر اس کی پہلی شکلیں بالکل ناتراشیدہ تھیں اور کوئی خاص تنظیم نہیں پائی جاتی تھی۔ مگر آج تک کسی ایسے قبیلے کا پتہ نہیں چلا جس میں مذہبی عقائد موجود نہ ہوں۔ بعض محقق سیاحوں نے جاکر غیر متمدن قبیلوں کو دیکھا اور سطحی تحقیق کے بعد کہہ دیا کہ ان میں کسی قسم کا مذہبی عقیدہ یا عمل موجود نہیں لیکن جب زیادہ غور سے چھان بین کی گئی تو اس کی تردید ہوگئی۔ قبایلی زندگی میں فریب کا رواج عام ہے اس لیے محض سرسری واقفیت سے وحشی یا غیر متمدن قوموں کی مذہبی زندگی کا پتہ چلنا ناممکن ہے۔ بلکہ جو لوگ برسوں وحشیوں کے ساتھ رہے ہیں اور ان کی قبائلی زندگی کا بہت غور سے مطالعہ کرتے رہے ہیں انھیں بھی ان کے مذہبی عقاید اور اعمال کا وضاحت کے ساتھ تعین کرنے میں بڑی دقتیں پیش آئیں۔

غالباً سب سے پہلا مذہبی خیال عالم آخرت کا تصور تھا۔ یہ عقلی دلایل پر نہیں بلکہ جبلت اور احساس پر مبنی ہے۔ یہ معلوم نہیں کہ یہ تصور کیونکر پیدا ہوا البتہ قیاس سے کام لیا جاسکتا ہے۔ اسپنسر کہتا ہے کہ اس کی بنا خوابوں پر اور اس دوئی کے احساس پر ہے جو فرد کی جسمانی اور روحانی زندگی میں پائی جاتی ہے۔ یہاں ہمیں اس سے بحث نہیں کہ اس کی ابتدا کیوں کر ہوئی بلکہ صرف اس پہلو پر زور دینا منظور ہے کہ غیر متمدن قوموں میں بھی ایک طرح کی مذہبی زندگی موجود تھی۔ تاہم یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ جب انسان نے دیکھا ہوگا کہ جسم کا فعل ہمیشہ نفس کے ارادے کے مطابق نہیں ہوتا یا نیند میں جسم بے حس وحرکت ہوتا ہے

مگر نفس کا عمل جاری رہتا ہے تو اسے ایک ایسی زندگی کا شعور ہوا ہوگا جو حسیات کی زندگی سے مختلف ہے۔

جب یہ معلوم ہو گیا کہ فرد کی ذات میں ایسی چیز موجود ہے تو فطرت کے ان تمام مظاہر کی جن کی علت نظر نہیں آتی تھی، توجیہ سہل ہو گئی۔ یہ سب چیزیں ایک غیر مرئی قوت یعنے روح کی طرف منسوب کی جانے لگیں۔ اس خیالی وجود کے تسلیم کرنے کا فرد کے خیالات اور جذبات پر بڑا زبردست اثر پڑا۔ اس کے افعال اور دوسروں کے ساتھ اس کے تعلقات اس سے بہت متاثر ہوئے۔ اس روح فطرت اور خارجی اشیاء میں جو علاقہ سمجھا جاتا تھا۔ اس کی بنا پر آگے چلکر ایک غیر مہذب فطرت پرستی کا رواج ہو گیا۔ فطرت کے متعدد وظایف اور اعمال کے لحاظ سے لوگ بہت سی روحوں کو ماننے لگے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں۔ ان وحشیوں کا ذہن غیر منظم اوہام پرستی سے منظم اوہام پرستی تک پہونچ گیا۔

اب لوگوں نے سوچا کہ یہ روحیں انسان کی ہلاکت اور نجات میں اس قدر دخل رکھتی ہیں تو ان کا قرب حاصل کرنا چاہئے اور ان سے کام نکالنا چاہیے اس طرح سے انسان کی فلاح کے لیے روحوں کی تسخیر اور دفع دخل کا تصور پیدا ہوا۔ اور اس پر غور کیا جانے لگا کہ روحیں کن چیزوں سے اور کن افعال سے خوش ہوتی ہیں۔ ان غیر مرئی قوتوں کو راضی کرنے کے لیے کھانے پینے کی چیزیں چڑھائی جانے لگیں، طرح طرح کی رسمیں ہونے لگیں اور قبیلے کے طرز عمل میں تبدیلی کی گئی۔ اب یہ معلوم ہوا کہ بعض نیک روحیں ہیں جنھیں قبیلے کی فلاح و بہبود مد نظر ہے اور بعض بد ہیں جو اس کی ہلاکت کے در پے ہیں۔ اس لیے یہ ضروری سمجھا گیا کہ پہلی قسم کی روحوں کی پرستش اور ستائش کی جائے اور دوسری قسم کی روحوں کو چڑھاوے اور نذر سے راضی کر کے ہلاکت کے ارادے سے باز رکھا جائے۔ اسی کی بنا پر آگے چل کر حسین اور مبارک روحوں کا تصور پیدا ہوا جو انسان کی روح کو دائمی مسرت کے گھر میں لے جاتی ہیں اور خوفناک شریر اور مہلک روحوں کا جو اُسے تاریکی اور عذاب کے قعر میں گراتی ہیں۔

۱۷۲۔ طبیب اور پُجاری کی خدمات

غیر متمدن قوموں کے معاشرتی نظم و ضبط میں طبیب یا پُجاری کو بہت بڑا دخل تھا۔ بعض لوگوں کا دعوے تھا کہ ان میں روحوں کو راضی کرنے کی قوت زیادہ ہے۔ جب ان کی یہ قوت اور برتری تسلیم کر لی گئی تو یہ خدمت انھیں کے سپرد ہو گئی۔ اس عقیدے کی بنا پر کہ بیماری کی بلا بُری روحوں کی طرف سے آتی ہے یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس کا علاج وہی شخص کر سکتا ہے جو ان روحوں کو راضی کر سکے۔ چنانچہ پجاری اور طبیب یا معالج کا کام ایک ہی شخص کرتا تھا۔ آگے چل کر یہ خدمات جدا ہو گئیں۔ مذہبی پرستش کا سرانجام پجاری کرنے لگا اور علاج کا کام طبیب کرنے لگا۔ لیکن یہ تفریق بہت آہستہ آہستہ ہوئی کیونکہ بیماری کا تعلق بُری روح سے ہونے کا عقیدہ معاشرتی ارتقا میں مدتوں سے برابر چلا آرہا تھا۔ اس سلسلے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ چونکہ پجاری یا طبیب کا تعلق غیر مرئی قوتوں یعنی روحوں سے سمجھا جاتا تھا اس لیے سارے قبیلے پر اس کی حکومت تھی۔ جو حکم وہ روحوں کی طرف سے دیتا تھا اس کی تعمیل لازمی تھی۔ قبیلے کے پاس خور و نوش کا جو کچھ سامان تھا اُس پر سب سے پہلا حق اسی کا تھا اور اس نے بہت جلد دوسروں سے اپنی خاطر تواضع کرانے کا گر سیکھ لیا۔ معاشرتی نظم و ضبط کا یہ طریقہ مذہب کی ترقی کے ساتھ نشو و نما پاتا رہا یہاں تک کہ نیم متمدن قوموں کی حکومت میں پجاریوں کو بڑا زور ہو گیا۔ مصر، اشوریا[1] اور فلسطین میں پجاریوں کا طبقہ نظمِ اجتماعی کا سب سے قوی عنصر تھا بلکہ جدید تمدن میں بھی پجاریوں اور مذہبی پیشواؤں کو قوموں کی حکومت میں بہت کچھ دخل رہا ہے۔

۱۷۳۔ مذہبی رسوم و عبادات

یہ عقیدہ کہ روح مرنے کے بعد سفر کرتی رہتی ہے تجہیز و تکفین کی رسوم

---

[1] (Assyria)

کا باعث ہوا اوران رسوم سے نظمِ اجتماعی کی بنیاد پڑی۔ ایک رسم یہ تھی کہ مردے کے لئے قبر میں کپڑے اور اوزار وغیرہ رکھ دیئے جاتے تھے اور اس کے کھانے کے لئے غذا بھی قبر کے قریب رکھی جایا کرتی تھی۔ اس کی بدولت جماعت کے لوگ ایک مقام پر جمع ہونے لگے اور ایک مشترک معاشرتی کام کم وبیش قاعدے اور ترتیب کے ساتھ کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ ان رسموں سے مستقل مذہبی عبادات کی بنیاد پڑی کیونکہ ان چیزوں کا تعلق مُردوں پر حکومت کرنے والی روح سے سمجھا جاتا تھا۔ مُردوں کی روح کو مدد پہنچانے کی کوشش میں ایک طرف تو روحوں کا خوف اور دوسری طرف ان کی عبادت کا خیال پیدا ہوا۔ روح یا دیوتا سے مرنے والوں کی حفاظت کی التجا دُعا کی شکل میں ظاہر ہوئی اور اُسے خوش کر کے اس کی مدد حاصل کرنے کی کوشش نے عبادت کی صورت اختیار کی۔ بُری روحوں کو قابو میں لانے کی غرض سے سحر و نیرنجات کی ابتدا ہوئی۔ یہ سیدھے سادے اعمال رفتہ رفتہ باضابطہ رسوم بن گئے اور بڑی دھوم دھام سے انجام پانے لگے۔

۱۷۴۔ ارواح اور مظاہرِ فطرت

لوگوں کا عقیدہ تھا کہ مظاہرِ فطرت میں روحانی قوت کارفرما ہے یعنی عالمِ طبیعی کی مختلف قوتیں مختلف روحوں کی مرضی پر چلتی ہیں۔ مختلف مظاہرِ فطرت کی پرستش کی غرض ان روحوں کی پرستش تھی جو ان میں جلوہ گر سمجھی جاتی تھیں۔ فطرت پرستی اصل میں روح پرستی تھی جو طبیعی مظاہر سے اس لئے وابستہ تھی کہ وہ روحوں کا مسکن سمجھے جاتے تھے۔ آگے چل کر جب انسان کو روحوں سے زیادہ واقفیت ہوگئی تو اُس نے ان سے ملنے کے لئے ایک مقام مخصوص کر لیا۔ لیکن یہ جگہ اس برتر روح کی عبادت کے لئے تھی جو مقامی روحوں سے افضل اور اعلیٰ سمجھی جاتی تھی۔ اس طرح مندر یا گرجے کی بنیاد پڑی۔ کبریلو[1]

[1] Calerillo

کا بیان ہے کہ ۱۵۴۲ء میں اپنے بحری سفر کے دوران میں اس نے بحر کاہل کے ساحل پر امریکی دیسیوں کو گروہ در گروہ ایک احاطے میں جمع ہوتے ہوئے دیکھا۔ یہ احاطہ لکڑیوں کو زمین میں گاڑ کر بنایا گیا تھا اور اس کے وسط میں ایک اوٹ تھی۔ اس پر ایک طرح کی الماری سی رکھی تھی جس میں مقدس پرندوں کے پر تھے۔ لوگ اس احاطے کے گرد باضابطہ سلسلے میں جمع ہو رہے تھے اور گو رہے جاتے تھے۔ آخر میں ان میں سے ایک شخص جو پجاری تھا صف میں سے نکل کر احاطے کے اندر گیا۔ اس نے مقدس پروں کو ترتیب سے جمایا، کچھ اوپر نکال کر رکھے اور چند رسمیں ادا کیں۔ یہ روحوں کے ملنے کی جگہ سمجھی جاتی تھی جہاں امریکی دیسی عبادت کے لئے آیا کرتے تھے۔ جب یہ رسوم ختم ہو گئیں تو لوگ جا کر اور کاموں میں مشغول ہو گئے۔

یہ بات قابل غور ہے کہ جب حضرت ابراہیم حران[1] سے بیت اللحم میں آئے تو انھوں نے پتھر کی ایک قربان گاہ بنائی اور اس پر قربانی کی! یہ خانۂ خدا تھا جہاں وہ ذاتِ ایزدی کی عبادت کے لئے آئے تھے۔ مصر سے لوٹتے وقت بھی وہ یہاں اپنے معبود کے حضور میں حاضر ہوئے۔ اسی طرح یونانیوں کے مندر اور مصریوں کے معبد بھی تھے۔ غیر متمدن قوموں کی عبادت ابتدا میں محض اس بات کی کوشش تھی کہ خدا کو خوش کر کے اس کے فضل کے مورد بنیں یا اس کے قہر کو رفع کر کے قبیلے کو ہلاکت سے بچائیں۔ آگے چل کر یہ باضابطہ عبادت بن گئی اور اب دعا میں محض فرد کے لئے مدد اور تقویت کی التجا نہیں کی جاتی تھی بلکہ کل قبیلے یا قوم کے لئے۔ غیر متمدن قومیں خدا سے دعا کیا کرتی تھیں کہ انھیں لڑائی میں فتح بخشے، ان کی فصلوں میں برکت دے اور ہر طرح فلاح عطا کرے۔ دعا کی ترقی یافتہ صورت میں افراد کو اس سے ذاتی طور پر ہدایت اور اپنی سیرت کی تشکیل میں مدد ملتی ہے۔

[1] Haran

۱۷۵۔ عقائد اور رسوم کی پیچیدگی

جوں جوں مذہبی عمل ترقی کرتا ہے مذہبی عقائد اور مذہبی رسوم زیادہ پیچیدہ ہوتی جاتی ہیں یہ بات دیو مالا اور مذہب شرک کی نشو و نما میں خاص طور پر نظر آتی ہے۔ لوگوں کو اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ قبیلے یا نسل کے ہر عمل اور فطرت کے ہر مظہر کو روحانی قوت کا کرشمہ قرار دیں اور اس کا مبداء عالم ارواح کو ٹھیرائیں۔ مثلاً ان کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ زمین اور کل کائنات کیونکر وجود میں آئی اور اس کا حل سوائے اس کے کچھ نہیں تھا کہ اسے ایک غیر مرئی قوت کی کارسازی سمجھیں۔ اس طرح لوگ مختلف وظائف اور مختلف قوتیں رکھنے والے بیشمار دیوتاؤں کو ماننے لگے۔ دیوتاؤں کی زندگی اور ان کے انسانوں کے ساتھ تعلقات کے متعلق ہزاروں افسانے بن گئے۔ یہ افسانے لوگوں کے دلوں پر چھا گئے اور ان سے نہ صرف ان کے عقائد پر بلکہ ان کے اعمال پر بھی بہت اثر پڑا۔ مشرکانہ مذاہب کے بعد اخلاقی مذاہب کی باری آئی جن میں انسانوں کے باہمی تعلقات کے تعین پر زیادہ زور دیا گیا۔ غیر اخلاقی مذاہب میں خاص اہمیت اس مسئلے کو حاصل تھی کہ قبیلے یا فرد کا دیوتاؤں سے کیا علاقہ ہے۔ اخلاقی مذہب میں یہ پہلو بھی مدنظر رہا لیکن اس کے علاوہ انسانوں کے باہمی اخلاقی تعلقات پر بھی توجہ کی گئی۔ مثلاً یہودیوں کے قانونی اخلاقی مذہب میں قومی شریعت نے افراد کے باہمی فرائض کی باضابطہ تشریح کر دی ہے۔ مذہب عیسوی بھی اخلاق اور خدمتِ خلق پر مبنی ہے اور اس کا اصل اصول محبت ہے۔ عہد جدید میں اس کی نشو و نما اس طرح ہو رہی ہے کہ محبت اور خدمتِ خلق کا پہلو قوی ہوتا جاتا ہے اور انسان اور خدا کے تعلق کی اہمیت کم ہوتی جاتی ہے۔

۱۷۶۔ مذہب اور معاشرتی ترقی

اس بارے میں اختلافِ رائے ہے کہ مذہب کا تہذیب و تمدن کی نشو و نما میں کیا اثر ہوتا ہے مگر یہ واقعہ ہے کہ اسے معاشرے کی تشکیل میں بہت بڑا

دخل رہا ہے۔ اگر ہم تہذیب کی ابتدائی شکلوں پر نظر ڈالیں تو یہ نظر آتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک مذہب یا روحوں کی زندگی سے وابستہ تھی۔ نظام ہستی میں تغیر پیدا کرنے کی سب سے بڑی ذہنی کوشش جو غیر متمدن انسان نے کی تھی اس کا مظہر مذہب اور اس کے نفسی لوازمات ہیں۔ مذہبی زندگی غیر متمدن انسانوں کے خیالات، جذبات اور عملی جد وجہد کا مرکز تھی۔ اس زمانے کے معاشرے کا سلسلہ رسم و آئین مذہب ہی پر مبنی تھا۔ گو ہم ان مذہبی عقائد کے بڑے حصے کو لغو اور باعثِ ننگ سمجھیں مگر یہ واقعہ ہے کہ انہیں کی بدولت روح کی ماہیت اور اس کا انسان سے تعلق دریافت کرنے کی کوشش کے سلسلے میں نوعِ انسانی کے جذبات اور ذہنی جد وجہد میں بیداری اور حرکت پیدا ہوئی ہیں۔ مذہبی زندگی چاہے کتنی ہی سطحی معلوم ہو لیکن غیر متمدن قوموں کے سادہ ذہن کے لیے اس نے مہیج اور محرک کا کام دیا۔ رسم و رواج کی تشکیل کرنے کے علاوہ اس نے انسان کی ذہنی اور اخلاقی سیرت کی نشو ونما پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ قطعی اور ثبوتی عقیدے سے ذہنِ انسانی کو بہت تقویت پہنچی۔ اس کی بدولت فرد اور جماعت کی زندگی کے تعلقات معیّن اور واضح ہو گئے۔ غیر مرئی دنیا کے عقدوں کو حل کرنے کے لئے مذہب ناگزیر تھا۔ فرض کیجیے ایک شخص، جو تجربے سے، علم سے اور تعلیم سے محروم ہے، دفعتہً عالمِ طبیعی کے تغیرات اور مظاہر کو اپنے سامنے دیکھتا ہے یقینی بات ہے کہ وہ حیران اور خوفزدہ ہو کر رہ جائے گا۔ وہ بجلی کی چمک دیکھتا ہے، بادل کی گرج سنتا ہے، طوفان کی دستبرد کا موسم کے تغیرات اور اجرامِ سماوی کی حرکت کا، نباتات اور حیوانات کی نشو ونما کا اور سورج، ہوا اور پانی کے گوناگوں کرشموں کا مشاہدہ کرتا ہے اور اس کے کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا ہے اور کیوں ہے۔ جوں ہی اس کے دل میں تحقیق کی خلش پیدا ہوتی ہے اس کی طفلانہ طبیعت کو اس خیال سے تسکین ہو جاتی ہے کہ یہ ایک ان دیکھی قوت، روح یا دیوتا کی کارسازی ہے۔ غرض نوعِ انسانی کے بچپن کی خام کارانہ زندگی میں مذہب کا وہی کام ہے، جو سائنس کا پختہ مغزانہ معاشرتی زندگی میں ہے۔ ترقی یافتہ انسان کے لئے یہ روحانی غذا

بالکل ناکافی ہے لیکن قدیم زمانے کے جاہل ضعیف الاعتقاد وحشی کے لئے یہی مناسب تھی۔

۱۷/۱۰ مذہب تعمیر معاشرت کے اہم عنصر کی حیثیت سے

عمرانیات کو سب سے زیادہ اس بات سے سروکار ہے کہ مذہب کا معاشرتی تنظیم کی نشو ونما پر کیا اثر پڑا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلی بات یہ نظر آتی ہے کہ مذہب کو نظمِ اجتماعی میں دخل رہا ہے۔ خاندانوں، قبیلوں، جماعتوں یہاں تک کہ قوموں کا نظم وضبط مذہب ہی کی بدولت ہوا۔ پھر اخلاق کو بھی اس سے بڑی تقویت پہنچی کیونکہ اس نے گھریلو اور ازدواجی زندگی میں افراد کے باہمی تعلقات کو معین کر دیا۔ سیاست اور مدنی قانون کے وجود میں آنے سے کہیں پہلے مذہب نے وہ رسوم اور آئین جاری کر دئے تھے جنھوں نے اجتماعی زندگی کے توازن کو قائم رکھا۔ مذہب میں ہمیشہ سے بقائے روح کا دھندلا سا عقیدہ موجود تھا۔ اس نے بہت آہستہ آہستہ نشو ونما پائی لیکن جب ایک مکمل صورت کو پہنچ گیا تو اس کا اثر معاشرتی زندگی کے نظم پر کم وبیش پڑتا رہا۔ بقائے روح کے عقیدے سے امید، قوتِ ایمان اور ہمت پیدا ہوتی ہے اور یہ انسان کی ترقی کے نہایت قوی عناصر ہیں۔ اس کے علاوہ چونکہ مذہب عموماً کسی مخصوص خطے سے وابستہ رہا ہے اس لئے حبِ وطن اور حبِ قوم کو بھی اس سے تقویت پہنچی۔ پہلے ہر خاندان کے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ ہمیں دیوتاؤں سے خاص تعلق ہے اس لئے ان کا مذہب خاندانی فخر ومباہات کے جذبے کو ابھارتا تھا۔ جب قبیلوں کے متحد ہونے سے قومی زندگی کی بنیاد پڑی تو ہر قوم جنگ کے وقت اپنے دیوتا کو اپنا رہنما، افراد کی جانوں کا محافظ اور قوم کی سلامتی کا ضامن سمجھنے لگی اور اس خیال نے ان میں حبِ قوم کی روح پھونک دی۔ افسر خاندان کی مرکزی قوت کو مستحکم کرنے کی کوشش میں نظمِ اجتماعی کی نشو ونما ہوئی۔ ایک طبقہ حاکموں کا ہو گیا دوسرا محکوموں کا۔ اس طرح لوگوں نے فرمانروائی اور اطاعت، حکمرانی اور خدمت کی تربیت پائی۔ مذہب نے

خاندان وغیرہ کے ساتھ باضابطہ رسوم وابستہ کر دیں تاکہ اس کی روحانی اصلاح بھی ہو اور اس کی عصبیت بھی قائم رہے۔

لیکن افراد پر مذہب کا سب سے بڑا اثر داخلی تھا۔ پہلے تو فرد کو اس کی بدولت ایک نصب العین حاصل ہوا۔ اُسے اپنی قوتوں کے لئے ایک راہِ عمل نظر آئی اور اس کے دل میں ایک معینہ منزل تک پہنچنے کا ولولہ پیدا ہوا۔ آگے چل کر جب اس نے انسانی زندگی پر قیاس کر کے غیر مرئی روح کی طرف قوت وعظمت کی صفات منسوب کیں تو وہ اس دیوتا کے مانند ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ایک اعلےٰ اور برتر قوت کی اطاعت نے اُسے معاشرتی زندگی کی تربیت دی۔ ہر شخص کو جو ترقی کرنا چاہتا ہے پہلے خدمت کا سبق سیکھنا چاہیئے۔ چاہے یہ خدمت کسی فرد کی ہو یا کسی نصب العین کی، اُسے اس کے لئے سعی سے کام لے کر اپنے نفس پر قابو حاصل کرنا پڑتا ہے اور سعی وہ چیز ہے جو انسان کو انسان بناتی ہے۔

حصۂ سوم

معاشرے کی تعمیر اور نظم و ضبط

حصۂ سوم

معاشرے کی تعمیر اور نظم وضبط

باب اوّل

معاشرے کی تعمیر کے مختلف اعمال

نظمِ اجتماعی کی ابتدا گروہوں سے ہوتی ہے۔ گروہ محض ان لوگوں کا ایک مجمع ہوتا ہے جو کسی ایک یا چند مشترک اغراض کی بنا پر ایک جگہ رہتے ہیں۔ کبھی یہ اتفاقاً جمع ہو جاتے ہیں، کبھی محبت و مجالست کی آرزو یا فطرت کی قوتوں کا دباؤ یا بقا اور تحفظ کا مشترک مقصد انھیں اکٹھا کر دیتا ہے۔ ہیئت اجتماعی کی اس بنیاد کا نام دُرکائم[1] نے "معاشرتی تخمِ مایہ" رکھا ہے کیونکہ معاشرتی زندگی کی مختلف شکلیں اور وظائف سب اسی سے پیدا ہوئے ہیں۔ یہ ایک سادہ اور یک رنگ چیز ہوتی ہے جس میں نہ کوئی تنظیم ہوتی ہے اور نہ معاشرتی نظم۔ وہ عمل جن کے ذریعے سے گروہ اپنی اس سادہ حالت سے ایک پیچیدہ اور مختلف العناصر جسم نامی بن جاتا ہے حسب ذیل ہیں:۔ اجتماع، تبادلِ خیالات، محبت، تعائل، شرکت یا جماعت بندی اور تنظیم۔ ہم نے ان کے نام ان کی ابتدائی ترتیب زمانی کے لحاظ سے لکھے ہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ جب ایک عمل

---

[1] Durkheim

ختم ہو جاتا ہے تو دوسرا شروع ہوتا ہے۔ کیونکہ اجتماع کے دوران ہی میں تبادلِ خیالات ہونے لگتا ہے اور اسی سلسلہ میں محبت اور تقابل کی صورت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر تحلیل کی غرض سے ہم نے انھیں اس ترتیب سے لکھا ہے جس سے ان کی ابتدا ہوتی ہے۔

۱۷۸- اجتماع

اجتماع سے مراد ہے افراد کا ایک جگہ اکٹھا یا آباد ہونا۔ اس کے اسباب بہت سے ہیں اور اکثر ایسے ہیں جو اس میں اور جانوروں کی غول بندی میں مشترک ہیں۔ سب سے پہلی چیز طبعی ماحول کا دباؤ ہے۔ سرد آب و ہوا سے بچنے اور گرم آب و ہوا میں رہنے کی خواہش لوگوں کو ایک جگہ کھینچ لاتی ہے۔ غذا کی رسد بھی لوگوں کے ایک مقام پر رہنے کا باعث ہوتی ہے۔ مثلاً کولمبیا کی ماہی گیری کی فصل میں دیسی امریکی قبائل پہاڑوں سے آن کر جمع ہوتے ہیں اور دریا کے کنارے خیموں میں رہتے ہیں یہاں تک کہ اتنی مچھلیاں جمع ہو جائیں جو کئی مہینے کی غذا کے لئے کافی ہوں۔ اسی طرح جہاں کہیں مچھلیوں کی، شکار کے جانوروں کی اور جنگلی پھلوں کی کثرت ہوتی ہے وہاں لوگ اکٹھا ہو جاتے ہیں۔

اچھے پانی کی رسد کو بھی، جو تندرستی کے لئے لازمی ہے، لوگوں کے ایک جگہ آباد ہونے میں بہت دخل رہا ہے۔ تحفظ کے خیال سے لوگوں نے جنگلوں میں رہنا اختیار کیا۔ جہاں یہ جنگل گھنے تھے وہاں خانہ بدوش قوموں کو اپنے طرزِ زندگی میں تغیر کرنا پڑا۔ جب راعیانہ اور زراعتی زندگی کا دور آیا تو قبیلے کھلی وادیوں اور چھدرے جنگلوں میں رہنے پر مجبور ہوئے۔ جہاں کہیں سمندر اور پہاڑ راہ میں حائل ہو گئے وہاں لوگ آگے بڑھ کر منتشر ہونے سے رک گئے اور معینہ حدود میں بس گئے۔

ـــــــــــــــ

Columbia ؎

اس کے علاوہ بعض داخلی موثرات بھی لوگوں کے ایک جگہ جمع ہونے کا باعث ہوئے ان میں سب سے قوی محبت کی خواہش تھی۔ جانوروں میں صرف شیر، تیندوے وغیرہ جن کی گزر شکار پر ہوتی ہے، اپنی زندگی کا زیادہ حصہ تنہا بسر کرتے ہیں۔ سب جانور ان سے ڈرتے ہیں ان کی صحبت سے بھاگتے ہیں۔ انسان خلقی طور پر گوشت خور بھی ہے اور نبات خور بھی اس لئے ابتدا ہیں اسے دوسرے جانوروں سے زیادہ بقائے زندگی کے موقعے حاصل تھے۔ لیکن اس کی بقا میں تیز رفتاری یا وحشیانہ جنگجوئی کو اس قدر دخل نہ تھا جتنا اتحاد عمل کی صلاحیت کو جس کے ذریعے سے اس نے فطرت کی قوتوں سے کام لے کر اپنے دشمنوں کا مقابلہ کیا۔

انسانوں کی نفسی خصوصیات نے ان میں ایک باہمی کشش پیدا کر دی جس سے ان کا مل جل کر رہنا لازمی ہو گیا۔ فرد تن تنہا اپنے دشمنوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور بغیر صحبت کے اس کی ذہنی نشوونما ناممکن تھی۔ اس لئے ظاہر ہے کہ صحبت کی خواہش کتنی اہم تھی اور اس کی راحت بلکہ اس کی زندگی کے لئے کتنی ضروری تھی۔

پہلے تو اجتماع امن کے ساتھ ہوتا رہا مگر اس کے بعد نزاعی دور آیا اور مختلف گروہوں میں تنازع للبقا شروع ہو گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ معاشرتی دباؤ سے عمل اجتماع کو اور تقویت پہنچی۔ بہت سے چھوٹے چھوٹے گروہوں کو اپنے تحفظ کے لئے متحد ہونا پڑا۔ معاشرتی اتحاد شروع ہو گیا اور اس کی قوت اجتماعی تنظیم کے دوران میں برابر بڑھتی رہی۔ جنسی جبلت باہمی تعلقات کے بڑھانے میں مدد دیتی رہی اور اس کی بدولت مستقل اور مسلسل صحبت کی بنیاد پڑی۔ خارجی ماحول کے اثرات نے افراد کی طبیعت اور مزاج میں یکسانی پیدا کر دی اور ان کا اجتماع زیادہ گہرا اور مستحکم ہو گیا۔ یکساں خصوصیات اور یکساں خواہشیں رکھنے والے لوگ ایک ہی طرز کی زندگی بسر کرنے لگے اور ایک ہی قسم کے اسباب معیشت سے وابستہ ہو گئے۔

۱۷۹۔ تبادل خیالات

اگرچہ اجتماع کے عمل کو تبادل خیالات سے علیحدہ نہیں کر سکتے لیکن اصولی حیثیت سے افراد کا اپنی خواہشوں اور ضرورتوں کو ایک دوسرے پر ظاہر کرنا اور اپنا حال ایک دوسرے سے کہنا ایک جداگانہ معاشرتی محرک کے تابع ہے۔ فرض کیجئے لوگوں کا ایک گروہ الاؤ کے گرد یا کسی جلسے میں یا باغ عام میں جمع ہو جائے تو جب تک ان میں کسی قسم کا تبادل خیالات نہو محض یہ جمع ہو جانا معاشرتی اثرات پیدا کرنے کے لئے کافی نہیں۔ البتہ کسی خواہش یا ضرورت کے اظہار کے لئے باہمی تنظیم سے ایک جماعت بن سکتی ہے۔ غرض لوگوں کے محض گروہ کی شکل میں اکٹھا ہو جانے میں اور تبادل خیالات میں فرق ہے۔ یہ موخرالذکر عمل کی برکت ہے کہ افراد میں ایک مشترک جذبہ اور مشترک ذہنیت پیدا ہوتی ہے۔ اس زمانے میں تبادلِ خیالات کے مخصوص وسیلے نطق انسانی اور اس قسم کے آلے ہیں جیسے تار ٹیلیفون وغیرہ۔ اخبار یا زیادہ وسیع نظر سے دیکھئے تو مطبع بھی اسی ذیل میں ہے۔ ان چیزوں کے ذریعے سے لاکھوں کروڑوں آدمی ایک وقت میں یکساں معلومات حاصل کرتے ہیں، یکساں خیالات رکھتے ہیں اور یکساں عمل کرتے ہیں کسی جماعت کو ایک ہیئت اجتماعی کے رشتے میں مربوط کرنے کا کوئی طریقہ اس مشترک علم اور مشترک خیال سے زیادہ موثر نہیں جو چیزوں سے تبادلِ خیالات کرنے کی بدولت پیدا ہوتا ہے۔

جہاں تبادل خیالات شروع ہوا تو اشیا کا مبادلہ بھی ہونے لگتا ہے اور ایک ہی قسم کی چیزیں استعمال کرنے سے معاشرتی زندگی میں یکسانی پیدا ہوتی ہے جہاں کہیں قبیلوں یا قوموں میں اشیا کا مبادلہ نہو وہاں معاشرتی اتحاد کا موقع بہت کم ہوتا ہے۔ وحشی قبیلے ایک دوسرے سے یا غیر ملک کے لوگوں سے معاشرتی دوستی کا اظہار مبادلۂ اشیا ہی کے ذریعہ سے کرتے ہیں۔ چاہیے یہ محض کم قیمت آرائشی چیزیں ہوں جیسے سیپ وغیرہ چاہے کپڑا یا ہتیار۔ بہر حال ان کی بدولت مبادلہ کرنے والوں میں دوستانہ تعلقات قائم ہو جاتے ہیں۔

جب قبیلوں میں تبادل خیالات کی نوبت آجاتی ہے تو وہ ایک دوسرے کی رسوم و عادات کی تقلید بھی کرنے لگتے ہیں۔ یہ عمل کم و بیش غیر محسوس طور پر

جاری رہتا ہے یہاں تک کہ وہ منزل آتی ہے جب غیر ملکوں کا رسم و آئین ارادۃً اختیار کیا جاتا ہے۔ جب لوگ ایک ہی معاشرتی دستور کو اختیار کرلیں تو وہ نہ صرف شخصی عادات میں بلکہ اجتماعی زندگی میں روز بروز ایک دوسرے سے مشابہہ ہوتے جاتے ہیں۔

۱۸۰۔ صحبت

یوں تو صحبت کا لفظ معاشرتی تنظیم کے ہر عمل کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے مگر اس کا ایک خاص مفہوم بھی ہے۔ لوگ ایک جگہ سکونت اختیار کرنے کے بغیر بھی اکٹھا ہو کر تبادلِ خیالات کر سکتے ہیں مگر مستقل صحبت کے لئے ایک ہی مقام پر رہنا سہنا ضروری ہے۔ اس طرح روزمرہ کے میل جول سے لوگوں میں بہت سے معاشرتی تعلقات پیدا ہو جاتے ہیں اور وہ ایک دوسرے کو ایک جماعت کا دوامی رکن سمجھنے لگتے ہیں۔ مستقل صحبت کی ایک شکل خاندان بھی ہے یہاں خیالات، جذبات اور احساسات کے گہرے اتحاد کے علاوہ معاشرتی زندگی کے ہر شعبے میں اتحادِ عمل بھی نظر آتا ہے۔ یہ بات بغیر مستقل صحبت کے کبھی نہیں پیدا ہو سکتی تھی۔ اس کی مثال یہ ہے کہ جن لوگوں میں حقیقی یا نسبتی رشتہ ہوتا ہے وہ اگر سالہا سال جدا رہیں تو انھیں ایک دوسرے سے کوئی دلچسپی نہیں رہتی حالانکہ ان میں اور ان کے ہمسایوں میں یکجائی کے سبب سے گہرے معاشرتی روابط پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس کے بہت سے ثبوت ہیں کہ خاندان والوں میں جو باہمی محبت ہوتی ہے وہ زیادہ تر ایک گھر میں رہنے سہنے اور میل جول پر مبنی ہے۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ صحبت کی بنا پر ایک مشترک مذہبی عقیدہ پیدا ہو جاتا ہے جسے نظمِ اجتماعی کی تاسیس اور خیالات و احساسات کے اتحاد میں بہت دخل ہے۔ مذہب محض شخصی چیز نہیں بلکہ ایک معاشرتی وظیفہ ہے اس لئے اس میں بہت شبہہ ہے کہ بغیر مشترکہ عبادت کے کوئی مذہبی نظام قائم رہ سکتا ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں نظر آتی ہیں کہ جہاں کسی جماعت نے مل کر عبادت کرنا ترک کیا اس کے مذہب میں انحطاط شروع ہو جاتا ہے۔ اس سے اور دوسرے مشاہدات سے

صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مذہب کو ہم لوگ عموماً جس حد تک معاشرتی وظیفہ تسلیم کرتے ہیں اصل میں اس سے کہیں زیادہ ہے۔ جب تک کسی مذہب کے پیروؤں کے جذبات واحساسات یکساں ہوتے ہیں وہ ترقی کرتا ہے لیکن جب ان کے عقائد میں اختلاف پیدا ہوگیا اسے تنزل ہونے لگتا ہے۔

۱۸۱۔ تعامل

یہ عمل لوگوں کے جمع ہوکر گروہ بنانے کے بعد ہی شروع ہوگیا۔ انھیں غذا فراہم کرنے اور مامن بنانے میں غیر محسوس طور پر مل کر کام کرنے کی عادت پڑگئی جب جماعت میں نظم اجتماعی اچھی طرح سے قائم ہوگیا تو ہر شخص اپنی فوری ذاتی اغراض کے پورا کرنے میں بھی ایک حد تک اجتماعی فلاح میں مدد دینے لگا۔ پھر جارحانہ اور مدافعانہ لڑائیوں میں بھی اتحاد عمل کی ضرورت پڑی۔ تراجی عہد میں قانونِ تنازع کا دور دورہ تھا اور ہر فرد اس پر مجبور تھا کہ کسی گروہ میں شریک ہوجائے اور مدافعت کے وقت دوسروں کا ساتھ دے ورنہ اُسے ہلاکت کا خوف تھا۔ اس اشتراک مقاصد کی بنا پر جو لڑائی میں تھا اور معاملات میں بھی تعامل ہونے لگا۔ تقسیم محنت کی ابتدا سب سے پہلے نوع انسانی کی دونوں جنسوں میں ہوئی۔ کچھ کام عورتوں کے لئے مخصوص کردیئے گئے اور کچھ مردوں کے لئے عورتوں کے حصے میں بچوں کی پرورش، گھر کی دیکھ بھال، کھانا تیار کرنا، سینا پرونا اور بعض صورتوں میں مکان بنانا آیا۔ مرد شکار ماہی گیری اور لڑائی میں مصروف رہنے لگے۔ لیکن جب پیشوں میں تنوع پیدا ہوا اور نئے نئے کام نکلے تو اور زیادہ تقسیم محنت کی ضرورت پڑی۔ بعض لوگ شکار مارتے تھے، بعض اسے پکاتے تھے، بعض پانی بھرتے تھے، بعض مکان بنانے کے لئے لکڑی فراہم کرتے تھے اور بعض تعمیر کا کام کرتے تھے۔ پھر اور نئے پیشے نکلے مثلاً گلہ بانی اور آگے چل کر زراعتی مشاغل جن کی وجہ سے لوگ اور گروہوں میں بٹ گئے۔ یہ جداگانہ گروہ سب کے سب پوری جماعت کی فلاح و بہبود کے لئے کام کرتے تھے۔ ہماری جدید معاشی زندگی جو اس قدر پیچیدہ اور منظم ہے اصل میں اسی سیدھے سادے غیر شعوری تعامل کی

بدولت وجود میں آئی ہے۔ اس کے بعد غیر متمدن جماعتوں کی زندگی میں وہ منزل آئی جب جماعتوں کی تنظیم مخصوص مقاصد، مثلاً سڑکوں کی تعمیر، تجارت اور آگے چل کر بینک کے کاروبار کے لئے، کی گئی۔ تعامل کے ان طریقوں میں سے بہت سے آج کل ترقی یافتہ صورت میں موجود ہیں۔

۱۸۲۔ شرکت یا جماعت بندی

تعامل کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ مختلف گروہ باہمی رضامندی سے مل کر حکومت قائم کریں۔ حکومت بھی نظم اجتماعی کا ایک شعبہ ہے اس لئے اسے بھی تعامل کی ایک شکل سمجھنا چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ اس کی بنیاد تحفظ اجتماعی کے شعوری یا غیر شعوری معاہدے پر قائم ہوئی ہوگی۔ جب عمل اتحاد کی بدولت جداگانہ گروہ کسی خاص غرض یا عام مقاصد کے لئے مل کر ایک بنیں تو ان میں کسی معاہدے کا ہونا ضروری ہے خواہ وہ مذکور ہو یا مقدر۔ جدید زمانے میں جب کہ حکومت نے ایک نظام کی شکل اختیار کرلی ہے شرکت کا زور زیادہ تر صنعت و تجارت میں نظر آتا ہے بہت سے لوگ مل کر معاشی مقاصد کے لئے شرکتیں قائم کرتے ہیں۔ اس طرح کے ہر عمل سے معاشرتی تنظیم میں مدد ملتی ہے کیونکہ اس کی بدولت لوگ ایک رشتے میں مربوط ہو جاتے ہیں اور مشترک معاشرتی زندگی بسر کرتے ہیں۔ پیدائش دولت نہ صرف جماعت کی معاشی زندگی کے لئے ضروری ہے بلکہ حصول دولت اور تقسیم دولت کے عمل سے لوگوں کو معاشرتی تنظیم کی تربیت ملتی ہے۔ غالباً سوائے جنگ کے، کسی قوت کو لوگوں کے درمیان اتحاد عمل پیدا کرنے میں اسقدر دخل نہیں رہا ہے جتنا صنعت و تجارت کو۔

۱۸۳۔ تنظیم

معاشرتی زندگی کا آخری اور غالباً سب سے اہم مظہر تنظیم ہے۔ یوں تو ان سب اعمال نے جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے تنظیم میں مدد دی لیکن مستقل نظم اجتماعی کا قائم ہونا اس پر موقوف تھا کہ افراد کی معاشرتی حیثیت معین کر دی جائے۔

معاشرتی ارتقا کے دوران میں ضرورت کے اقتضا سے قیادت نے نشو و نما پائی جب جماعت کی تقسیم دو گروہوں میں یعنی قائد اور پیرو یا حاکم و محکوم طبقوں میں ہوئی تو مستقل تنظیم کا بہت بڑا مرحلہ طے ہو گیا۔ خاندان کے اندر فرد کی حیثیت معین ہو گئی اور غلام اور آقا کا تعلق بھی واضح ہو گیا اسی طرح ان لوگوں کو جو نسب کے لحاظ سے اشراف کہلاتے تھے معاشرے میں ایک مستقل مرتبہ حاصل ہو گیا آگے چل کر جب نظم اجتماعی کے وظائف میں تنوع پیدا ہوا تو خاندانی تنظیم پیش پیش رہی اور جب خاندان کی جگہ ریاست نے لے لی اسوقت یہ صورت ہوئی کہ ایک گروہ جنگ یا تحفظ کے لئے منظم کیا گیا، دوسرا مذہبی امور کے لئے تیسرا حکومت کے لئے چوتھا صنعت و تجارت کے لئے۔ اب معاشرے میں شعوری تعامل شروع ہو گیا۔ اس کی تنظیم مخصوص مقاصد کے لئے کر دی گئی۔ وہ اب جسم نامی نہیں رہا بلکہ اس نے ایک منظم ہئیت اجتماعی کی شکل اختیار کر لی۔

باب دوم

معاشرتی قوتیں

عالم فطرت میں جب کبھی تغیرات و حوادث واقع ہوں تو وہ طبیعی قوتوں کے وجود پر دلالت کرتے ہیں۔ اسی طرح جب معاشرے میں تحریک پیدا ہو تو محرک قوتوں کا ہونا ضروری ہے۔ انھیں معاشرتی قوتیں کہتے ہیں۔ ان سے محض معاشرے کی قوتیں مراد نہیں بلکہ وہ کل قوتیں جو معاشرے کی ابتدا، نشوونما اور جدوجہد میں کارفرما ہوتی ہیں۔ اصل معاشرتی قوتیں تو منظم ہیئت اجتماعی کے اعمال ہیں جو اسی کے اندر وجود میں آتے ہیں۔ مگر ان خارجی عوامل پر بھی نظر ڈالنا ضروری ہے جن کا اثر معاشرتی جدوجہد پر پڑتا ہے۔

۱۸۴- طبیعی قوتیں جو معاشرے پر اثر ڈالتی ہیں

جیسا ہم پچھلے باب میں کہہ چکے ہیں آب و ہوا کو معاشرے کے وجود میں بہت دخل ہے کیونکہ اس کی بدولت انسانوں کے گروہ ایک جگہ جمع ہوتے ہیں۔ یہ لوگوں کو مجبور کرتی ہے کہ آندھی، پانی، گرمی سردی سے محفوظ رہنے کی تدبیر کریں۔ شاعروں اور فلسفیوں نے اس مضمون پر بہت

طبع آزمائی کی ہے کہ آگ لوگوں کو اکٹھا کرتی ہے اور انھیں نظم اجتماعی کی تربیت دیتی ہے۔ وحشیوں کے الاؤ سے لے کر نیو انگلینڈ کے شاندار مکانوں کے آتشدانوں تک یہ موثر برابر معاشرتی تعلقات کے پیدا کرنے اور قائم کرنے میں کارفرما رہا ہے۔

علاوہ اس کے پانی کی رسد نے بھی لوگوں کو ایک جگہ جمع ہونے اور معاشرتی زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا۔ یونانیوں نے سب سے پہلے جو مدنی قوانین وضع کئے ان میں ندیوں، نہروں وغیرہ کے انتظام کا قانون بھی تھا۔ پانی صرف لوگوں کے اجتماع ہی کا باعث نہیں ہوا بلکہ یہ زندگی کے لئے اس قدر ضروری تھا کہ اس کی بدولت ابتدا ہی میں معاشرتی عمل کے قوانین اور قواعد بن گئے۔ امریکہ کی بعض مشرقی ریاستوں میں ان لوگوں نے جو سب سے پہلے آباد ہوئے تھے اپنے گھر چشموں کے قریب بنائے۔ جب سڑکیں بنائی گئیں تو انھیں بڑے چکر سے پہاڑیوں پر سے لیجانا پڑا تاکہ ان مکانوں کے پاس سے گزاریں۔ یہی سبب ہے کہ مشرقی ریاستوں کی اکثر سڑکیں پیچدار ہیں حالانکہ مغربی ریاستوں کی سڑکیں عموماً سیدھی ہوتی ہیں۔

آب وہوا اور پانی سے بھی زیادہ اثر ملکوں کی آبادی پر غذا کی رسد کا پڑتا ہے۔ بستیوں کا محل وقوع، آبادی کا گھنا یا چھدرا ہونا اور نقل وحرکت کی آسانی یا دشواری اسی چیز پر موقوف ہے۔ پانی غذا اور آب وہوا کے علاوہ زمین کے قدرتی وسائل دولت مثلاً جنگلوں، کانوں، آبشاروں کی قوت اور نقل وحرکت کے ذریعوں کو لوگوں کے انتخاب مسکن میں بہت بڑی حد تک دخل رہا ہے۔ اس لئے ان وسائل سے نظم اجتماعی کے قائم ہونے میں بھی مدد ملی۔ غرض مجموعی حیثیت سے معاشرتی زندگی کی بنا طبیعی ماحول ہی کی بدولت پڑی۔ اس کے علاوہ طبیعی موثرات نے لوگوں کی سیرت پر اثر ڈالا، ان کے مزاج میں، خواہشات میں اور طرز عمل میں یکسانی پیدا کی اور اس طرح نظم اجتماعی قائم کیا۔ مختلف قوموں کی جداگانہ نسلی خصوصیتیں اختلاف ماحول ہی سے پیدا ہوئی ہیں۔ یونانیوں کی سیرت کی تشکیل کا ایک عنصر اس چھوٹے سے جزیرہ نما کی آب وہوا بھی تھی۔

چھوٹی زرخیز وادیاں، سمندر کے کنارے کی لطیف ہوا، کھلا آسمان، نیم معتدل آب و ہوا کی روئیدگی ان سب چیزوں نے ان کی زندگی کو خوشنما بنایا اور ان کی سیرت پر اثر ڈالا۔ اسی طرح دریائے نیل نے، جس کی طغیانی ریگستان کو تہہ آب کر دیا کرتی تھی، اپنی وادی کو ملک مصر بنا دیا اور اس کے باشندوں کی سیرت پر بہت اثر ڈالا۔ اور اہرام مصری جیسی چیزوں کا وجود کسی اور ملک میں مثلاً یونان اطالیہ یا سولتستان (سوئٹزرلینڈ) میں ناممکن تھا۔ ہندوستان کے اونچے پہاڑوں وسیع میدانوں، خوفناک آندھیوں اور طوفانوں اور شدید خشک سالیوں نے، جو کھیتی کو برباد کر دیتی ہیں اور قحط اور وبا پھیلاتی ہیں، وہاں کے باشندوں کی سیرت اور ذہن کو بہت متاثر کیا اور اسے خوف، خطر اور "حسرتوں کا ملک" بنا دیا۔ ان لوگوں کا فلسفہ اور ادب، ان کے دیوتا، اور ان کے ذہن کے کل تخلیقی کارنامے اپنے طبیعی ماحول کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ اسی طرح ہم یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ سوئیسیوں (سوئٹزرلینڈ کے باشندوں) کی حریت پسندی ایک حد تک ان کے کوہستانی وطن کی برکت ہے۔ اس کاٹیوں (اسکاٹ لینڈ والوں) کی طبیعت ان کے ملک کی آب و ہوا سے متاثر ہوئی ہے اور امریکیوں کی سیرت کی تشکیل میں دھوپ اور اوزون[ا] پہاڑوں اور میدانوں اور انواع واقسام کے قدرتی وسائل کو بہت کچھ دخل ہے۔ ان سب چیزوں کا معاشرتی اثر یہ ہے کہ لوگوں کی سیرت اور مقاصد میں یکسانی پیدا ہوتی ہے اور اس یکسانی کی بدولت اجتماعی زندگی، اشتراک عمل، صحبت اور تنظیم کی صلاحیت پرورش پاتی ہے۔

۱۸۵ - انفرادی خواہشیں اور جبلتیں

حقیقی معاشرتی قوتیں وہ ہیں جو افراد کی خواہشوں اور جماعت کی جدوجہد سے پیدا ہوتی ہیں۔ یہ وہ قوتیں ہیں جو جسم اجتماعی میں قدرتی طور پر پائی جاتی

[ا] Ozone

ہیں اور معاشرتی ارتقا کے عمل میں کار فرما ہوتی ہیں۔ اصولی یا عملی حیثیت سے سب سے مقدم قوت وہ ہے جو بھوک رفع کرنے میں صرف ہوتی ہے۔ یہ ایک حقیقی معاشرتی قوت ہے جو ابتدا سے انسان کے طرزِ عمل کو معیّن کرتی رہی ہے۔ بھوک کو رفع کرنے کی کوشش نے لوگوں کو غذا فراہم کرنے کے لئے اتحادِ عمل پر آمادہ کیا۔ اس سیدھے سادے فعل کا معاشی اور معاشرتی زندگی کی نشو و نما پر بڑا زبردست اثر پڑا۔ سارے زراعتی مشاغل، اکثر اوزاروں اور کلوں کی نشو و نما اور کان کنی وغیرہ کی جد و جہد کی محرک غذا کی تلاش یا حصولِ دولت کی سعی تھی۔ اگر بھوک کی قوتِ محرکہ باقی نہ رہے تو دنیا کی آدھی صنعتیں دم بھر میں مٹ جائیں۔ اس کے بعد سب سے اہم چیز سردی کی تکلیف سے بچنے کی خواہش ہے۔ اسی کی بنا پر لوگوں نے گھر بنانا اور کپڑے بننا شروع کیا۔ مامن کی تلاش اور جسم کی حفاظت کی خواہش کو معاشرتی اتحاد کی نشو و نما میں بہت کچھ دخل ہے۔ اسی کی بدولت مصنوعی حرارت ایجاد کی گئی اور اس کے لئے آلات بنائے گئے، ایندھن کی طلب پیدا ہوئی کوئلے کی کانیں کھودی گئیں اسی نے لوگوں کو ایک گھر میں رہنے پر مجبور کیا، نظمِ اجتماعی کی ضرورت پیدا کی اور معاشرتی اتحاد کو ترقی دی۔ گھر کی معاشرتی زندگی حقوقِ ملکیت کے تعین کا باعث ہوئی اور عام معاشرتی زندگی کو متاثر کرتی رہی۔ اس کے اثرات، زبان کی نشو و نما تبادلِ خیالات کے وسائل، معاشی اور معاشرتی زندگی کی ابتدا کی شکل میں نظر آتے ہیں۔ سردی سے بچنے کی کوشش کے نتائج یہیں تک محدود نہیں بلکہ فنِ تعمیر کی نشو و نما اور گھر کی آرائش بھی اسی کا بالواسطہ نتیجہ ہے۔

جسم کو ڈھکنے کی خواہش میں پہلے صرف آرائش کا پہلو مدنظر تھا۔ آگے چل کر سردی، طوفان اور گرمی سے بچنے کا خیال پیدا ہوا اور آخر میں زیب و زینت کا جمالی تصور بھی اس کے ساتھ شامل ہوگیا۔ آج کل اگرچہ جسم کا تحفظ آب و ہوا کے اثرات سے مقدم سمجھا جاتا ہے مگر زیادہ تر وقت اور توجہ لباس کے جمالی پہلو اور تعلقات پر صرف ہوتی ہے، افادی پہلو پر اتنا زور نہیں دیا جاتا۔ طوفان اور ہوا سے بچنے کے لئے ڈالر کے موٹے چھوٹے کپڑے کافی ہیں۔

مگر پہننے والے سینکڑوں ڈالر کی پرتکلف پوشاک پہنتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ زینت اور تکلف کی حد محض اعتباری ہے۔ غریب لوگ اپنے سادے کپڑوں میں مگن رہتے ہیں اور امرا ریشم اور مخمل وغیرہ کے لباس زیب تن کرتے ہیں۔ اور بیش بہا جواہرات اور زیورات سے آراستہ ہوتے ہیں مگر جمالی آرائش کی خواہش ہر شخص کو ہوتی ہے وحشی لوگ پہلے اپنے جسم کو رنگتے ہیں یا اس پر نقش و نگار کھودتے ہیں اور آگے چل کر سیپی، ہڈی یا پتھر کے بھدے زیور بناتے ہیں۔ پہلے پہل جو کپڑے درختوں کی پتیوں یا چھال سے بنائے گئے وہ خوشنما نہیں تھے بعد میں ان کے رنگ یا تراش خراش میں کسی حد تک جمالی خوبی پیدا کی گئی۔ آج بھی غریب سے غریب لوگوں کی طبیعت میں زیب و زینت خوش پوشی کی آرزو بہت قوی ہے اور اکثر وہ لباس کی آرائش و زیبائش میں اتنا وقت صرف کرتے ہیں جس کی قیمت کپڑے کی اصل قیمت سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔

۱۸۶- جنسی شہوت

جنسی شہوت بھوک سے اور سردی کی تکلیف سے کم اہمیت نہیں رکھتی۔ یہ ایک حیوانی جبلت ہے جو سب جانوروں میں ہوتی ہے اور نظم اجتماعی کی نشوونما میں اس کا بہت بڑا اثر ہے۔ اصل میں یہ محض ایک بہیمی خواہش ہے لیکن اس کی بدولت محبت کے جذبات اور لطیف جنسی تعلقات نشوونما پاتے ہیں جن پر خاندان کی بنیاد قائم ہے۔ گو اس کی ابتدا جسمانی شہوت سے ہوتی ہے مگر آگے چل کر یہ ایک عام جذبہ بن جاتا ہے اور انسان کے سارے احساسات پر چھا جاتا ہے۔ اسی سے گھریلو زندگی میں پیار اور اخلاص کی شیریں فضا پیدا ہوتی ہے۔

جنسی شہوت ایک وسیلہ ہے جو فطرت بقائے نوع کے لئے اختیار کرتی ہے لیکن اس سے گوناگوں تخلیقی قوتیں پیدا ہوتی ہیں جو اصل مقصد سے بہت مختلف ہیں گھر کی ابتدائی غرض تو صرف بچوں کی پیدائش اور پرورش تھی مگر اس کی بدولت خاندان کی تشکیل ہوئی، سبط کی بنیاد پڑی اور رفتہ رفتہ ریاست کا اساس قائم ہوا۔ عمرانی نقطۂ نظر سے بچوں کی اہمیت بقائے نسل تک محدود نہیں بلکہ اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے

وہ معاشرتی جد وجہد کا مرکز ہیں اور ان کی پرورش اور تربیت میں بہت کوشش کرنا پڑتی ہے۔ ان کی یہ اہمیت تہذیب کی ارتقا سے کم نہیں ہوئی بلکہ روز بروز بڑھتی گئی یہاں تک کہ آج بچے کی ذات تہذیب وتمدن کا محور بن گئی ہے۔ اسی کی خاطر ہم کام کرتے ہیں اور روپیہ جمع کرتے ہیں، اسی کے لئے جیتے ہیں اور تکلیفیں سہتے ہیں تاکہ وہ اپنے بزرگوں سے زیادہ ترقی کرسکے اور اسے زندگی کا بہتر ماحول نصیب ہو مکمل معاشرے کا تصور آنے والے زمانے سے وابستہ ہے اور لوگ اپنی عمریں آئندہ نسلوں کے لئے صرف کرتے ہیں۔ ہر نسل میں صنعتی جد وجہد بڑھتی جاتی ہے اور اس کا سبب یہی ہے کہ لوگوں کو اپنے اخلاف کی فلاح وبہبود کا بندوبست کرنے کی فکر رہتی ہے۔

اس کے علاوہ محبت کا جذبہ خواہ وہ میاں بیوی کی محبت ہو یا ماں باپ اور گھر بار کی الفت، فرد پر بڑا زبردست اثر ڈالتا ہے اور ہمدردی اور تامل کی بدولت اس کی زندگی میں کایا پلٹ ہو جاتی ہے۔ معاشرتی زندگی میں اسی نسبت سے ترقی ہوتی ہے جس نسبت سے محبت محض جسمانی جذبے کی سطح سے بلند ہو کر جسم اور روح پر چھا جائے۔

۱۸۷۔ انتخاب جنسی کا اثر

ایک اہم معاشرتی قوت قانون انتخاب زوج بھی ہے جو افراد کی خصوصیات میں تدریجی تغیر پیدا کرتی ہے۔ نسلوں کی تفریق پر اس کا بہت اثر پڑا اور ازدواجی تعلقات نے رفتہ رفتہ نسلوں کی خصوصیات کو بدل دیا۔ اس کی بدولت محبت کا اثر خاندان تک محدود نہیں رہتا بلکہ وسیع تر معاشرتی دنیا میں پھیل جاتا ہے۔ ماں باپ کی بچے سے محبت جو جذبۂ ہمدردی کی بنیاد ہے، اپنے دائرے میں اور عزیزوں کو بھی شامل کر لیتی ہے اور ایک متحدہ برادری قائم ہو جاتی ہے۔ جب خاندان وسعت پا کر قبیلہ بن جاتا ہے تو ابتدا میں اتحاد محض تحفظ کی ضرورت پر مبنی ہوتا ہے لیکن آگے چل کر قبیلے کی محبت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ جب قبیلہ کسی مقام پر مستقل طور پر آباد ہو جاتا ہے تو یہ جذبۂ محبت اس زمین سے بھی وابستہ ہو جاتا ہے۔ اس طرح گھر بار، قبیلے قوم اور ملک کی محبت

مل کر ایک وسیع جذبہ بن جاتا ہے جو حبِ وطن کہلاتا ہے۔ اگرچہ معمولی قومی زندگی میں یہ جذبہ کبھی مفقود نہیں ہوتا لیکن بعض اوقات اس پر حبِ انسان کا جذبہ غالب آجاتا ہے جس کا دائرہ جغرافی حدود سے گزر کر ساری نوعِ انسانی کا احاطہ کر لیتا ہے۔

۱۸۸۔ انفرادی خواہشات کا اثر معاشرتی زندگی پر

ابتدا میں صحبت کی خواہش معاشرے کی اساسی قوتوں میں سے تھی۔ افراد کو محض ایک دوسرے سے ملنے میں خوشی اور راحت حاصل ہوتی ہے۔ انسان کی معاشرتی صفات کے بارے میں خواہ کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو یہ ماننا پڑتا ہے کہ اسے صحبت کی خواہش ہمیشہ رہی ہے۔ ممکن ہے کہ غیر متمدن معاشرے میں یہ خواہش مقابلتہً کم ہو مگر تھی ضرور اور تہذیب کی نشو و نما کے ساتھ ساتھ اس کی قوت بڑھتی گئی۔ اسی صحبت کی خواہش کی بنا پر انسان کو راحت کے سامان اور جاہ و منصب کی طلب پیدا ہوئی تاکہ مجلسی زندگی کا ایک معیار قائم ہو جائے۔ یہ ایک مستقل معاشرتی قوت ہے اور لوگوں کو مختلف طبقوں میں تقسیم کرنے میں اس کا بھی بڑا اثر ہے۔

۱۸۹۔ ہر دلعزیز ہونے کی خواہش

اگرچہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ دوسروں کی خوشنودی کی خواہش کو ہماری زندگی میں کس حد تک دخل ہے مگر اتنا ہم سب جانتے ہیں کہ یہ انسان کے عمل کے سب سے قوی محرکات میں سے ہے۔ اگر ہمیں یہ آرزو نہ رہے کہ دوسرے ہمارے طرزِ عمل کو پسند کریں تو افراد کی جد و جہد پھیکی و بے رنگ ہو جائے اور زندگی کا مقصد اور لطف جاتا رہے۔ فرض کر لیجئے کہ انسان جو کچھ کرتا ہے یہ سمجھ کر کرتا ہے کہ یہی مناسب اور احسن بات ہے اور یہی کرنا چاہئے۔ پھر بھی اس "چاہئے" کا معیار لوگوں کی پسندیدگی یا ناپسندیدگی ٹھہرتی ہے۔ اس کی مثال ہماری روزمرہ زندگی کے ہر فعل میں نظر آتی ہے۔ لباس کی خریداری سے لے کر پیشہ یا راہ عمل کے انتخاب تک میں انسان کو اس کا خیال رکھنا پڑتا ہے کہ دوسرے اسے کس نظر سے دیکھیں گے۔ اس کا اثر دوستوں یا رفیقوں کے انتخاب میں سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ انسان

عموماً ان لوگوں کی صحبت ڈھونڈھتا ہے جو اس کی طرزِ عمل کو پسند کرتے ہوں۔ یا اگر اس نے ایسے ہم صحبت تلاش کر لئے ہیں جو اور ہر لحاظ سے مجالست اور موانست کے لئے موزوں ہیں تو وہ ایسا طرزِ عمل اختیار کرتا ہے جو اس کے محبوب اور محترم رفیقوں کی نظر میں پسندیدہ ہو۔

طرزِ زندگی یا پیشے کا انتخاب بھی قوی موثرات میں سے ہے۔ حصول دولت کی کشمکش پر اس خیال کا بہت اثر پڑتا ہے کہ دوسرے اسے کس حد تک پسند کرتے ہیں ادبی مشاغل کو لوگ جماعت کی خوشنودی کے لئے اختیار کرتے ہیں۔ سیاسی اقتدار کی خواہش اکثر اس پر مبنی ہوتی ہے کہ انسان پر سب کی نظر پڑتی رہے اور ریاست یا قوم سے داد ملتی رہے۔ یہ خواہش بعض لوگوں کو کم ہوتی ہے اور بعض کو زیادہ۔ اسی بنا پر راہ عمل میں اختلاف ہوتا ہے اور لوگ مختلف گروہوں میں بٹ جاتے ہیں۔ انسان کے خلقی طور پر معاشرت پسند ہونے کا اور معاشرتی زندگی اور ماحول سے ہمدردی رکھنے کا اس سے بڑھ کے اور کوئی ثبوت نہیں کہ وہ معیار، انتخاب اور نصب العین کے تعین میں دوسروں کا پابند ہے۔

۱۹۰۔ دولت کی خواہش

دولت کی خواہش بھی معاشرتی زندگی کا ایک نمایاں عنصر ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں انسان تنازع البقا کے دور سے گزر کر حصول دولت کی کشمکش کے دور میں داخل ہو گیا ہے۔ عموماً لوگ دولت کی آرزو اس لئے رکھتے ہیں کہ مادی اشیا پر قدرت ہونے سے انھیں آسائش ملے یا قوت حاصل ہو۔ بعض اوقات یہ چیز ہوس بن جاتی ہے یعنی لوگ دولت اس لئے چاہتے ہیں کہ اسے جمع کر کے رکھیں اور اس کی پرستش کریں۔ کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جن کا مدعا حصول دولت سے محض فوری لذتیں حاصل کرنا ہے۔ ان دونوں انتہائی صورتوں کے درمیان خواہش دولت کی بہت سی شکلیں اور بہت سے مدارج ہیں۔ لیکن بہر حال دولت کی طلب اس افادے یا لذت کی خاطر ہوتی ہے جو انسان اس سے حاصل کرتا ہے۔ اس سے انسان کو علم و ہنر کی تحصیل، ذوق جمال و شوق سیاحت

کی تسکین، خورد و نوش کی اشتہا کو پورا کرنے اور آرٹ اور صنعت کی مصنوعات فراہم کرنے کے وسائل ہاتھ آتے ہیں۔ اس کے لیے لوگ تکلیفیں اٹھاتے ہیں قربانیاں کرتے ہیں اور عارضی طور پر لذت اور آرام کو تج دیتے ہیں۔ اس کے لئے لوگ تجارتی ٹرسٹوں میں منظم ہوتے ہیں اور ایسا طرز زندگی اختیار کرتے ہیں جو حصول دولت کے لیئے موزوں ہو۔ یہ ایک عجیب و غریب معاشرتی طاقت ہے جو انسان کے تمام معاشرتی اعمال پر اثر ڈالتی ہے۔

۱۹۱۔ صحت کی خواہش

صحت کی خواہش کئی طرح سے ہماری معاشرتی جد وجہد کو متاثر کرتی ہے۔ جسم کی سلامتی اور اسے سردی گرمی اور دوسرے مضر موسمی اثرات سے محفوظ رکھنے کی انسان کو بہت فکر رہتی ہے۔ جسمانی فلاح کی خواہش محض انفرادی چیز نہیں رہتی بلکہ ایک معاشرتی وظیفہ بن جاتی ہے اس کی بدولت تعمیر مکان، تشکیل لباس اور بلدہ سازی کی وہ تمام صورتیں اختیار کی جاتی ہیں جو صحت عامہ کے لئے ضروری ہیں۔ حفظان صحت اور اس کی انجمنیں، فن طب اور طبی جماعتیں یہ سب تندرستی کی خواہش پر مبنی ہیں۔ اسے علوم کی ترقی، علمی تحقیقات اور علمی انجمنوں کی نشو نما میں بھی بہت دخل ہے۔ ہمارے تعلیمی اداروں میں ورزشی کھیلوں اور کسرت کے طریقوں کا رواج اسی کی بدولت ہوا ہے۔ اس قسم کی اور بہت سی چیزیں ہیں جن میں یہ خواہش معاشرتی جد و جہد پر اثر ڈالتی ہے۔

۱۹۲۔ علم کی خواہش

علم کی خواہش کے دو پہلو ہیں ایک تو اس کے عملی فوائد کا شوق دوسرے خالص علمی ذوق جدید معاشرتی زندگی میں اس کے بے شمار ثبوت ملتے ہیں کہ علم ہر شعبہ زندگی میں مفید ہے اور اس لئے اس کا حاصل کرنا "کامیابی" کے لئے ضروری ہے۔ انسان اپنے طبعی اور معاشرتی ماحول کے علم کے بغیر منزل مقصود تک ہرگز نہیں پہنچ سکتا۔ مگر علم کی ایک خالص محبت بھی ہوتی ہے جس کی خاطر لوگ مشقت جھیلتے

ہیں اور قربانی کرتے ہیں اور انھیں اسی میں راحت اور لذت حاصل ہوتی ہے انہیں دو چیزوں، یعنی علم کی عملی برکتوں کی خواہش اور خالص علمی ذوق، کی بدولت یونیورسٹیاں بنیں، ادب کی تخلیق ہوئی اور علمی تحقیقات کا خزانہ جمع ہوا اور ان سب باتوں نے معاشرتی زندگی کو بہت متاثر کیا۔

۱۹۳۔ جمالی ذوق اور اخلاقی احساس کی تسکین

ذوقِ جمال کی بدولت انسان نے نہ صرف فنون لطیفہ کی نشو و نما میں بلکہ صنعت و دستکاری کی ترقی میں بہت کوشش کی۔ مکان بنانے میں پہلے تو محض افادہ مدنظر تھا لیکن آگے چل کر خوبصورتی اور آرائش کا خیال غالب آ گیا۔ فن تعمیر نے، جسے ابتدا میں محض لکڑی وغیرہ کی مضبوطی اور عمارت کے عملی فائدے سے سروکار تھا رفتہ رفتہ ایک فن لطیفہ کی شان اختیار کر لی۔ اگرچہ امریکہ کے فن تعمیر میں ذوق جمال کی بہت کمی پائی جاتی ہے لیکن اب یہ رفتہ رفتہ خالص افادیت کو چھوڑ کر جمالی رنگ اختیار کر رہا ہے۔

اسی سے ملتی جلتی نیک کرداری کی خواہش ہے۔ یہ انسان کے اخلاقی نصب العین پر مبنی ہے۔ لوگوں کا طرز عمل اس خواہش سے متاثر ہوتا ہے۔ یہ ایک معاشرتی قوت بن جاتی ہے اور معاشرتی نصب العین میں داخل ہو جاتی ہے۔ اس سے معاشرتی انتخاب میں اور معاشرتی مقاصد کے تعین میں مدد ملتی ہے اور جماعت کے سامنے خوبی اور فضیلت کا ایک معیار قائم ہو جاتا ہے۔

۱۹۴۔ وہ معاشرتی قوتیں جو لوگوں کے اجتماع سے پیدا ہوتی ہیں

علاوہ ان قوتوں کے جو طبیعی ماحول اور انفرادی خواہشوں سے پیدا ہوتی ہیں اور معاشرہ بہ ہئیتِ مجموعی خود بھی اپنی نشو و نما پر اثر ڈالتا ہے۔ خود اس کے اندر سے اجتماع، شرکت اور تنظیم کی قوت پیدا ہوتی ہے۔ نفس اجتماعی بحیثیت مافوق الافراد ہستی کے کوئی مستقل اور جداگانہ وجود نہیں رکھتا مگر جماعت کے افراد میں رفتہ رفتہ متحدہ احساس خیال آزادی اور عمل کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے

یہ احساس اور عمل کا اتحاد ابتدا میں ایک لاشعوری قوت کی حیثیت رکھتا تھا جو لوگوں کے افعال پر اثر ڈالتی تھی اور انھیں رسم و آئین اور قانون کی اطاعت پر مجبور کرتی تھی۔ ابتدا میں معاشرے کی تشکیل کسی نصب العین کے مطابق یا اسے کسی مقررہ راہ پر چلانے کی کوئی شعوری متحدہ کوشش نہیں کی تھی۔ محض طبعی ماحول کے دباؤ سے اور افراد کی اس کوشش سے کہ اپنی اپنی خواہشوں کو پورا کریں معاشرہ نشو و نما پاتا رہا، اس کے رسم و رواج میں استحکام پیدا ہو گیا اور اس میں اجتماعی عمل کی صلاحیت بڑھتی گئی۔ آخر میں جب رسم و رواج زیادہ باضابطہ ہو گیا اور اس کی پابندی عام ہو گئی تو لوگوں میں ایک احساس عمومی پیدا ہو چلا جس کی پیروی فرد کو کرنا پڑتی تھی ورنہ وہ ساری جماعت کا مخالف سمجھا جاتا تھا۔ جب یہ اجتماعی رائے زیادہ واضح ہو گئی اور احساس عمومی نے ایک متعین شکل اختیار کر لی تو عمل اجتماعی کی ابتدا ہوئی یعنی ساری جماعت نے ایک ہی طرح کی رسوم و عادات کریں اور سب لوگ غیر شعوری طور پر معاشرے کی مجموعی فلاح و بہبود کے لئے مل کر کام کرنے لگے۔ رسم و رواج کا ایک بن لکھا ضابطہ پیدا ہو گیا جس کی تعمیل سختی سے ہوتی تھی کیونکہ یہ معاشرتی اتحاد و تعامل کا قدرتی مظہر تھا۔

معاشی حالات نے بھی لوگوں کو ایک خاص طرز عمل پر مجبور کیا اور گروہوں کی ناتراشیدہ معاشرتی جد و جہد میں بہت کچھ تغیر و تبدل کر دیا۔ ساتھ کام کرنے کی عادت کی بدولت آخر میں ایک جبلی اجتماعی قوت انتخاب پیدا ہو گئی جس کی وجہ سے ان سب لوگوں نے جو ایک ہی ماحول میں رہتے تھے یکساں طرز عمل اختیار کر لیا یعنی بقائے نفس اور نظم اجتماعی میں یکساں طریقوں سے کام لینے لگے اور اپنے پیشروؤں کی رسوم کی پابندی کرنے لگے۔ گر ابھی تک معاشرے کے نظم و ضبط یا تعمیر کی کوئی باضابطہ کوشش شروع نہیں ہوئی تھی۔

۱۹۵۔ شعوری سعی اجتماعی۔

آخر ایک دن معاشرے کو اپنی اس قوت کا احساس ہوا کہ وہ اپنی راہ ارتقا کو خود معین کر سکتا ہے۔ اسی کا نام معاشرتی شعور ہے۔ اب گویا نفس اجتماعی نے اپنے

آپ کو جانا اور اپنی عمل معاشرتی کے انضباط اور تشکیل کی قوت کو پہچانا۔ یہیں سے ترقی کا تصور غائی وجود میں آیا۔ رائے عامہ اجتماعی احکام اور قوانین کی صورت میں ظاہر ہو کر معاشرتی اعمال میں نظم و ترتیب پیدا کرنے لگی۔ معاشرتی مقاصد معیّن ہو گئے اور انھیں حاصل کرنے کے لئے ارادہ اجتماعی کے نام سے مدد لی جانے لگی۔ قانون عام رائے عامہ کی منظم قوت بن گیا اور لوگوں سے بزور قواعد و ضوابط کی پابندی کرائی جانے لگی۔ ارادہ اجتماعی کو عمل میں لانے کا وسیلہ حکومت قرار دی گئی۔ رفتہ رفتہ یہ خیال نمایاں ہوتا گیا کہ شعوری اجتماعی سعی کا مقصد معاشرے کی فلاح و بہبود ہے قانون کی قوت عاملہ یعنی حکومت کی حمایت کے لئے مستقل فوج بنائی گئی۔ اب معاشرہ اپنی راہ عمل خود معیّن کرتا ہے خواہ اسے مقاصد کے حاصل کرنے کے لئے تشدد سے کام لینا پڑے۔

علاوہ اس عام قوت اجتماعی کے جو معاشرتی نظم و ضبط کی ذمہ دار ہے بہت سی چھوٹی چھوٹی جماعتیں اور بھی ہیں جنھیں نظم اجتماعی کے ضمنی مظاہر سمجھنا چاہیئے مثلاً غیر سرکاری مذہبی انجمنیں، مزدوروں کی انجمنیں اور مختلف برادریاں جن کا مقصد یہ ہے کہ معاشرے کو ایک معینہ راہ پر چلائیں۔ تعلیم عامہ بھی آزادی کے صحیح طریقوں کی حمایت اور ریاست کے اداروں کی تائید کے لئے ایک بڑی قوت ہے اور کلیسا کی انجمنیں مذہبی اصول کی تبلیغ کا اور اس کی تعلیم گاہیں عقیدے کی ترقی اور استحکام کا فرض انجام دیتی ہیں۔

جوں جوں معاشرتی قوتیں زیادہ معیّن اور مستحکم ہوتی جاتی ہیں ان میں بھی غیر شعوری عمل اجتماعی کی شان پیدا ہوتی جاتی ہے۔ منظم معاشرہ ایک حد تک خود حرکی جسم بنتا جاتا ہے جو اپنی اندرونی قوت سے چلتا ہے اس لئے اب شعوری سعی بس یہیں تک محدود ہے کہ موجودہ معاشرتی عمل میں ضرورت کے مطابق تغیر تبدل کیا جائے ہیئت اجتماعی کی تشکیل ایک بار ہو چکی ہے اب اگر معاشرہ چاہے بھی تو ایک دن میں اس کی از سر نو تشکیل نہیں کر سکتا۔ لوگوں کے نمائندے جو قانون چاہیں پاس کر دیں لیکن اگر وہ موجودہ معاشرتی قوتوں یا معاشرے کی طبیعی نشو و نما کے مطابق نہیں ہے تو بالکل بے کار ثابت ہوگا اور تھوڑے دن میں متروک

ہو جائے گا۔ جو لوگ کسی نظرئے کو پیش نظر رکھ کر معاشرے کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں انھیں بہت جلد یہ محسوس ہو جاتا ہے کہ وہ رائے عامہ یا معاشرتی ارتقا کی بنیادی قوتوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے اصلاح ہمیشہ رفتہ رفتہ معاشرے کی ارتقا کے ساتھ ساتھ ہوتی ہے اور دائمی معاشرتی قوتوں اور مسلمہ عمرانی قوانین کی پابند رہتی ہے۔

باب سوم

عمرانی قوانین

معاشرے کی ابتدا اور نشو و نما اور اس کی موجودہ جد و جہد کی قوتوں کا دریافت کرنا تو سہل ہے لیکن ان قوانین کا معلوم کرنا بہت مشکل ہے جو مذکورہ بالا قوتوں کا انضباط اور حد بندی کرتے ہیں۔ یہ امر کہ معاشرے کی جد و جہد کے کچھ مقررہ قوانین ہیں اسی سے ظاہر ہے کہ معاشرتی تحریکیں ترتیب اور باقاعدگی کے ساتھ بار بار رونما ہوتی رہیں مگر ان قوانین کو وضاحت کے ساتھ معین کرنے میں بڑی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ پھر بھی بعض عمرانیوں نے اس مرحلے کو بہت کچھ طے کر لیا ہے۔

۱۹۶۔ م۔ تارد[1] کے دریافت کئے ہوئے قوانین

م۔ تارد نے اپنی کتاب "عمرانی قوانین" میں یہ کوشش کی ہے کہ معاشرتی قوتوں کے نظم و ضبط کو ان تین حرکتوں میں محدود کر دیں 'معاودت'، 'تضاد' اور 'تطابق'۔ انھوں نے یہ دکھایا ہے کہ بعض جماعت میں معاشرتی قانون پہلے اس طرح ظاہر ہوتا

[1] Mr. Tarde

ہے کہ بعض مظاہر بار بار رونما ہوتے ہیں پھر ان میں اور دوسرے مظاہر میں تضاد یا تقابل واقع ہوتا ہے اور آخر میں ان کے تطابق سے معاشرے میں ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن م۔ تارد کے یہ مفروضات مخصوص معاشرتی قوانین نہیں ہیں بلکہ وہ بنیادی اصول ہیں جن پر معاشرتی قوانین مبنی ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ علمی تحقیق کا سب سے پہلا عمل یہی ہے کہ بار بار واقع ہونے والے مظاہر دریافت کرے۔ مثلاً فرض کیجئے کہ ہئیت داں اجرامِ سماوی کی کسی حرکت کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اب اگر اس حرکت کا اعادہ نہ ہو تو اس سے کوئی علمی نتائج نہیں نکالے جا سکتے لیکن اگر یہی حرکت بار بار واقع ہو تو یہ ظاہر ہوگا کہ یہ کوئی اتفاقی چیز نہیں ہے بلکہ کسی قانون یا ضابطہ کے ماتحت ہے۔ یا اگر نباتات کا ماہر ایک پودے کی ساخت کی کوئی ترکیب یا اس کا کوئی وظیفہ مشاہدہ کرے تو اس کی نظر میں اس کی کوئی اہمیت نہ ہوگی۔ البتہ اگر یہی بات بار بار نظر آئے تو اس کی باقاعدہ یا طبیعی نشو و نما پر حکم لگایا جا سکے گا۔ اسی طرح سائنس داں کو اجسام نامیہ کے فرق اور تضاد پر غور کرنا چاہئے کیونکہ تنازع للبقا میں تفریق کا عمل برابر جاری رہتا ہے۔ تحقیق کی آخری منزل یہ ہے کہ مختلف اجزا کے باہمی تطابق پر نظر ڈالے کیونکہ اسی سے عمل ارتقا کی تکمیل ہوتی ہے۔ اب عمرانیات کی سرحد میں آئیے تو یہاں بھی قوانین دریافت کرنے میں پہلی منزل یہی ہے کہ بار بار رونما ہونے والے مظاہر یا اعمال معلوم کئے جائیں۔ پہلی نظر میں معاشرہ مختلف الانواع مظاہر کا مجموعہ معلوم ہوتا ہے اور اس میں کسی قسم کی ترکیب دکھائی نہیں دیتی۔ بہت گہرے مطالعے اور مشاہدے کے بعد اس کی ترتیب اور حرکت کی باقاعدگی کا پتہ چلتا ہے۔ اور معاشرے پر کیا موقوف ہے نباتات اور حیوانات کی دنیا کا بھی یہی حال ہے۔ غیر سائنس داں کو یہاں صرف درخت اور جانور ہی نظر آتے ہیں۔ اسی طرح طبیعی دنیا میں بھی جاہلوں کی آنکھ متفرق مظاہر کے سوا کچھ نہیں دیکھتی۔ بہت سی چیزیں زمین پر گرا کرتی ہیں اور کسی کو ان کی طرف توجہ نہیں ہوتی یہاں تک کہ نیوٹن ان کی حرکت کی یکسانی مشاہدہ کر کے کشش ثقل کا قانون دریافت کرتا ہے۔ جس طرح ساری کائنات بادی النظر میں غیر مربوط اشیاء اور مظاہر کا مجموعہ معلوم ہوتی ہے اور غور سے دیکھنے پر اس کی نظم و ترتیب

کا پتہ چلتا ہے اسی طرح یہ معاشرتی مظاہر بھی جو ظاہراً بے ربط اور منتشر ہیں سائنس داں کے مشاہدے میں مربوط اور منتظم نظر آتے ہیں۔ غرض اس میں کوئی شبہ نہیں کہ "معاودت تضاد اور تطابق کا عمل معاشرے میں برابر جاری رہتا ہے۔ البتہ اب اس کی ضرورت ہے کہ ان اعمال کے تحت میں جو مخصوص اصول اور ضوابط چھوٹے دائروں میں کارفرما ہیں وہ دریافت کیے جائیں۔ ہم ان میں سے بعض کو بہت مختصر تشریحات کے ساتھ ذیل میں درج کرتے ہیں۔

۱۹۷ - انفرادی انتخاب کے قوانین

یہ قوانین عالمگیر ہیں اور روزمرہ کی زندگی میں صاف نظر آتے ہیں۔ انفرادی زندگی کا سب سے سادہ قانون یہ ہے۔ ہر شخص کم سے کم سعی کا زیادہ سے زیادہ حاصل چاہتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خواہ حصول دولت ہو یا صرف دولت مذہب ہو یا آرٹ تہذیب ہو یا علم و فضل غرض زندگی کا کوئی شعبہ بھی ہو اس میں فرد اپنی قابلیت اور استعداد سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہتا ہے مزدور چاہتا ہے کہ جتنی زیادہ مزدوری مل سکتی ہو ملے، ماہر فن چاہتا ہے کہ ایسی جگہ پاؤں جہاں میری سعی کا انتہائی معاوضہ ملے اور تاجر کو فکر ہوتی ہے کہ ایسا کاروبار شروع کروں جس میں میری دولت نہایت تیزی سے ترقی کرے۔ لیکن "زیادہ سے زیادہ حاصل" کے مفہوم میں بہت سی چیزیں شامل ہوتی ہیں۔ جسمانی صحت ذہنی نشو و نما، مادی فلاح اور معاشرتی بہبود۔ لیکن یہ اصول عالمگیر ہے اور ہماری ساری جد و جہد میں کارفرما ہے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی شخص مذہبی تبلیغ میں مصروف ہے تو وہ بھی کم سے کم کام کے زیادہ سے زیادہ نتائج حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ نوع انسانی کی جتنی زیادہ خدمت اس سے ممکن ہو انجام دے۔

دوسرا قانون یہ ہے۔ ہر شخص کے ذہن میں ایک فرد انتخاب ہوتی ہے جس میں سب سے زیادہ مرغوب چیزوں سے لے کر سب سے کم مرغوب چیزوں تک ترتیب وار جگہ پاتی ہیں۔ یہ قانون معاشی زندگی میں سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ اور بازار کے بھاؤ کی اسی پر بنیاد ہے۔ اسی کے ذریعے سے مبادلے

کی شرح معیّن ہوتی ہے ۔ کاروباری زندگی میں ہر جگہ طلب کے یہ مدارج نظر آتے ہیں ۔ لیکن زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی یہی قانون بجنسہٖ کارفرما ہے کیونکہ افراد کی نظر میں مختلف اشیا کی جتنی قدر ہوتی ہے اسی نسبت سے ان کے عمل کی حرکات بھی مختلف ہوتی ہیں ۔ ممکن ہے کہ ایک شخص کے نزدیک مقاصدِ زندگی کی ترتیب اہمیت کے لحاظ سے حسب ذیل ہو ۔ دولت، نیکی، علم، ہر دلعزیزی فرصت و تفریح وغیرہ اور دوسرے کے نزدیک یہ ہو ۔ نیکی، علم، دولت، فرصت اور تفریح، ہر دلعزیزی وغیرہ ۔

اسی طرح یہ ہوسکتا ہے کہ ایک شخص حالات کے لحاظ سے مادی اشیا کا انتخاب اس ترتیب سے کرتا ہو ۔ غذا، لباس، کتابیں، ارٹ کی چیزیں، فرنیچر وغیرہ اور دوسرا مختلف حالات کے ماتحت انتخاب کے مدارج یہ قرار دے ۔ کتابیں، آرٹ کی چیزیں، غذا فرنیچر لباس وغیرہ ۔ ہر شخص کی خواہشوں کی ترتیب اس پر موقوف ہے کہ اس کی نظر میں مقاصد اور اشیا کی قدر کس نسبت سے ہے ۔

تیسرا مسلمہ قانون یہ ہے :۔ ہر فردِ نفس انسان میں ایک ہی ہیج یا ایک ہی قسم کے ہیجات سے یکساں حرکت پیدا ہوتی ہے ۔ یہ قانون نفس انسانی کی عالمگیر مشابہت کے اعتراف پر مبنی ہے لیکن اس کے ماتحت جزوی اعمال کو نہیں دیکھنا چاہئے ورنہ اس میں اور مذکورہ بالا قانون میں اختلاف پڑ جائے گا ۔ انسانی فطرت کے یکساں ہونے پر بہت زیادہ زور دینا ٹھیک نہیں کیونکہ گو بھوک اور سردی وغیرہ کے ہیجات کا اثر افراد پر یکساں ہوتا ہے لیکن ان کے اثر سے جو افعال واقع ہوتے ہیں ان میں بہت اختلاف ہوسکتا ہے مثلاً ممکن ہے کہ ایک شخص کسی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے محنت کرے اور دوسرا اسی خواہش کو چوری کرکے پورا کرے فرض کیجئے کہیں سیلاب آتا ہے اور بہت سے لوگ خانماں برباد ہو جاتے ہیں ۔ جو لوگ اس مصیبت سے محفوظ ہیں ان سب کے نفس میں ہمدردی اور مدد کا جذبہ پیدا ہوگا لیکن ان کے عمل میں بہت اختلاف ہوگا ۔ ایک شخص کچھ کرے گا دوسرا کچھ اور کرے گا اور اور تیسرا ممکن ہے کچھ بھی نہ کرے ۔

۱۹۸- اجتماعی انتخاب کے قوانین

اجتماعی انتخاب اور انفرادی انتخاب کے قوانین ایکساں ہوتے ہیں کیونکہ مقدم الذکر کی تعمیم، اور اتحاد کا نتیجہ ہیں۔ اجتماعی انتخاب کی بھی ایک ترتیب وار فرد ہوتی ہے جس کے ذریعہ سے نفس اجتماعی اپنے مقاصد اور اقتدار کے مدارج مقرر کرتا ہے اور ان پر معاشرتی اعمال کی بنیاد رکھتا ہے۔

گڈنگز کے نزدیک اجتماعی انتخاب کے سب سے اہم نصب العین مدارج اہمیت کے لحاظ سے حسب ذیل ہوتے ہیں۔

(۱) قوت یا اقتدار (۲) افادی صفات (۳) دیانت (۴) تکمیل ذات۔

یہ بات کہ نفس اجتماعی قوت یا اقتدار کو سب چیزوں سے زیادہ پسند کرتا ہے بادی النظر میں صحیح نہیں معلوم ہوتی لیکن اگر انسان معاشرے کے فیصلوں پر غور کرے تو اُسے چاروناچار اس کی تصدیق کرنا پڑتی ہے۔ افادی صفات کو عام معاشرے دیانت پر ترجیح دیتے ہیں، لیکن بعض جماعتیں ایسی بھی ہیں جو دیانت کو قابل قدر سمجھتی ہیں۔ یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ تکمیل ذات کا نمبر اس فہرست میں سب کے بعد آنا چاہئے کیونکہ گو جماعت فرد کی ترقی کو ایک بلاواسطہ مقصد سمجھتی ہے لیکن اور چیزوں کو اس پر مقدم رکھتی ہے۔

اس سے ایک نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ معاشرے کا قدامت پسند یا ترقی پسند ہونا اس بات پر موقوف ہے کہ اس کے مقاصد میں کسی حد تک تنوع ہے اور کہاں تک ہم آہنگی اور امتزاج پیدا ہو چکا ہے۔ جو معاشرہ گوناگوں اغراض و مقاصد رکھتا ہو وہ ترقی پسند ہوتا ہے اور جس کے مقاصد محدود اور ہم آہنگ ہوں وہ قدامت پسند ہوتا ہے۔ اسی لئے یہ کہا گیا ہے کہ "صرف وہی جماعت جس کے مقاصد میں تنوع بھی ہو اور ہم آہنگی بھی استقلال کے ساتھ ترقی کی راہ پر چل سکتی ہے" یعنی جہاں قدامت پسند اور ترقی پسند عناصر میں توازن ہو وہاں معاشرہ ایک طرف تو اضطراری حرکت سے محفوظ رہیگا اور دوسری طرف جمود سے۔

۱۹۹- اجتماعی نصب العین کے قوانین

اصل میں اجتماعی نصب العین یہ نہیں کہ معاشرے کا ایک مکمل نظام بن جائے بلکہ یہ ہے کہ اس میں طبعی رفتار سے ترقی ہوتی رہے۔ معاشرتی زندگی میں جو

نت نئے تغیرات ہوتے رہتے ہیں ان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ غالباً معاشرہ کبھی ایسے خود حرکی نظام کی شکل اختیار نہیں کرے گا جس کا عمل ہر لحاظ سے کامل اور صحیح ہو۔ انسان ہمیشہ یہ سمجھتا ہے کہ بس آئندہ صدی یا صدیوں میں معاشرہ بالکل تکمیل ہو جائے گا لیکن دوسری صدی آتی ہے تو نصب العین ہی بدل جاتا ہے اور جو چیزیں پہلے پسندیدہ سمجھی جاتی تھیں وہ اب فرسودہ اور بے کار قرار پاتی ہیں۔ اس لئے اگر معاشرے کی مختلف اجزا میں طبعی تناسب موجود ہے اور وہ ترقی کر رہا ہے یعنی باوجود تغیر حالات کے اپنے مقاصد حاصل کرتا جاتا ہے تو سمجھنا چاہئے کہ وہ اپنے اعلیٰ نصب العین کو پورا کر رہا ہے۔

"زیادہ سے زیادہ تعداد کی زیادہ سے زیادہ فلاح" یعنی جماعت کی بہبود عمل اجتماعی کا نصب العین ہے۔ یہ اصول زمانۂ حال اور زمانہ مستقبل دونوں پر حاوی ہے۔ کڈ[1] نے اپنی کتاب "مغربی تہذیب" میں اس بات کو آئندہ ترقی و تکمیل کے نام سے بہت تفصیل سے سمجھایا ہے اور یہ دکھایا ہے کہ ہم موجودہ عہد کی اصلاح اور ترقی کی جو کوشش کرتے ہیں وہ اصل میں مستقبل کے لئے ہے۔ معاشرتی زندگی کی تعمیر میں ہمارے پیش نظر وہ بالائی منزل رہتی ہے جو آنے والے زمانے میں بنے گی۔ اس لئے زیادہ سے زیادہ تعداد کی زیادہ سے زیادہ فلاح کا تعلق ان نسلوں سے بھی ہے جو ابھی تک پیدا نہیں ہوئی ہیں۔

۲۰۰۔ تقلید کے قوانین

م۔ تارد نے یہ دکھایا ہے کہ معاشرتی زندگی کی نشوونما میں تقلید کی بہت بڑی اہمیت ہے۔ شائد ہم کسی اور ذریعہ سے دوسروں سے اتنا فائدہ نہیں اٹھا سکتے جتنا تقلید کے ذریعے سے اٹھاتے ہیں۔ بچہ اپنی زندگی کے پہلے چند سالوں میں قریب قریب کل عادتیں دوسروں ہی سے سیکھتا ہے اور اس کی معلومات زیادہ تر تقلید ہی پر مبنی ہوتی ہے۔ اسی طرح غیر متمدن نسلوں میں تہذ

[1] Kidd Western Civilizational

وتمدن کی بنا تقلید سے پڑتی ہے اور مدنی زندگی کے اعلیٰ شعبوں میں بھی اس کا اثر باقی رہتا ہے تھوڑے دنوں میں ایک جماعت کی رسوم و عادات کی تقلید ساری دنیا میں ہونے لگتی ہے۔ صنعتی فنون کی اشاعت، علوم کی ترقی اور نئے آلات وغیرہ کا استعمال یہ سب چیزیں اس کی شاہد ہیں کہ زندگی کے عملی امور میں تقلید کسقدر اہمیت رکھتی ہے۔

م۔ تارد نے دو قوانین کا ذکر کیا ہے جو اجتماع اور معاشرت میں کارفرما ہیں پہلا قانون یہ ہے "اگر کوئی بیرونی مداخلت نہ ہو تو تقلید کا دائرہ ہندسی تناسب سے پھیلتا ہے" البتہ یہ شرط ہے کہ افراد کو ایک دوسرے سے ملنے جلنے کا موقع حاصل ہو۔ اگر ایک فرد نے کسی چیز میں دوسرے کی تقلید کی تو اب اس چیز کے پھیلنے کے دو ذریعہ ہو گئے۔ اگر ان دونوں کی تقلید ایک ایک شخص نے کی تو چار ذریعے ہو گئے۔ غرض اس طرح یہ سلسلہ ہندسی تناسب سے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ کسی بڑی جماعت میں جہاں ایک شخص کی تقلید بہت سے لوگ کرتے ہیں تقلید کی رفتار ہندسی تناسب سے بھی زیادہ سرعت سے بڑھ سکتی ہے۔ مجمعوں کی نفسیات اس کی شاہد ہے کہ معاشرتی عمل تقلید کے ذریعہ کس قدر تیزی سے پھیلتا ہے خبروں کی فوری تشہیر، نئی رسموں کی ترویج اور زبان خصوصاً عامیانہ محاوروں کی اشاعت کی توجیہہ اسی قانون سے ہو سکتی ہے۔

دوسرا اہم قانون یہ ہے "واسطۂ تقلید عمل تقلید میں انعطاف پیدا کر دیتا ہے۔" انعطاف کی اصطلاح طبعیات سے ماخوذ ہے۔ جو شخص کسی دوسرے کی تقلید، رفتار، گفتار لباس اور عادات میں کرتا ہے وہ کبھی اس کی ہو بہو نقل اتارنے میں کامیاب نہیں ہوتا۔ یہی صورت اس قوم کی ہوتی ہے جو کسی دوسری قوم کی تہذیب کو برتنا چاہتی ہے۔ یہ نقل کبھی اصل سے بہتر ہوتی ہے اور کبھی بدتر یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ تقلید کرنے والا فرد یا معاشرہ خود بھی اختراع کی قوت رکھتا ہے اور جو کچھ دوسروں سے حاصل کرتا ہے اس میں اپنے اندرونی حالات اور اپنے ماحول کی مناسبت سے تصرف کر لیتا ہے۔ اگر سو آدمی اتنے

قریب قریب کھڑے ہوں کہ ہر شخص اپنے پاس والے کی آواز سن سکے اور چند مقررہ الفاظ کو اس سرے سے اس سرے تک باری باری سے دہرائیں تو اکثر صورتوں میں یہ الفاظ بالکل مسخ ہو جائینگے ہمارے بڑوں کے قصوں میں ہم تک پہنچتے پہنچتے جو تصرف ہوتا ہے اور ان پر جو حاشیے چڑھتے ہیں وہ بیچ والوں کی طبیعت اور سیرت پر موقوف ہیں۔

۲۰۱- ہمدردی کا قانون

"جوں جوں ہمدردی بڑھتی ہے مشابہت بھی بڑھتی جاتی ہے" ہمدردی سب سے زیادہ ان جماعتوں میں ہوتی ہے جو بہت سے کام مل کر کرتی ہیں مشترک اغراض مشترک جذبات اور احساسات سے لوگ ایک دوسرے کی طرف کھنچتے ہیں اور ان میں باہم ہمدردی نشو و نما پاتی ہے۔ عموماً انسانوں کو جتنی ہمدردی ایک دوسرے سے ہوتی ہے جانوروں سے نہیں ہوتی جن نسلوں میں تہذیب مساوی ہو ان میں مشترک اغراض، پیدا ہو جاتی ہیں اور ان کی بدولت ہمدردی بڑھ جاتی ہے۔ اسی طرح اُن افراد میں جن کی معاشرتی حیثیت برابر ہوتی ہے یا جن کے مشاغل یکساں ہوتے ہیں، باہمی ہمدردی کا رشتہ مضبوط ہوتا ہے اور ان لوگوں میں جنھیں ایک دوسرے سے سیرت تہذیب یا پیشے میں اختلاف کا احساس ہو بہت کم ہمدردی ہوتی ہے۔

۲۰۲- شعوری مشابہت کے قوانین

مشابہت کے احساس اور ہمدردی کی وجہ سے انسانوں میں معاشرتی اتحاد پیدا ہوتا ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ کچھ لوگ احساس خیال، مذاق وغیرہ میں ہم سے مشابہہ ہیں تو ہمارے تعلقات ان سے بڑھ جاتے ہیں۔ خیال اور احساس کا اتحاد ہی خالص معاشرتی اتحاد کی بنیاد ہے۔ گڈنگز نے اس اصول کو "شعور اتحاد نوعی" کے نام سے بہت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے، جو پوری طرح کامیاب نہیں ہوئی، کہ اتحاد نوعی کا شعور بنیادی معاشرتی قوت ہے جس کی بدولت لوگ ایک جگہ جمع ہوتے ہیں اور ان میں معاشرتی

اتحاد پیدا ہوتا ہے۔ ہم اس چیز کو بنیادی معاشرتی قوت تو تسلیم نہیں کر سکتے مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ساری معاشرتی دنیا میں یہ اصول کارفرما نظر آتا ہے کہ لوگ "ہمدردی" اور "ہم خیالی" کے احساس کی بدولت ایک معاشرے میں متحد ہوتے ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ان چیزوں کی کشش کتنی ہی قوی کیوں نہ ہو مستقل معاشرتی اتحاد کا انحصار مشترکہ اغراض پر ہے۔

جبلی طور پر انسان اپنے رفیقوں کا انتخاب ہمدردی یا کسی مشترک خیال جذبے یا حالت کی بنا پر کرتا ہے۔ مذہبی انجمنوں، راہبوں کے سلسلوں، کلب، گھرو صحبتوں اور مجلسوں، سب کی نشو و نما اس اصول سے متاثر ہوتی ہے۔ سچ پوچھئے تو ہماری قومی زندگی کا استحکام اسی احساس پر مبنی ہے کہ ہم سب شہریوں کے حقوق و فرائض وغیرہ کے چند خاص اصولوں کے حامی ہیں اور آزادی اور نظم اجتماعی کے متعلق یکساں خیالات و جذبات رکھتے ہیں۔ یہ احساس تمام معاشرتی اعمال میں پایا جاتا ہے۔

۳-۲۰- اضطراری عمل اجتماعی کے قوانین

(۱) اضطراری عمل اجتماعی ہندسی تناسب سے پھیلتا اور بڑھتا ہے، یہ قانون تقلید کے پہلے قانون سے مشابہہ ہے۔ تقلید اور اضطراری عمل اجتماعی میں بہت فرق ہوتا ہے لیکن عموماً یہ دونوں چیزیں ایک ہی وقت میں اور ایک ہی طرح واقع ہوتی ہیں۔ نفس اجتماعی کسی جماعت کے افراد کے متحدہ خیال و احساس اور ارادے کو کہتے ہیں۔ اس لئے اضطراری عمل اجتماعی کے واقع ہونے کی یہی صورت ہے کہ ایک مجمع کے افراد سے ایک ہی وقت میں ایک ہی مقصد کے لئے کوئی فوری حرکت سرزد ہو۔ لیکن یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ اس حرکت کے ایک سے دوسرے تک پہنچنے میں تقلید کو کہاں تک دخل ہے اور یہ کتنی سرعت سے کام کرتی ہے۔ آنکھ کے ایک اشارے میں، ہاتھ کی ایک جنبش میں یہ لہر ایک نفس سے دوسرے نفس میں منتقل ہو سکتی ہے۔ ایک لفظ کے منہ سے نکلتے ہی ہر دل میں ایک ہی خیال دوڑ جاتا ہے بلکہ ہر شخص ایک ہی کام کر گزرتا ہے۔

"اضطراری عمل اجتماعی عموماً بالواسطہ اور پیچیدہ ذرائع کے استعمال سے تناسب معکوس رکھتا ہے"۔ جوں جوں معاشرے کی زندگی میں پیچیدگی بڑھتی جاتی ہے اس اضطراری عمل کی صلاحیت کم ہوتی جاتی ہے۔ بچہ سیدھا اور سادہ طرز عمل اختیار کرتا ہے مگر بالغ انسان پیچ در پیچ رستے سے اپنے نتائج تک پہونچتا ہے اور اپنے مقاصد حاصل کرتا ہے۔ سادہ معاشرہ بچے کی تقلید کرتا ہے اور پیچیدہ معاشرہ بالغ شخص کی۔ جیسا معاشرتی زندگی کا عام قاعدہ ہے یہاں بھی حرکت مرکز سے شروع ہو کر ہر سمت پھیلتی ہے اس لئے اس کی رفتار مربع کے حساب سے بڑھتی ہے۔ معاشرتی قوتیں ایک خطِ مستقیم میں حرکت نہیں کرتیں بلکہ دوسری قوتوں کے اثر سے ان کا رخ بدل جاتا ہے۔

۴۰۴۔ روایات کے قوانین

غیر متمدن معاشرے میں افراد پر روایات کا اثر بہت زبردست تھا اور ایک حد تک اب بھی ہے مگر علمی ترقی کے ساتھ ساتھ یہ اثر کم ہوتا جاتا ہے۔ اس تغیر رفتار کو حسب ذیل قانون کے ذریعے سے ظاہر کر سکتے ہیں "روایات کا تحکم اور دباؤ اسی نسبت سے ہوتا ہے جس نسبت سے ان کے موضوع میں عقیدے کا عنصر زیادہ اور تنقیدی علم کا عنصر کم ہو"۔ روایات سے تنقیدی تاریخ تک انسان بہت دن میں پہنچتا ہے لیکن جب یہ مرحلہ طے ہو جائے تو روایات کی حکومت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ دوسرا قانون یہ ہے "روایات کا تحکم اور دباؤ ان کی قدامت کی نسبت سے ہوتا ہے"۔ جو لوگ تنقیدی علم کے اہل نہیں یا اس کے قائل نہیں ان پر صرف قدیم ترین خیالات کا اثر ہوتا ہے روایات کا اعتقاد تحقیق کے معیار کو قبول نہیں کرتا۔ لیکن لوگ پچھلے سال کی روایتوں کو ماننے میں تامل کرتے ہیں اور ہزارہا برس پہلے کی روایات پر آنکھ بند کر کے ایمان لے آتے ہیں۔ سب سے زیادہ مشکل لوگوں کے دل سے ان خیالات کا دور کرنا ہے جنھیں صدیوں سے نسلاً بعد نسلٍ مانتے چلے آئے ہیں۔ سائنس کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ اس نے لوگوں کو یہ سکھا دیا ہے کہ صرف انھیں باتوں کو مانیں جو یا تو عقلی استخراج سے ثابت ہو سکیں

یا بے شمار واقعات کی شہادت سے۔ اگر شاعر کا یہ قول صحیح ہے کہ "زمانہ پرانے زمانے کی اچھی چیزوں کو خراب کر دیتا ہے" تو یہ بھی صحیح ہے کہ سائنس قدیم روایات کو باطل کر دیتی ہے۔

۲۰۵- بقا اور ترقی کا قانون

قانون بقا جو انفرادی جسم حیوانی کی نشوونما میں کارفرما ہے اجتماعی اداروں پر بھی حاوی ہے۔ یہ قانون حسب ذیل ہے "ہر رسم اور دستور استعمال سے قوت پکڑتا ہے اور عدم استعمال سے کمزور یا معدوم ہو جاتا ہے" اجتماعی ترقی کی راہ میں بہت سے دستور اور رسمیں نظر آتی ہیں جو متروک یا معدوم ہو چکی ہیں۔ جب کوئی معاشرہ اپنی ترقی کی کسی منزل میں کوئی رسم و آئین، یا عادت یا دستور اختیار کرتا ہے تو جب تک وہ معاشرتی زندگی کے طبعی وظائف پورا کرتا رہے اسے رہنے دیتا ہے اور جب بیکار ہو جائے تو اسے ترک کر دیتا ہے۔ فرد قوانین ایسے قانونوں سے بھری ہوئی ہے جو کسی زمانے میں زندہ تھے اور اب مردہ ہیں۔ آج کل کی اجتماعی عادتیں چند صدی پہلے کی عادتوں سے بہت مختلف ہیں۔ جوں جوں معاشرے کی نشوونما ہوتی ہے بیکار چیزیں معدوم ہوتی جاتی ہیں۔ نئے شعبے اور وظیفے پرانے شعبوں اور وظیفوں کی جگہ لیتے جاتے ہیں۔ ان میں سے جو معاشرے کی طبعی زندگی کے لئے مناسب نہیں وہ بہت جلد عدم استعمال سے مٹ جائینگے جس طرح جسم انسانی کے اعضا یا وظائف غذا نہ پہنچنے سے معدوم ہو جاتے ہیں۔

مندرجہ بالا قوانین کے علاوہ اور قانون بھی دریافت ہو چکے ہیں اور جوں جوں عمرانیات ترقی کرے گی بہت سے اور دریافت ہوتے رہینگے۔ لیکن جتنے قوانین ہم نے بیان کئے ہیں انھیں عام اور کلی کہہ سکتے ہیں۔ جوں جوں معاشرے کے مختلف حصے زیادہ مربوط، معیّن اور واضح ہوتے جاتے ہیں اس کے اعمال میں عمومیت زیادہ ہوتی جاتی ہے اور نئے نئے قوانین دریافت ہوتے ہیں اور منضبط کئے جاتے ہیں۔

باب چہارم

نفسِ اجتماعی

۲۰۶۔ اجتماع کا پہلا نتیجہ

معاشرتی زندگی کی بنیاد عمل اجتماع پر ہے کیونکہ اگر لوگ ایک جگہ جمع نہ ہوتے تو وہ چیز جو معاشرہ کہلاتی ہے ہرگز وجود میں نہیں آسکتی تھی۔ اس اجتماع کے پہلے نتیجوں میں سے ایک یہ تھا کہ سارے گروہ میں متحدہ خیال، احساس اور ارادے کی صلاحیت پیدا ہوئی۔ اسی کو نفس اجتماعی کہتے ہیں۔ ورنہ افراد کے عمل کے ماورا کوئی مافوق الافراد نفس موجود نہیں ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ جماعت میں منفرد نفسوں کے خیالات، جذبات اور احساسات کے اتحاد سے ایک نئی نفسی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس نفس اجتماعی کو عام اصطلاح میں رائے عامہ یا ارادۂ عامہ کہتے ہیں۔ نفس اجتماعی جدا گانہ ہستی تو نہیں رکھتا لیکن یہ ایک افراد سے بالاتر قوت ہے جو اکثر اس پر اثر ڈالتی ہے اور اسے ایک خاص طرز عمل اختیار کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ یہ قوت متحدہ عمل سے وجود میں آتی ہے اور رفتہ رفتہ ارادۂ عامہ کے ساتھ ساتھ اسے اجتماعی

تجربے کا ذخیرہ بھی حاصل ہوتا جاتا ہے۔ یہ "تجربے کا سرمایہ" نفس اجتماعی میں استقلال و استحکام پیدا کرتا ہے جس کی وجہ سے اس میں اور انفرادی نفس میں ایک گونہ مشابہت ہو جاتی ہے۔ مثلاً جب دریائے کنار کسی میں طوفان آیا تو اس کی وادی کے ہر باشندے کو سخت حیرت ہوئی۔ یہ حیرت کا عام احساس ان لوگوں تک محدود نہیں تھا جنھیں نقصان پہنچا بلکہ ان سے ہمدردی رکھنے والے بھی اس میں شریک تھے۔ اس کے بعد پریشانی کا احساس پیدا ہوا کیونکہ بہت سے لوگوں کے جان و مال کو نقصان پہنچنے کا خوف تھا۔ پھر مصیبت زدوں سے ہمدردی کا جذبہ اٹھا جس میں ساری جماعت ایکدل تھی۔ اس کے بعد امداد پہنچانے کی تجویزیں ہونے لگیں۔ اس معاملے میں لوگوں کی مختلف رائیں تھیں آخر میں عام جلسوں میں بحث کرنے کے بعد لوگوں نے یہ طے کرلیا کہ فلاں طریقہ سب سے بہتر ہے۔ اس خیال میں جماعت کے اکثر افراد شریک تھے اب اس تجویز پر عمل کرنے کے ارادے کی باری آئی۔ کمیٹیاں بنائی گئیں، عہدہ دار منتخب ہوئے اور لوگوں کو امداد پہنچانے کے لئے چندے کئے گئے۔ اس طرح نفس اجتماعی کا عمل واقع ہوا۔ چاہے اکا دکا اشخاص کا احساس اس سے مختلف رہا ہو یا بعض لوگوں کی رائے طریق عمل کے متعلق کچھ اور رہی ہو لیکن ان سب کو ارادۂ اجتماعی کے آگے سر جھکانا پڑا اور نفس اجتماعی کا حکم ماننا پڑا۔ نفس اجتماعی تنظیم کی ایک اعلیٰ صورت ہے اور ایک حقیقی معاشرتی قوت ہے۔

۲۰۷۔ شعور اجتماعی

نفس اجتماعی منفرد نفسوں کے اضطراری افعال کے اتحاد سے خود بخود وجود میں آتا ہے لیکن فرد کی شعوری سعی معاشرے کی شعوری سعی سے بہت مختلف ہے مقدم الذکر کا وجود موخر الذکر سے علیحدہ بھی ہو سکتا ہے۔ ہر فرد جان بوجھ کر اپنا کام کرتا ہے اور اپنی اغراض پوری کرنا چاہتا ہے جن کا معاشرے کی اجتماعی اغراض سے ہم آہنگ ہونا ضروری نہیں۔ پھر بھی فرد معاشرتی زندگی کا ایک جزو ہے اور جب بہت سے افراد مل کر ایک خاص قسم کی معاشی

زندگی اختیار کرتے ہیں تو ان کی جد و جہد سے معاشرے کا کوئی شعبہ تعمیر ہوتا ہے یا کوئی وظیفہ پورا ہوتا ہے۔ بہت سی صنعتیں اسی طرح بغیر اجتماعی بہبود کا خیال کئے ہوئے وجود میں آئی ہیں۔ معاشرہ اس بات کا کوئی عام قاعدہ مقرر نہیں کرتا کہ فلاں قسم کا مال اتنا بنے۔ ملک میں ریل کی لائنیں اتنی ہوں ایک شہر میں دوکانوں کی تعداد یہ ہو اس سے زیادہ نہ ہو البتہ طلب اور رسد کا قانون گو وہ کسی قدر غیر معیّن ہے، اشیا کے بنانے والے تاجر کو یہ بتاتا ہے کہ اسے خود اپنے فائدہ کے لئے فلاں کام کرنا چاہیئے۔ اور فلاں کام نہ کرنا چاہیئے۔ وہ ایک طرح سے معاشرے کی خدمت انجام دے رہا ہے لیکن اس کا اصل مقصد یہ ہے کہ اپنی آمدنی بڑھائے چونکہ افراد عموماً اپنی اغراض کو مدنظر رکھتے ہیں اور اس کا لحاظ نہیں کرتے کہ ان کے افعال کا عام اثر اجتماعی زندگی پر کیا ہوگا اس لئے اجتماعی اداروں کی نشوونما گویا غیر شعوری طور پر ہوتی ہے۔ لیکن معاشرے کی زندگی میں ایک وہ منزل آتی ہے جب اسے یہ شعور پیدا ہو جاتا ہے کہ کونسا کام اس کی اجتماعی فلاح کے لئے مفید ہے اور کونسا مضر اور وہ عام معاشرتی طرزِ عمل کو معیّن کرنے کے لئے سوچ سمجھ کر تدابیر اختیار کرتا ہے۔ ان میں سے چند وضع قوانین، تعلیم اور تنظیم پولیس ہیں۔ دو گریف[1] نے یہ ثابت کیا ہے کہ قریب قریب کل انسانی ضروریات جن کا تعلق معاشی پیدائش یا صرف بقائے نسل سے ہے غیر شعوری معاشرتی حالات سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ آسانی سے نکلتا ہے کہ جن اعمال کا دار و مدار شعورِ اجتماعی پر ہے وہ نظم و ضبط اور تعلیم ہیں۔ معاشرتی جد و جہد کے ان دونوں شعبوں کو یہاں بہت وسیع نظر سے دیکھنا چاہیئے۔

شعورِ اجتماعی کے عمل کو سمجھنے کے لئے ایک لڑکے کی نشوونما پر نظر ڈالئے۔ وہ کھانا اس خیال سے نہیں کھاتا کہ بڑھ کر بالغ انسان بن جائے بلکہ اس لئے کھاتا ہے کہ اسے بھوک لگتی ہے۔ وہ کھیل اس نیت سے

[1] De Greef

نہیں کھیلتا کہ اس کے جسم میں طاقت آجائے یا اس کی ذہنی قوتیں نشوو نما پائیں بلکہ محض تفریح کی غرض سے کھیلتا ہے مگر ممکن ہے ایک دن اسے یہ احساس پیدا ہو جائے کہ وہ جسم رکھتا ہے جسے قابو میں لاتا ہے اور ذہن رکھتا ہے جسے نشوو نما دیتا ہے۔ اب وہ اپنی زندگی کی تشکیل ایک خاص طرز پر ایک خاص مقصد کے لئے کرتا ہے کہ اپنے نفس کی اصلاح کرے۔ اسے اپنی عادتیں ناپسندیدہ معلوم ہوتی ہیں اور وہ انہیں چھوڑ کر نئی عادتیں اختیار کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طرح پر اپنے معلموں کی مدد سے اور معاشرتی زندگی کے اثر سے وہ شعوری ارادی کوششوں سے اپنی زندگی از سر نو تعمیر کرتا ہے۔ اسی طرح معاشرہ بھی ابتداً میں جو اجتماعی اعمال انجام دیتا ہے ان میں اس کے پیش نظر معاشرتی زندگی کی تعمیر، تبدل یا ترمیم کا مقصد نہیں ہوتا۔ مگر ایک وقت آتا ہے جب اسے اپنی وجود اور اپنی حالت کا، اپنے نقائص اور انہیں دور کرنے کی قوت کا احساس ہوتا ہے۔ اب یہ شعوری سعی شروع ہوتی ہے کہ معاشرتی زندگی از سر نو تشکیل پائے یا اس کی موجودہ حالت میں ترمیم کیجائے۔ وہ اس کی کوشش نہیں کرتا کہ ساری عمارت کو گرا کر پھر سے بنائے بلکہ اس میں حسب ضرورت مرمت اور اصلاح کر دیتا ہے۔ اس کوشش کا اظہار ان اخلاقی فیصلوں سے ہوتا ہے جو اجتماعی اعمال کے متعلق کئے جاتے ہیں ان قوانین سے جو معاشرے کو ایک خاص راہ پر چلانا چاہتے ہیں اور نئے خیالات کی تبلیغ و اشاعت سے جو مصلحوں کے فرقے کرتے ہیں۔ جن تحریکوں کا دار و مدار شعور اجتماعی پر ہے ان کی رفتار ان اعمال سے کم ہوتی ہے جو شعور انفرادی سے وابستہ ہیں کیونکہ معاشرے کے مختلف حصوں میں اس قدر ربط و اتحاد نہیں ہے جتنا فرد کے اعضا اور قویٰ میں ہے۔ اس لئے شعور اجتماعی کی نشو نما کے لئے تبلیغ و اشاعت، تعلیم اور خبر رسانی کے بہتر وسائل کی ضرورت ہوتی ہے۔ آہستہ آہستہ یہ شعور مستحکم اور متعین ہو جاتا ہے۔

لیکن چونکہ زندگی کی کل جزویات کی معاشرتی تنظیم نہیں ہو سکتی اس لئے بہت سی چیزیں معاشرے کے غیر شعوری یا اضطراری عمل پر چھوڑ دی جاتی ہیں

جس پر معاشی رنگ غالب ہے۔ یعنی معاشرتی زندگی خودحر کی بن جاتی ہے اور ارکان معاشرہ کے متحدہ ارادے کی پابند نہیں رہتی۔ اشتراکیوں کے نزدیک یہ بڑا نقص ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ معاشرتی تنظیم اسقدر مکمل ہو سکتی ہے کہ معاشی اور معاشرتی زندگی کی تمام جزویات پر حاوی ہو جائے۔ مگر لوگوں کو یہ شبہ ہے کہ اگر حکومت اس کا تعین کرنے لگے کہ سال بھر میں غلہ اتنا پیدا ہو، مویشیوں کی نسل میں اس حد تک افزائش ہو اور فلاں گروہ فلاں چیز کی کاشت کرے تو معاشی نظام پر کچھ اچھا اثر نہیں پڑے گا یہ کیسے مان لیا جائے کہ حکومت لوگوں کی طرف سے اشیا کی پیداوار اور نرخ میں مداخلت کرنے لگے تو تجارتی کاروبار موجودہ حالت سے، جبکہ افراد اپنے فعل کے مختار ہیں اور کم سے کم سعی سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، زیادہ قابل اطمنان یا معاشی حیثیت سے بہتر ہو جائے گا؟ اس لئے معاشرہ یا نفس اجتماعی اکثر جزویات کو افراد کے غیر شعوری اتحاد عمل پر چھوڑ دیتا ہے اور ان میں مداخلت نہیں کرتا بلکہ وہ صرف معاشرتی زندگی کے عام اصولوں سے سروکار رکھتا ہے اور اپنی قوت کو اجتماعی تحریکوں کا رخ بدلنے میں صرف کرتا ہے۔

۲۰۸۔ معاشرے کی ترتیب کا بدلنا

جس طرح فرد اپنی طبیعی اور معاشرتی ماحول سے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے اسی طرح نفس اجتماعی بھی ہمیشہ مستعد رہتا ہے کہ اس کی ترتیب کو بدلے اور اسے تقاضائے فطرت اور ارادۂ انسانی کے مطابق بنائے۔ گو منظم معاشرہ ایک مستقل بالذات کل ہے جس کے اجزا ایک دوسرے سے وابستہ ہیں اور یہ اجزا ہمیشہ باقی رہتے ہیں تاہم ان کو ایک دوسرے سے اور کل معاشرے کو طبیعی ماحول سے ہم آہنگ کرنے کے لئے تبدیل ترتیب کا عمل ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ یہی نفس اجتماعی کا خاص وظیفہ ہے۔ اس کا اظہار احساس اجتماعی، ارادۂ اجتماعی، عام رائے اور عام

اخلاقی حس یا قوانین وضوابط کی صورت میں ہوتا ہے۔

۲۰۹۔ نفس اجتماعی کے باضابطہ مظاہر

نفسِ اجتماعی کے اس عمل کا اثر مجموعی قومی زندگی میں اور اس کے اہم حصوں میں ہر جگہ نظر آتا ہے۔ قومی پالیسی جب مستحکم ہو جاتی ہے تو اس کے اثرات فوجداری قانون سے زیادہ قوی ہوتے ہیں۔ سیاسی پارٹیاں اپنی اپنی پالیسی رکھتی ہیں جو ان کے مشترک خیال اور ارادے کا آئینہ ہوتی ہے۔ مذہبی فرقوں کے عقائد معاشرے کے عام نصب العین اور معاشرتی اقتدار کا اخلاقی معیار اور ان کی ترتیب یہ سب چیزیں نفسِ اجتماعی کے مظاہر ہیں یہ بات معاشرتی اقدار کے مراتب تو معاشرہ معین کرتا ہے اس بات کا ثبوت ہے کہ خود یہ اقدار بھی جماعت کے مشترکہ عمل سے وجود میں آئی ہیں مشترک آسمانی کتاب، مشترک مذہب اور مشترک مسلک اور وطن کا تصور بھی افراد کے دل میں اجتماعی جذبہ پیدا کرتا ہے اور اجتماعی عمل کا محرک ہوتا ہے اس طرح کے عمل اور جواب عمل سے نفس اجتماعی اپنا تفوق افراد پر ثابت کرتا ہے۔

باب پنجم

نفسی کیفیات اور اعمال

۲۱۰ - نفسی قوتیں -

پچھلے دو بابوں میں ہم یہ دکھا چکے ہیں کہ انسانی معاشرے کی تنظیم اور نشو و نما کے کل عناصر میں نفسیاتی عنصر کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ معاشرتی زندگی کی ہر شکل میں اور ہر دور میں موجود رہتا ہے ہر قسم کے تعامل اور منظم سعی میں نفسیاتی قوت ہی افراد کو باہم مربوط رکھتی ہے۔ نفسیات اجتماعی اصل میں عام عمرانیات کا ایک اہم حصہ ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ نفس اجتماعی کو افراد جماعت کے عمل کی تشکیل میں بہت کچھ دخل ہے۔ وہ محض افراد کے نفسوں کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک ایسی قوت جس پر نفس انفرادی کو بہت کم قدرت حاصل ہے اسے فرد کی ذات سے علیحدہ ایک مستقل ہستی سمجھنا تو صحیح نہیں مگر وہ ایک مافوق الافراد قوت ضرور ہے جس کا عمل کسی فرد واحد کا پابند نہیں۔ غرض یہ قوت جس کے اثرات ہم دیکھتے ہیں اور بیان کرتے ہیں یعنی نفس اجتماعی

ایک علیحدہ خود بخود وجود میں آنے والا عامل ہے جسے فرد واحد سے کوئی واسطہ نہیں صرف جماعت سے بہ ہئیتِ کلّی سروکار ہے۔ معاشرے کے نفسی کیفیات اور اعمال اسی کے مظاہر ہیں۔

۲۱۱- احساس

اجتماعی نفسی کیفیات اور اعمال اسی معمولی طریقے سے ظاہر ہوتے ہیں جیسے انفرادی نفس کی جد وجہد۔ اس کے جذبی عنصر کے ظاہر ہونے کی کئی صورتیں ہیں۔ جب ایک جماعت کو دوسری جماعت سے سابقہ پڑتا ہے تو ردِ عمل یا جواب عمل دو قسم کا ہوتا ہے۔ جذبی عنصر زیادہ قوی تو ان احساسات میں ہوتا ہے جو ایک جماعت خود اپنی زندگی کے متعلق رکھتی ہے مگر اس کا زیادہ وضاحت سے اظہار دو جماعتوں کے باہمی تعلقات میں ہوتا ہے۔ انھیں تعلقات کی بدولت نسلی احساس پیدا ہوتا ہے جس سے انسانی زندگی ہمیشہ بہت متاثر ہوتی رہی ہے۔ ایک جماعت جو جذبات دوسری جماعت کی طرف سے رکھتی ہے اس کا بھی مقدم الذکر پر بڑا اثر پڑتا ہے۔ مختلف جماعتوں اور قبیلوں کے احساسات اور جذبات کا ایک دوسرے پر جو عمل اور ردِ عمل ہوتا ہے اس سے ان کے باہمی تعلقات معین ہو جاتے ہیں اور ان کے کردار پر بھی اس کا اثر پڑتا ہے۔

لیکن خاص طور پر جذبی عنصر کا اظہار بے قاعدہ مجمعے یا گروہ کی نفسی کیفیات میں ہوتا ہے۔ جہاں لوگوں کا ایک بیچ میل مجمع اکٹھا ہو جاتا ہے تو اس کا عمل بہ مقابلہ عقل کے جذبات سے زیادہ متاثر ہوتا ہے۔ مجمعے کی حیثیت ایک نئے معاشرے کی سی ہوتی ہے جس نے ابھی پوری طرح نشوونما نہ پائی ہو اور اس پر جذبی عنصر اسی طرح غالب ہوتا ہے جیسے ایک خام کار نوجوان پر۔ اس کی حرکت جذبی یا اضطراری ہوتی ہے اور بعض وقت اس کے افعال کی محرک کوئی جبلت ہوتی ہے جو وحشی درندوں کی جبلت کی طرح قوی اور خونخوارانہ ہوتی ہے۔ جوں ہی مجمع عقل کا اثر قبول کرنے لگتا ہے تو یا تو وہ منتشر ہو جاتا ہے یا ایک پائدار نظام میں جو عقل و فہم پر مبنی ہے منظم ہو جاتا ہے۔

اس لئے بے قاعدہ مجمع ہمیشہ معاشرے کے لئے ایک خطرناک عنصر ہے گو بعض وقت یہی مجمع اصابت رائے اور فوری انصاف سے بھی کام لیتا ہے۔ ایسا اجتماع معاشرتی نشوونما کی ایک بہت ادنے شکل ہے اور اسے روکنے کی کوشش کرنا چاہئے۔ تاہم اس میں بعض خوبیاں بھی ہوتی ہیں مثلاً ایک مجمع اس شخص کے خلاف جس نے کسی فرد کا یا معاشرے کا شرمناک گناہ کیا ہے جتنی جلدی اظہار رائے کرتا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ انصاف کا گہرا احساس اور اسے عمل میں لانے کی ہمت رکھتا ہے۔ خرابی جو کچھ ہے اس کے طریقہ عمل میں ہے اگر انصاف کی خواہش کے ساتھ بجائے تشدد کے ضبط سے اور بجائے وقتی جوش کے صبر سے کام لے تو وہ ہر شخص کا یہ حق تسلیم کرے گا کہ اس کے جرم کی غیر جانبدار قانونی عدالت میں تحقیقات کیجائے۔ مجمع کی ایک اور خوبی یہ سمجھی جاسکتی ہے کہ اس کے اثر سے عدالتیں اور قانون ساز جماعتیں انصاف کرنے میں عجلت کرتی ہیں اور ہر شخص کو بلا خوف وخطر اور بے رو رعایت جزا اور سزا دیتی ہیں۔

لیکن معمولی عمل اجتماعی میں بھی احساس یا جذبے کا ایک عنصر ہونا لازمی ہے۔ یہ ایک بہت بڑی قوت محرکہ ہے جو معاشرے کو ایک معینہ مقصد کی طرف لے جاتی ہے۔ بغیر احساس یا جذبے کے رفاہِ عام کا کوئی کام انجام نہ پا سکتا۔ جماعت کی اصلاح کی خواہش اصل میں باہمی ہمدردی کی بنا پر پیدا ہوتی ہے۔ بے شک عقل وتمیز اور علم بہت قابل قدر چیزیں ہیں کیونکہ ان کے بغیر منظم معاشرے کا وجود ناممکن ہے۔ لیکن ان کے ساتھ زندگی کے جذبی پہلو کو بھی نہیں بھولنا چاہئے کیونکہ اسی سے اچھی اور بری دونوں طرح کی تحریکات عمل پیدا ہوتی ہیں جن کی بدولت عقل وتمیز کو کام کرنے کا موقع ملتا ہے۔

۲۱۲۔ علم۔

علم نفس انسان کی رہنما قوت بن گیا ہے۔ اسے جذبات کی نظم وضبط میں بہت دخل ہے۔ واقعات پر غور کرنے سے اضطراری عمل کا جوش کم ہو جاتا ہے

بہ شرطیکہ معاملے کے تمام پہلو پیش نظر ہوں۔ مگر معاشرے کے مختلف حصوں کے متحدہ عمل کے لئے تو علم کا ہونا بالکل لازمی ہے۔ اگر جماعت کی آبادی اس قدر منتشر ہے کہ افراد یا چھوٹی چھوٹی جماعتیں ایک دوسرے کے حال سے بے خبر ہیں تو متحدہ عمل اجتماعی کا امکان ہی نہیں۔ سچ پوچھئے تو معاشرے کی تعمیر میں بہت سی دقتیں محض ناواقفیت کے سبب سے پیش آتی ہیں۔ عالمگیر علم یا عالمگیر خیال کی قوت کا پورا اندازہ کرنا ناممکن ہے۔ لوگوں نے تار برقی کے اثر کے بارے میں بہت کچھ بحث کی ہے۔ ایک خبر کا ساڑھے نو منٹ میں ساری دنیا میں پہنچ جانا، مشرق کے واقعات کا مغرب کو دم بھر میں علم ہو جانا اور لوگوں کا ایک ہی وقت میں ایک ہی بات کو سوچنا اس بات کا ثبوت ہے کہ انسانی زندگی کا علم عالمگیر ہوتا جاتا ہے۔ ٹیلیفون کا اثر بھی کچھ کم حیرت خیز نہیں۔ اس کی بدولت ہر قسم کی معلومات کی اشاعت اس طرح ہوتی ہے کہ ایک معاشرے کے اندر جو کچھ واقع ہوتا ہے اس کا علم ہر شخص کو ذرا سی دیر میں ہو سکتا ہے۔ ان ایجادوں اور ڈاک کی بدولت ساری جماعت کو ہر اہم واقعے کا علم ایک ہی وقت میں ہو جاتا ہے اور ہر شخص اس کے متعلق کم و بیش ایک ہی قسم کی رائے قائم کرتا ہے۔ انہیں چیزوں سے اس کا موقع ملتا ہے کہ رائے عامہ کی تشکیل اور ارادہ اجتماعی کا اظہار سرعت اور وضاحت سے ہو۔ ان جدید اختراعات سے پہلے جب ملکوں کی آبادی منتشر ہوتی تھی اور لوگوں کے پاس تبادلہ خیالات کے وسائل نہیں تھے تو معاشروں کی حالت کس قدر مختلف تھی۔ ایک ہی معاشرے کی دور افتادہ بستیوں سے خط و کتابت میں مہینے بلکہ برس لگ جاتے تھے۔ جب سے امریکہ کے مغربی حصوں میں ٹیلیفون لگ گیا ہے اور دیہات میں ڈاک پابندی سے تقسیم ہوتی ہے وہاں کی زراعت پیشہ جماعتوں کی زندگی کچھ اور ہی ہو گئی ہے۔

غرض اس علم یا واقفیت کا افراد یا جماعت کے باہمی تعلقات اور تعامل پر بڑا زبردست اثر پڑا ہے۔ جہاں بازار سے خبر آئی کہ گیہوں کا بھاؤ فی بشل ۵ سینٹ بڑھ گیا ہے بہت سے کسان فوراً اپنے اپنے

گیہوں لے کر منڈی میں پہنچ جاتے ہیں ہر شخص کو اپنی فکر ہوتی ہے اور یہ خیال نہیں آتا کہ دوسرے بھی یہی کریں گے اور اگر آتا بھی ہے تو وہ یہ نہیں سوچتا کہ بازار میں دفعتہً اتنا غلہ پہنچ جانے سے بھاؤ گر جائے گا۔ اسی طرح اگر ایک کسان کوئی نئی قسم کا بیج یا کاشت کا نیا طریقہ دریافت کرتا ہے یا کوئی نئی مشین منگواتا ہے تو اس کے ہمسائے پر یہ اثر پڑتا ہے کہ وہ بھی وہی علم یا وہی فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس احساس کا بھی کہ ہر شخص کو یکساں واقفیت حاصل ہے نہ صرف انفرادی عمل پر بلکہ اجتماعی عمل پر اثر پڑتا ہے۔ یہ اشتراک عمل نفس اجتماعی کے فیصلے کا جس پر جماعت کے عقلی اتحاد عمل کا انحصار ہے، اہم عنصر ہے لیکن ہر علم کی حیثیت یکساں نہیں ہوتی معاشرتی زندگی کے اور شعبوں کی طرح علم بھی نامکمل ہوتا ہے۔

علم و دانش کا احترام متحدہ عمل اجتماعی کی نشوونما کا قوی موثر ہے۔ کسی جماعت کا ایک فرد جو کسی فن کا ماہر سمجھا جاتا ہے اپنی رائے سے ساری جماعت پر اثر ڈال سکتا ہے۔ علم کا احترام ہر شعبے میں نظر آتا ہے۔ سائنس بجا طور پر علم صحیح کا سرچشمہ سمجھی جاتی ہے اس لئے اسے ہر معاشرے میں بڑی اہمیت حاصل ہے اور اس کی رائے مستند مانی جاتی ہے۔ ماہروں کی رائے کا اثر صرف افراد پر نہیں پڑتا بلکہ معاشرے کے بعض شعبے بھی اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ چنانچہ ریاستہائے متحدہ کے وفاقی نظام میں، انتخاب صدر یا عدالتی فیصلے یا وضع قوانین میں بعض افراد کی رائے کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

۲۱۳۔ اِرادۂ اجتماعی۔

ارادۂ اجتماعی کی بنیاد اجتماعی احساس ہے۔ اس کا ایک عنصر انتخاب مقصد ہے اور دوسرا عنصر اس مقصد کو پورا کرنے کی

مستقل خواہش ہے۔ اس کے اظہار کی ہزارہا مثالیں قانون عامہ میں ملتی ہیں۔ لیکن "ارادہ اصل میں منشائے نفس کو عمل میں لانے کا نام ہے"۔ ارادۂ اجتماعی سے مراد ہے معاشرے کا بعض اعمال انجام دینے پر آمادہ ہونا۔ جہاں کہیں لوگ عام طور پر کل معاشرے کے مفاد کے لئے کام کرنے، بُرے اثرات کو روکنے اور وہ تدابیر اختیار کرنے پر آمادہ ہوں جو معاشرتی زندگی کی ترقی اور تکمیل کے لئے ضروری ہیں وہاں ارادۂ اجتماعی کی قوت کارفرما ہوتی ہے۔ معاشرے کی ابتدائی اور بنیادی تحریکوں میں ارادۂ اجتماعی کا اظہار ایک غیر شعوری اضطراری عمل کی صورت میں ہوتا تھا لیکن جدید معاشرتی زندگی میں یہ ارادہ علم کی بدولت اختیار سے کام لیتا ہے۔ سائنس نے یہ ممکن کر دیا ہے کہ ارادۂ اجتماعی اس طرح برتا جائے کہ معاشرے کی پوری قوت کسی بڑے اجتماعی مقصد کے حاصل کرنے میں صرف ہو سکے۔

۲۱۴- نفسی قوتوں کی اہمیت۔

غرض معاشرے کی موجودہ حالت پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نفسی قوتیں معاشرے کے اندر ناگزیر رشتۂ اتحاد کی حیثیت رکھتی ہیں اور انھیں پر اعلیٰ عمرانی زندگی کا دارومدار ہے۔ پروفیسر اسمال[1] نے اس بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ ہر جماعت میں نفسی قوتوں کی ایک وقت میں ایک معینہ مقدار ہوتی ہے۔ یعنی اگر ہم معاشرے کے مختلف حصوں کے باہمی تعلقات کو سکونیات کے نقطۂ نظر سے دیکھیں تو یہ نظر آتا ہے کہ قوت کی ایک خاص مقدار صرف ہو رہی ہے اور اگر یہ قوت ایک طرف بڑھائی جائے تو دوسری طرف گھٹانا پڑے گی۔ طبیعیوں نے بہت پہلے بقائے قوت اور استحالۂ قوت کے قوانین دریافت کر لئے تھے۔ اس اصول کو معاشرے

[1] Small

کی نفسی قوتوں کے بارے میں استعمال کرنا قیاس کی مناسب اور جائز صورت ہے۔ اسماآل کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ نفسی قوت دیر تک ایک ہی مرکز پر نہیں رہ سکتی۔ جہاں تک انفرادی نفس کا تعلق ہے یہ اصول ثابت ہو چکا ہے اس لئے اغلب ہے کہ اجتماعی نفس کے بارے میں بھی صحیح ہو۔ بہر حال اجتماعی زندگی کی تاریخ میں تو یہ بات نظر آتی ہے کہ معاشرتی قوت کبھی ایک مرکز پر جمع ہوتی ہے اور کبھی وہاں سے ہٹ جاتی ہے۔ اس کی رو ایک مدت تک ایک خاص رخ پر جاری رہتی ہے اور پھر جزر کا عمل شروع ہو جاتا ہے اور جب تک وہ ایک مرکز پر جمع رہتی ہے دوسرے نقطے اس سے خالی رہتے ہیں ممکن ہے کہ انسان کی اخلاقی قوت بھی انہیں قوانین کے ماتحت ہو۔

باب ششم

نظم وضبط اجتماعی

۲۱۵۔ اجتماعی نظم وضبط کے معنی

معاشرے کی حرکت میں جو ترتیب پائی جاتی ہے وہ محض اتفاقی نہیں ہو سکتی بلکہ اس کے لئے قوائے ضابطہ کا ہونا ضروری ہے۔ اس باب میں جس کا عنوان "ہیئت اجتماعی" ہے ہم نے معاشرے کے مختلف اجزائے ترکیبی کا ذکر کیا تھا جنہیں اعضائے ضابطہ کہتے ہیں۔ اسپنسر نے نظامِ حکومت کا ذکر کرتے ہوئے معاشرے کے اس اہم وظیفے یعنی نظم وضبط[1] کی ضرورت کا ذکر کیا ہے۔ راس کی قابل تعریف کتاب "اجتماعی نظم وضبط" میں اس مسئلے پر خصوصیت سے مکمل بحث کی گئی ہے۔ معاشرے کو سراسر خود حرکی کل نہیں سمجھنا چاہئے جو بغیر محرکہ

---

[1] Ross, social control

باضابطہ قوتوں کے چلتی ہے۔ غالباً معاشرتی جدوجہد میں سب سے زیادہ نمایاں چیز نظم وضبط کی قوت ہے کیونکہ اس کے بغیر معاشرے میں امن و امان قایم نہیں رہ سکتا۔ معاشرتی نظم کے اکثر عناصر انفرادی زندگی اور انفرادی اعمال کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ پھر بھی ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ ایک بہت بڑی قوت نفس اجتماعی کی ہے جس کے ماتحت معاشرے کے منظم اعمال انجام پاتے ہیں۔ فرض کر لیجئے کہ ہر شخص نیک نیت ہوتا اپنے ہمسائے کو اپنی جان کے برابر سمجھتا اور اخلاق کے زرین اصول پر عمل کرتا تب بھی لوگوں میں امن قائم رکھنے کے لئے ایک مرکزی قوتِ ضابطہ کی ضرورت ہوتی۔ کیونکہ ہر شخص اپنی اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے جو راہ اختیار کرتا اس میں اکثر دوسروں سے مقابلے کی صورت پیش آجاتی۔ اگر دو شخصوں کو جو اپنے طرز عمل میں انصاف سے کام لینا چاہتے ہیں ایک وقت میں ایک ہی زمین کی ضرورت پیش آئے تو ممکن ہے اس کا فیصلہ کرنے میں دشواری ہو کہ انصاف کا تقاضا کیا ہے۔ ان مسائل کو حل کرنے کے لئے رائے عامہ موجود ہے جس کے مظاہر قوانین اور عدالتیں ہیں۔ یہی صورت زندگی کے اور شعبوں کی ہے۔ ڈاس نے کہا ہے "محض اس بنا پر کہ لوگ ایک ہی رفتار سے ایک ہی سمت چلنے پر تیار ہیں اور ایک دوسرے کی مزاحمت نہیں کرتے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان میں نظم و ترتیب موجود ہے"۔ بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے بڑھ کر نظم و ترتیب ہو ہی نہیں سکتی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ بالفرض لوگ ایک ہی سمت ایک ہی رفتار سے چلتے ہوں تو بغیر کسی قوتِ ضابطہ کے وہ ایک ساتھ روانہ نہوں گے اور ایک وقت میں ایک مقام پر نہیں پہنچیں گے جس سے بڑی ابتری پھیل جائے گی۔ کم سے کم اس کی ضرورت ہے کہ کوئی شخص لوگوں کو یہ بتائے کہ جلوس میں کس وقت اور کس جگہ شریک ہوں، اور کس طرح قدم ملا کر چلیں یعنی ان کے مقامات اور وقت

روانگی کا تعین کرے۔ یہ چیزیں معاشرے میں بڑی حد تک مشق سے پیدا ہوتی ہیں لیکن ترتیب اور نظم بغیر قوتِ ضابط یا حکومت کے نہیں پیدا ہوسکتا۔

مختصر یہ کہ معاشرتی نظم وضبط کے دو عنصر ہوتے ہیں ایک تو وہ جو بغیر تعین مقصد کے غیر شعوری زندگی سے خود بخود پیدا ہوتا ہے دوسرا وہ جو بالارادہ پیدا کیا جاتا ہے مثلاً کلیسا کا اصل مقصد نظم وضبط نہیں بلکہ تہذیب نفس تھا لیکن ضمنی طور پر اسے ایک قوت ضابط کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ بہ خلاف اس کے منصب شاہی، یا مستقل فوج یا پولس غرض سیاسی حکومت کے کل ادارے خاص کر کے نظم وضبط کے لئے قائم کئے گئے تھے۔

۲۱۶- نظم اجتماعی کی بنیاد

نظم اجتماعی کی بنیاد انفرادی خواہش، انفرادی اعمال اور ان کے نتائج ہیں۔ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ ہمدردی کے جذبے کی بدولت انسان دوسروں کی حالت کو سمجھتا ہے اور فرد کا طرزِ عمل اپنے ابنائے جنس کے ساتھ بدل جاتا ہے۔ یہ بجائے خود نظم اجتماعی کا ایک قوی عنصر ہے اس کے اثر سے انسان کو وہ کام کرنے میں تامل ہوتا ہے جو دوسروں کے لئے قطعاً مضر ہو۔ اس کے علاوہ صحبت کی خواہش پوری ہونے کے لئے بھی یہ شرط ہے کہ انسان نظم اجتماعی کے آگے سر جھکائے۔ وہ جانور جن میں مل جل کر رہنے کا ذرا سا بھی مادّہ ہے تھوڑے بہت نظم کے بغیر کام نہیں چلا سکتے۔ البتہ گوشت خور جانور جو اکیلے شکار کرتے ہیں اور اکیلے ہی رہتے ہیں نظم اجتماعی سے سروکار نہیں رکھتے اور اگر انھیں ساتھ رہنے کی خواہش پیدا ہو تو وہ اپنا طرز زندگی بدلنے پر مجبور ہوں گے۔ غرض غیر متمدن انسانوں میں صحبت پسندی کے ساتھ ساتھ کسی قدر نظم اجتماعی کا ہونا بھی ضروری ہے۔

۲۲۷- انصاف پسندی-

شاید انفرادی نقطۂ نظر سے نظم اجتماعی کا سب سے قوی محرک انصاف پسندی کا جذبہ ہے۔ ابتدا ہیں یہ ہمدردی کے ساتھ مخلوط ہوتا ہے اور آگے چل کر ایک مستقل جذبہ کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔ فرض کیجئے کوئی اور اثرات ایسے موجود نہ بھی ہوتے جو لوگوں کو ایک منظم سلسلے میں مربوط کردیں تو صرف ایک انصاف کا جذبہ ان میں کسی نہ کسی قسم کا نظم پیدا کرنے کے لئے کافی تھا انصاف اچھی حکومت کا بلکہ سچ پوچھئے تو معاشرتی زندگی کے ہر شعبے کا اصل اصول ہے۔ اس کی تھوڑی بہت جھلک ادنے سے ادنے قبیلے میں بھی نظر آتی ہے مگر اعلیٰ درجے کی متمدن قوموں میں تو یہ اخلاقی اور سیاسی احساس کا کامل مظہر ہوتا ہے۔ عہد جدید کے جمہوری معاشروں نے برادری اور مساوات کی بہت کچھ تلقین کی ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو ان کی عملی حکومت کی بنیاد انصاف ہے خصوصاً ان ملکوں میں جہاں کے رہنے والے نسلی خصوصیات کے لحاظ سے مختلف ہیں۔ ممکن ہے برادری اور مساوات کی حیثیت قومی زندگی میں خالی خولی جذبات سے زیادہ نہ ہو مگر انصاف ایک باضابطہ اور مسلمہ اصول ہے۔ برادری اور مساوات سے پسندیدہ جذبات اور دوستانہ تعلقات پیدا کرنے میں مدد مل سکتی ہے لیکن معاشرتی عمل کی بنا انصاف ہی پر قائم ہوتی ہے جس حد تک جدید حکومتیں کل افراد قوم کے ساتھ انصاف برتنے پر زور دیتی ہیں اسی حد تک انھیں ان مشکلات کے دور کرنے میں کامیابی ہوتی ہے جو مختلف نسلوں کو ایک معاشرے میں متحد کرنے کی کوشش سے پیدا ہوا کرتی ہیں۔

۲۱۸- بے انصافی سے بیزاری

بے انصافی سے بیزاری، بحیثیت ایک انفرادی جذبے کے،

نظم اجتماعی کی نشوونما کا ایک لازمی عنصر ہے۔ قدرتی انصاف کے جذبات سے اس اصول کی شدت میں کمی ہو جاتی ہے مگر پھر بھی افراد کو بے انصافی سے بیزاری کا حق باقی رہتا ہے اور اس کے تعین کا بھی کہ یہ بیزاری کس حد تک اور کس صورت میں ظاہر کیجائے۔ ممکن ہے عدم مزاحمت بہت اچھا اصول ہو مگر کوئی شخص آج تک بیزاری کے احساس سے خالی نہیں رہا۔ اور کسی نے آج تک عدم مزاحمت کو پوری طرح نہیں برتا۔ عام طور پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ جو لوگ عدم مزاحمت کے حامی ہیں وہ ان موقعوں پر جب سچ مچ انصاف کا معاملہ آن پڑتا ہے، خوب لڑا کرتے ہیں۔ قانون کی نشوونما اسی طرح ہوئی ہے کہ جب کسی شخص نے دوسروں کے حقوق کو پامال کیا تو لوگوں میں بیزاری پیدا ہوئی۔ اگر بیزاری نہ ہوتی تو کوئی بے انصافی کا مقابلہ نہ کرتا اور مجموعی معاشرے کی اغراض کا لحاظ کئے بغیر کمزور پیس ڈالے جاتے۔

غرض متفرق افراد کی جدوجہد سے معاشرے میں ایک حد تک نظم پیدا ہو سکتا ہے۔ اگر ان سادہ طریقوں کے علاوہ جو انسانوں کے طبعی اعمال سے خود بخود نشوونما پاتے ہیں کوئی اور موثر نہ بھی ہوتا تب بھی کم و بیش منظم معاشرہ وجود میں آسکتا تھا۔

۲۱۹۔ وہ ضابطہ قوتیں جو اختیاری اتحاد عمل سے پیدا ہوتی ہیں

بہت سے ادارے ایسے ہیں جو نظم وضبط قائم کرنے کی غرض سے نہیں بلکہ دوسرے مخصوص مقاصد کے لئے قائم کیے گئے ہیں مگر ان کا معاشرے کی نظم و ترتیب و ترقی پر بہت بڑا اثر پڑا ہے۔ مثلاً کلیسا کا مقصد تہذیب نفس ہے یعنی فرد کے عقائد کی اصلاح۔ مگر اس کے لئے اسے ایک بہت بڑے ادارے کی ضرورت ہے جو معاشرے کے کل طبقوں پر حاوی ہے اور جس کی

بدولت ایک بہت بڑی جماعت نظم اجتماعی کے سلسلے میں مربوط ہوگئی ہے۔ یہ معاشرے کی تعمیر کے بہت قوی موثرات میں سے ہے۔ اسی طرح علمی انجمنیں، برادریاں، تفریحی مجلسیں بھی جو کلیسا کے برابر تو نہیں مگر پھر بھی تھوڑا بہت نظم اجتماعی پیدا کرتی ہیں، معاشرے کی تعمیر میں حیرت انگیز طور پر مدد دیتی ہیں۔

۲۲۰۔ رائے عامہ اور قانون کی ضابطہ قوتیں

رائے عامہ نظم وضبط کا ایک اجتماعی ذریعہ ہے جس سے باضابطہ قانون اور حکومت کے اثرات کی تکمیل ہوتی ہے۔ اس میں اخلاقی رنگ قانونی رنگ پر غالب ہے اور یہ اس قدر صحیح اور بااصول نہیں جتنا قانون اور حکومت کا نظام ہے اس میں لوچ اور لچک زیادہ ہے اس لئے اس کے فوری نتائج معین اور واضح نہیں ہوتے۔ تاہم ایک مدت کے بعد رائے عامہ نظم اجتماعی کی نشوونما میں بہت قوی موثر ثابت ہوتی ہے اس سے ایک حد تک قانون شکنی کے حفظ ماتقدم میں مدد ملتی ہے اور اس کا اثر جرم کے ارتکاب سے پہلے بھی اور اس کے بعد بھی ظاہر ہوتا ہے۔ رائے عامہ تنفیذ عمل کی نگرانی کے لئے نہ کوئی مجلس منتظمہ ہوتی ہے نہ کوئی صدر نہ معتمد۔ اس کا عمل فوری اور بے ضابطہ ہوتا ہے جس کے لئے اسے کوئی قانونی اختیارات حاصل نہیں مگر جماعت کی پوری قوت اس کی حمایت کرتی ہے۔

قانون نظم اجتماعی کا باضابطہ ذریعہ ہے۔ اس کے ذریعہ سے لوگوں کی زندگی کے اصول مرتب ہوتے ہیں، ان کے حقوق وفرائض معین کئے جاتے ہیں اور خلاف ورزی کرنے والوں کے لئے سزائیں مقرر ہوتی ہیں۔ حکومت

جو قانون کو عمل میں لانے کے لئے قائم کی جاتی ہے سارے معاشرے کے نظم و ضبط کی مختار ہوتی ہے۔ جہاں کہیں اس اختیار کو برتنے کی ضرورت پڑتی ہے حکومت فوراً مداخلت کرتی ہے۔ اگر حکومت کی قوت ضابطہ مدد نہ کرے تو ہمارے معاشرے کا کوئی وظیفہ پورا نہیں ہو سکتا۔

(۱۰)

حصۂ چہارم

عمرانی نصب العین

حصۂ چہارم

عمرانی نصب العین

باب اول

معاشرے کے مقاصد

۲۲۱۔ عمرانی نصب العین

عمرانی نصب العین معاشرتی ترقی کے لائحۂ عمل کو کہتے ہیں معاشرہ اپنی ساخت یا اپنے عمل کے اعتبار سے مکمل نہیں ہے۔ اس میں بہت سے نقائص ہیں اور وہ اس کے طریق ارتقاء کی وجہ سے ہیں معاشرے کے مختلف اجزاء کی ترتیب اور ان کا باہمی ربط ناقص ہے اس لیے بہت سی جسمانی اور ذہنی قوت بیکار جاتی ہے۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے اعمال ایک دوسرے سے متضاد ہوتے ہیں۔ کامل عدل و انصاف محض ایک نظریے کی حیثیت رکھتا ہے مکمل اتحاد عمل کا کہیں وجود نہیں اور آزادی اکثر اس طرح استعمال کی جاتی ہے کہ اس سے غلامی اور بڑھتی ہے۔ فرائض کی تقسیم غیر مساوی ہے اور خدمت کا صلہ غیر متناسب تعلیم اکثر صورتوں میں ناقص ہے، وضع قوانین جانب داری پر مبنی ہے۔ اور مذہب میں تعصب، ریاکاری اور ضعیف الاعتقادی کا میل ہے۔ مگر معاشرہ ایسے لوگوں سے خالی نہیں رہتا جو ان نقائص کو محسوس

کر کے لوگوں کو معاشرتی عمل کے نصب العین کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ یہ لوگ معیار کمال بہتر اور بلند تر کر دیتے ہیں۔ ہر زمانے میں معاشرے کے اندر بلند ہیں، اہل فکر موجود ہوتے ہیں جو پیمبروں کی طرح نئی راہ عمل دکھاتے ہیں اور اصلاح کا ڈنکا بجاتے ہیں۔ ان کی تجویزیں بہت کم گرد و پیش کے حالات کے مطابق ہوتی ہیں مگر ان کی کوشش کبھی اکارت نہیں جاتی کیونکہ یہ اس بات کو دکھاتے ہیں کہ معاشرتی عمل کس حد تک معاشرتی نصب العین سے پیچھے ہے۔

انقلابات، سیاسی شورشیں، معاشرتی احتجاج اور مخصوص اصول و عقائد کی تبلیغ یہ سب چیزیں معاشرتی نصب العین پر مبنی ہوتی ہیں۔ ہر تحریک کے اندر یا اس کی تہ میں کسی مجدد یا فلسفی کا ہاتھ ہوتا ہے جو موجودہ نقائص کی طرف اشارہ کرتا ہے اور نئی راہ دکھاتا ہے۔ مگر اس کے علاوہ بعض باضابطہ طریقے بھی ہیں جن کے ذریعے سے معاشرہ معینہ اصول کے مطابق اپنے مقاصد حاصل کرتا ہے۔ مثلاً حاکمانہ قوت، تعلیم اور افادہ۔

۲۲۲۔ خیر اکبر

اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ معاشرے کا مقصد اجتماعی فلاح ہے لیکن یہ تعریف اس وقت قابل قبول ہو گی جب اس مسئلے کا کوئی معقول فیصلہ ہو جائے کہ اجتماعی فلاح کسے کہتے ہیں۔ اجتماعی فلاح سے مراد ہے معاشرے کے وظائف کا کماحقہٗ پورا ہونا اور اس کے اعضا کا ہم آہنگی کے ساتھ نشو و نما پانا۔ اس کا اطلاق کسی ایک چیز پر نہیں کیا جا سکتا خواہ وہ زیادہ سے زیادہ دولت ہو یا اعلیٰ سے اعلیٰ ذہن یا اچھے سے اچھا مذہبی عقیدہ یا عمدہ جمالی ذوق یا بڑی سے بڑی اخلاقی قوت۔ البتہ ان سب چیزوں کے متناسب مجموعے پر ہو سکتا ہے۔ اگر ہم یہ مشہور قول تسلیم کر لیں کہ "معاشرے کا مقصد زیادہ سے زیادہ تعداد کی زیادہ سے زیادہ فلاح ہے" تب بھی

ہم حقیقت سے اتنے ہی دور رہیں گے جتنے پہلے تھے تا وقتیکہ یہ معلوم نہ ہو جائے کہ زیادہ سے زیادہ فلاح یا خیر اکبر کا کیا مفہوم ہے۔ ظاہر ہے کہ "زیادہ کے سے زیادہ تعداد" حال اور مستقبل دونوں پر حاوی ہے کیونکہ معاشرہ بمنزلہ ایک مقدار مسلسل کے ہے جس میں مرنے والے افراد کی جگہ دوسرے پیدا ہو جاتے ہیں اور وہ مجموعی حیثیت سے ہمیشہ باقی رہتا ہے۔ مختلف نقطہائے نظر سے خیر اکبر مختلف چیزیں ٹھہرتی ہیں مثلاً جسمانی صحت، راحت، افادہ، تہذیب نفس، اجتماعی دولت۔ ان میں الگ الگ دیکھئے تو ان میں سے کوئی بھی معاشرے کی زیادہ سے زیادہ فلاح کی کفیل نہیں ہو سکتی۔ مکمل معاشرہ وہ ہے جس میں یہ سب چیزیں موجود ہوں۔

۲۲۳۔ نظریۂ افادیت

یہ نظریہ کہ اخلاقی عمل کا مقصد افادہ ہے پہلے پہل یونانی اخلاقیین نے قائم کیا تھا۔ وہ افادے اور راحت کو ایک چیز سمجھتے تھے! اس زمانے سے اب تک اس نظریے میں بہت سے تغیرات ہوئے ہیں کیونکہ اس کے مختلف حامیوں نے اس پر مختلف نقطہ ہائے نظر سے مختلف معاشرتی حالات کے تحت غور کیا ہے۔ پہلے اسے انفرادی نقطۂ نظر سے دیکھتے تھے۔ آگے چل کر یہ اجتماعی افادے پر حاوی ہو گیا۔ آج کل اسے معاشرتی ترقی کے قوانین سے مطابقت دینے کی کوشش کی جا رہی ہے لیکن مکمل معاشرے میں جماعت افراد سے جدا نہیں سمجھی جا سکتی۔ اگر افادے سے مراد معاشرتی ترقی ہے تو ایسی ترقی کس کام کی جس سے فرد کی راحت میں اضافہ نہ ہو اور اسے عمل کی مزید آزادی نہ ملے۔ نظریۂ افادیت اسی صورت میں قابل قبول ہے کہ یہ فرد اور جماعت دونوں پر حاوی ہو۔

۲۲۴۔ راحت کی ماہیت

اگر معاشرے کا انتہائی مقصد افراد کی راحت ہے تو راحت کا

وہ مفہوم جو نظریۂ لذتیت نے قرار دیا ہے یعنی محض لذت تسلیم نہیں کرنا چاہیے بلکہ اسے بلند تر نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیے۔ اس میں شک نہیں کہ لطف زندگی بھی مکمل معاشرے کے لوازمات میں سے ہے لیکن محض آسودگی اور فارغ البالی معاشرے کا حقیقی مقصد نہیں ہے۔ بہت سی غیر ترقی یافتہ قومیں جو تہذیب کے دائرے میں شامل نہیں ہیں اپنی حالت پر ان قوموں سے کہیں زیادہ قانع ہیں جو تہذیب و تمدن کے اعلیٰ مدارج پر پہنچ چکی ہیں۔ لیکن اگر راحت کے ساتھ اعلیٰ زندگی کی چند درچند خواہشیں اور انھیں پورا کرنے کے وسائل بھی شامل کر لیے جائیں تو معاشرے کا کم و بیش صحیح مقصد معین ہو جائے گا۔

۲۲۵۔ معاشرے کا حقیقی مقصد

انفرادی قوتوں کو نشوونما کا موقع دینا بھی معاشرے کا ایک اہم مقصد ہے۔ اور چاہے جو کچھ ہو گا مگر فرد کی شخصیت کا تحفظ لازمی ہے۔ معاشرے کو چاہیے کہ اسے قانون کی حمایت اور حکومت کی حفاظت میں لے لے اور مشاغل زندگی میں ذاتی انتخاب سے کام لینے کی آزادی باقی رہنے دے۔ معاشرہ کا یہ مقصد تو نہیں ہے کہ کل افراد میں مساوات پیدا کرے۔ مگر یہ مقصد ضرور ہے کہ جہاں تک نظم اجتماعی کی مصلحتیں اجازت دیں سب کو ترقی کا یکساں موقع دے۔ ہر شخص کو اس کا موقع ملنا چاہیے کہ اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو نشوونما دے سکے اور بغیر دوسروں کی مداخلت کے اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کر سکے اور سچ پوچھیے تو یہ بھی کافی نہیں بلکہ معاشرے کو افراد کی ترقی کے وسائل بہم پہنچانا چاہئے اور ہر شخص کی ذاتی اصلاح میں اس کی مدد اور ہمت افزائی کرنا چاہیے صحیح معاشرہ صرف یہی نہیں کرتا کہ افراد میں عدل و انصاف قائم رکھے بلکہ وہ ان کی تعلیم کا انتظام کرتا ہے اور اتحاد عمل اور امداد باہمی کی ایسی صورتیں نکالتا ہے کہ وہ تہذیب کے اعلیٰ مراتب حاصل کر سکیں۔

اس کے علاوہ معاشرے کو ایسے وسائل فراہم کرنا چاہیے کہ فرد عملِ اجتماع کے ذریعے سے کامل ترقی کر سکے۔ اس لیے جن انجمنوں اور جماعتوں میں انسان اپنے ابنائے جنس سے مل جل کر تہذیبِ نفس حاصل کرتا ہے ان کے قیام اور نظم میں معاشرے کو مدد دینا چاہیے۔ اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے کہ ایک شخص کی تہذیبِ نفس اور نشو و نما کس حد تک دوسروں کی صحبت پر موقوف ہے۔ اس کی ذہنی قابلیت، اس کی مادی بہبود، اس کے مذہبی عقائد، اس کا جمالی ذوق، یہ سب چیزیں زیادہ تر دوسروں ہی سے حاصل ہوتی ہیں۔ اس لیے جہاں ہم فرد کی تعلیم اور ترقی کے لیے اس کی کوشش کرتے ہیں کہ اسے ذاتی جد و جہد کا موقع حاصل ہو وہاں یہ بات بھی یاد رکھنا چاہیے کہ مختلف اجتماعی تحریکوں کو رواج دینے میں بھی ہم ضمناً فرد کی نشو و نما میں مدد دے رہے ہیں۔

۲۲۶۔ معاشرے کا انتہائی مقصد

ہیئت اجتماعی یا معاشرتی زندگی کے مقاصد ہمیشہ کے لیے معین نہیں ہوتے معاشرہ کبھی پوری طرح اصول و آئین کی قید میں جکڑا نہیں جا سکتا اور نہ کبھی ایک مستقل صورت اختیار کرتا ہے۔ اس کی نشو و نما برابر جاری رہتی ہے۔ یہ قول صحیح نہیں ہے کہ معاشرہ جوانی، کہولت، بڑھاپے اور موت کی منازل سے گزرتا ہے۔ اس میں باقی رہنے کی اور نئے سرے سے جوان ہونے کی قوت ہے جس کی بدولت اسے حیات دوام حاصل ہے۔ جب تک لوگ اپنے ماحول کی قوتوں سے کام لیتے رہیں گے معاشرہ باقی رہے گا۔ اس لیے معاشرے کا حقیقی اور انتہائی مقصد طبعی ترقی ہے۔ اگر معاشرتی قوتوں میں اور معاشرے کے اجزا میں توازن ہے، اگر معاشرتی اعضا قوی ہیں، ان کی نشو و نما پوری طرح ہوئی ہے، ان میں صحیح ربط ہے اور وہ ہم آہنگی کے ساتھ ترقی کر رہے ہیں تو سمجھنا چاہیئے کہ معاشرہ ترقی پذیر ہے۔ سچ پوچھیئے تو ہم اس طبعی ترقی کے

سوا نہ اور کسی چیز کی امید رکھ سکتے ہیں اور نہ ہمیں کسی چیز کی ضرورت ہے، کیونکہ اگر معاشرہ مکمل ہو جائے تو نشو ونما رک جائے گی اور جہاں نشو ونما رکی پھر انحطاط شروع ہوتے دیر نہیں لگتی۔ ابھی تک کوئی ایسا خودحرکی عمل دریافت نہیں ہوا جس سے معاشرہ بندھے ٹکے اصولوں کے مطابق آپ ہی آپ چلتا رہے۔ اس کی ساخت میں، اس کی حرکت میں اور اس کے مقاصد میں تغیر ہوتا رہتا ہے۔ بعض اوقات لوگ ایسا طرز عمل اختیار کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ گویا معاشرہ اب خودحرکی ہو گیا ہے اور افراد کی سعی کے بغیر قائم رہ سکتا ہے۔ لیکن ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ معاشرے میں بہت سی ایسی قوتیں موجود ہیں جو کم وبیش دوامی ہیں پھر بھی ہمیں اس کی ضرورت پڑتی ہے کہ ان قوتوں کے عمل میں تغیر تبدل کریں اور قانون، حکومت، اخلاق، مذہب غرض زندگی کے سارے نظام کا نیا معیار قائم کریں۔ اور ہمیں یہ توقع رکھنا چاہیے کہ معاشرہ نئے معیار اور نئے نصب العین سے مطابقت پیدا کرے گا۔ معاشرتی ترقی کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ معاشرے کو اپنی حالت کا شعور اور علم حاصل ہو۔ جب اسے اپنی خواہشوں اور اپنے مقاصد کا احساس پیدا ہو جائے تو سمجھنا چاہیے کہ وہ ارتقا کے بہت بلند درجے پر پہنچ گیا ہے۔

باب دوم

حکومت کے نصب العین

۲۲۷۔ حکومت کے ذریعے سے مکمل اشتراکی ریاست قایم کرنے کی کوشش

عملی سیاست کے ذریعے سے مکمل اشتراکی ریاست قایم کرنے کی متعدد کوششیں کی جا چکی ہیں۔ عہد قدیم میں اس کی سب سے نمایاں مثال عبرانی جمہوری حکومت تھی جس میں واضعان قوانین اور حکمرانوں نے صرف اجتماعی نظم و ضبط قایم کرنے پر اکتفا نہیں کی بلکہ ایسا ضابطۂ قانون بنایا جو معاشرتی زندگی کی تمام جزویات پر حاوی تھا۔ یہ ایک مذہبی جمہوریہ تھا جس کے مذہب، سیاست اور معاشرتی رسم و رواج کو ملا کر ایک نظام بنا دیا تھا۔ اخلاقی زندگی بہت سخت قواعد و ضوابط کے ماتحت تھی جو حکومت کے بنائے ہوئے تھے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ عدل و انصاف قایم ہو اور جماعت کے کل افراد کو مساوی حقوق حاصل ہوں۔ اگرچہ یہ جمہوریہ عہد قدیم کے ہر طرز حکومت سے زیادہ ترقی یافتہ تھا لیکن آخر میں اس کا نظام جس میں قانون نے اخلاق کی جگہ لے لی تھی قایم نہ رہ سکا قوم منتشر ہو گئی اور یہ تجربہ ناکامیاب ثابت ہوا۔ البتہ اس کے بہت سے اخلاقی اور سیاسی اصول دوسری قوموں تک پہنچے اور ان کے قوانین اور آئین و رسوم میں شامل کر لیئے گئے۔

عملی حکومت کے ذریعے سے عدل و انصاف قایم کرنے کی دوسری عظیم الشان کوشش ایتھنس کی جمہوری حکومت تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ معاشرے کے تمام سیاسی معاملات ان قوانین کے ذریعے سے طے ہوں جو مفاد عامہ کو مدنظر رکھ کر بنائے گئے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ بڑی حد تک اعلیٰ طبقوں کی حکومت تھی اور اس میں سب لوگ شامل نہیں تھے پھر بھی مدنی حکومت کی نشوونما نے، جس میں سینٹ (مجلس نمایندگان) کو بہت سے اختیارات دئے گئے تھے اور لوگوں کو حکومت میں شرکت کرنیکا تھوڑا بہت حق حاصل تھا، سیاست کے ایک نئے دور ارتقا کا آغاز کردیا۔ اس اصول کا قایم ہوجانا کہ ہر آزاد شخص کو حکومت کے معاملات میں رائے دینے کا حق ہے، مشرقی شخصی حکومت کے مقابلے میں جہاں اس حق کا دینا یا نہ دینا بادشاہ کی مرضی پر موقوف تھا، بہت بڑی ترقی تھی۔ اب شخصی حقوق کا یہ اصول قریب قریب ہر طرز حکومت میں داخل ہوگیا ہے۔

جمہوریہ روما نے، جس کی حکومت تقریباً شاہنشاہی اصول پر مبنی تھی، لوگوں کے مختلف طبقوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے مسئلے کو اس طرح کرنا چاہا کہ سب کو حکومت میں مناسب حصہ دیا جائے۔ لیکن یہ نظام سینٹ کے اقتدار کی وجہ سے ناکامیاب رہا جو امرا کے اثر میں تھی اور غریب طبقوں کو دبانا چاہتی تھی۔ جمہوری حکومت کی بدولت لوگوں کو حکومت کے حقوق برتنے کی مشق ہوگئی اور قانون نے نشوونما پائی لیکن یہ کام شاہنشاہی نے انجام دیا کہ اپنی ساری قلمرو میں شخصی حقوق تسلیم کرالیے۔ جمہوری حکومت کی طرح شاہنشاہی بھی ناکامیاب رہی اور افراد کے شخصی اور معاشرتی حقوق محفوظ کرنے کی کوشش بے نتیجہ ثابت ہوئی۔ سوئیسی[1] نظام وفاقی، نشیبستان[2] کی متحدہ حکومت۔ اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے بھی آزادی اور مساوات کی بنیاد پر مکمل نظام حکومت قایم کرنے کی کوشش کی۔ فرانسیسی قوم ایک صدی تک شاہنشاہی استبداد اور بدامنی کے تباہ کن اثرات کے ماتحت انسانی حقوق تسلیم کرانے کی کوشش کرتی رہی۔

[1] Swiss [2] Netherlands

آخر "جمہوریۂ سوم" کے عہد میں یہ حقوق ایک حد تک تسلیم کر لئے گئے۔

۲۲۸۔ فلسفیوں کے نصب العین

علاوہ ان عملی کوششوں کے جو واضعانِ قوانین، اربابِ سیاست اور مدبروں نے حکومت کی تعمیر کے لئے کیں بہت سے فلسفیوں نے بھی حکومت کے عینی نظام ترتیب دئیے۔ اس قسم کا پہلا عظیم الشان نظام افلاطون نے اپنی کتاب "ریاست"[1] میں مرتب کیا۔ یہ اس جمہوری حکومت سے جو اس زمانے میں ایتھنس میں قایم تھی بہت مختلف ہے لیکن ریاست کی اور خیالی تصویروں کی طرح افلاطون کی کتاب بھی معاشرتی شورش کے زمانے میں لکھی گئی۔ جن لوگوں نے عینی نظام مرتب کیے وہ سب کے سب اپنے زمانے کی حکومت سے غیر مطمئن تھے۔ افلاطون نے "ریاست" میں اشتراکی نظام معاشرت کا خاکہ کھینچا اور فرد کو کلیتہً ریاست کا تابع قرار دیا۔ اس کے یہاں حکومت تمام معاشرتی اور خاندانی تعلقات کی جزویات میں مداخلت کرتی ہے اور ریاست کے ماتحت جتنے افراد ہیں ان کے حقوق و فرائض تفصیل کے ساتھ معین کر دئیے گئے ہیں۔ بظاہر افلاطون ان خیالات پر جو "ریاست" میں ظاہر کیے گئے ہیں کامل عقیدہ رکھتا تھا مگر غالباً اسے یہ امید نہیں تھی کہ ایسی حکومت اس کے عہد میں یا کسی زمانے میں بھی قایم ہو سکتی ہے۔ ارسطو اپنی کتاب "سیاست"[2] میں افلاطون کی عیش پسندی پر سختی سے تنقید کرتا ہے اور اپنے نظریۂ حکومت

---

[1] Republic of Plato

[2] Politices of Aristotle

کی بنا ان بہترین حکومتوں کے بہترین عملی تجربات پر رکھتا ہے جن سے تاریخ اس وقت تک ناآشنا تھی۔ قرون وسطیٰ اور عہد جدید کے ابتدائی حصے میں بہت سے مصنفوں نے حکومت کے نظریے اور نظام ترتیب دیے ان تصنیفوں میں کمپینیلا کی "مدینۃ الشمس"[1] اعظیمن مقدس کی "مدینۃ اللہ"[2] ٹامس مور کی "یوٹوپیا"[3] بیکن کی "اٹلانٹس"[4] اور متاخرین کی کتابوں میں کابے کی "اکاریا"[5] اور بیلامی کی "نظریۂ ماضی"[6] قابل ذکر ہیں۔ ان میں سب سے اہم "ریاست" کی وہ خیالی تصویریں ہیں جو افلاطون، مور، کمپینیلا اور بیکن نے کھینچی ہیں۔ سب کے مضامین بیان کرنے کی اس کتاب میں گنجائش نہیں اس لیے ہم دو لفظوں میں ان کا خلاصہ پیش کیے دیتے ہیں۔ ہر کتاب ایک مکمل حکومت کا مرقع دکھاتی ہے جہاں زندگی کے تمام شعبوں میں ہم آہنگی ہے، سب لوگ چین سے بسر کرتے ہیں، انصاف کا دور دورہ ہے، محبت کی حکومت ہے اور انسانی ضروریات بلا دقت پوری ہوتی ہیں۔ ان کتابوں سے اتنا فائدہ ضرور ہے کہ یہ تضاد کے ذریعے سے موجودہ حکومتوں کے نقائص کو نمایاں کرتی ہیں۔

۲۲۹۔ اشتراکی نظریوں کے حامی

بیبوف[7] اور اس کے پیرو یہ چاہتے تھے کہ ذاتی ملکیت باقی نہ رہے

۱؎ Campanelta : City of the Sun

۲؎ St Augustine : City of God

۳؎ Thomas More : Utopia

۴؎ Francis Bacon : Atlantis

۵؎ Cabet : Scaria

۶؎ Beltamy : Looking Rackward

۷؎ Baboeuf Francis Noel

اور خالص اشتمالی ریاست کے ماتحت مساوات اور اخوت قایم ہو جائے اس غرض سے انھوں نے ۱۷۹۶ء میں مساوات برتنے والوں کا ایک گروہ بنایا اور نظام ریاست کو درہم برہم کرنے کی کوشش کی۔ ان کا یہ عقیدہ تھا کہ معاشرے کا مقصد کل افراد کی راحت ہے اور راحت کا دار و مدار مساوات پر ہے اس لیے کامل مساوات کا دور دورہ ہونا چاہیے یہ نظریہ انقلاب فرانس کے اثرات زائل ہونے کے بعد تقریباً معدوم ہو گیا۔

کابے خالص اشتمالیت کا قائل تھا مگر اس کی رائے تھی کہ موجودہ نظام میں تغیر بتدریج ہونا چاہیے اور لوگوں کو اپنی خوشی سے اشتمالی جماعتیں قایم کرنا چاہیے۔ یہاں تک کہ آہستہ آہستہ سارے معاشرے پر اخوت کا رنگ پہنچا جائے۔ غالباً وہ فرانس کا پہلا اور سب سے بڑا اشتمالی تھا اور اس کی "اکاریا" سب سے مکمل اشتراکی جماعت تھی۔

سین سیموں[1] اشتراکی تھا اور اس کا عقیدہ یہ تھا کہ انسان قدرتی طور پر غیر مساوی ہیں اور اسی عدم مساوات کی بنا پر معاشرے کی تعمیر ہونا چاہیے۔ وہ اشتراک ملکیت کا قائل نہ تھا بلکہ اس اصول کا حامی تھا کہ ہر شخص کو اس کی قابلیت کے مطابق معاوضہ ملے اور قابلیت کا اندازہ کام کے لحاظ سے کیا جائے۔

فوریئے[2] کا نظریہ سین سیموں کے نظریئے سے مشابہ تھا اگرچہ وہ اس کا قائل تھا کہ فرد کا مقصد حیات معاشرے کی فلاح ہے۔ اس کے نظریئے کی رو سے ہر فرد چند فطری حقوق رکھتا ہے جن کی بنا پر جماعت کا فرض ہے کہ اس کی حفاظت اور خبر گیری کرے۔

---

[1] Saint Simon

[2] Fourier

۲۳۰ - جدید اشتراکیت

ہم نے اشتراکی نظریوں کے چند بڑے حامیوں کا ذکر کیا ہے۔ اگر گنجایش ہوتی تو اور بہت سے لوگوں کے نام گنوائے جا سکتے تھے جنھوں نے بہت سے پیچیدہ معاشرتی، سیاسی اور معاشی نظریئے پیش کیے ہیں۔ جدید علمی اشتراکیت کو زیادہ تر معاشی پیدائش اور تقسیم سے سروکار ہے اگرچہ کارل مارکس[1] جو اشتراکی پیدائش کے پہلے حامیوں میں سے تھا اشتراکی جمہوریت پسند تھا اور اس بات پر زور دیتا تھا کہ صنعت و تجارت کی تنظیم سیاسی اصول پر ہونا چاہیے۔ اس نے یہ دکھایا کہ پیدایش دولت میں بہت سا کام مزدوروں کو کرنا پڑتا ہے مگر سرمایہ دار کے مطالبے اتنے زیادہ ہیں کہ ان غریبوں کو پیداوار میں اپنے استحقاق سے بہت کم حصہ ملتا ہے۔ اشتراکی جمہوریت جس کا بانی کارل مارکس کہا جا سکتا ہے، منجملہ اور نظریوں کے زمین اور سرمائے کی اجتماعی ملکیت، صحیح مقابلے کے استیصال یعنی اشتراکی پیدائش دولت کے اصول کی حامی ہے۔

ادھر جرمن اشتراکی کارل مارکس اشتراکی جمہوریت کی تلقین کر رہا تھا اور ادھر لوئی بلاں[2] فرانس میں ریاستی اشتراکیت کی بنا قایم کر رہا تھا۔ وہ مساوات کے اصول کا مخالف تھا اور اس نے تفریقی انصاف کا نظام مرتب کیا۔ وہ کہتا تھا کہ ہر شخص کو اپنی صلاحیت کے مطابق کام کرنا چاہیئے لیکن معاوضہ قابلیت یا کام کے لحاظ سے نہیں بلکہ ضرورت کے لحاظ سے دیا جائے۔

گو جدید علمی اشتراکیت میں اصولاً نہیں تو عملاً بہت سے قدیم

---

۱ - Karl Marx

۲ - Louis Blanc

نظرئے شامل ہیں مگر اس کا مرکز اجتماعی ملکیت اور اشتراکی انتظام صنعت ہے۔ وہ صنعتی مقابلے اور اسباب پیدائش کی انفرادی ملکیت کی مخالف ہے۔ اس نظریئے کے حامیوں میں اس امر میں اختلاف رائے ہے کہ یہ اصول کس حد تک اور کس طریقے سے عمل میں آنا چاہیے۔ اس کا اصل مقصد آمدنی کی مناسب تقسیم ہے۔ ڈاکٹر ایلی[1] نے علمی اشتراکیت کی بہت عمدہ تعریف کی ہے جس سے اس کا عام مفہوم پوری طرح ظاہر ہو جاتا ہے:۔ "اشتراکیت صنعتی معاشرے کے اس مجوزہ نظام کا نام ہے جو بڑے مادی وسائل پیدائش کی شخصی ملکیت کو مٹا کر اجتماعی ملکیت قایم کرنا چاہتا ہے اور اس اصول کا حامی ہے کہ صنعت کا انتظام اور اس کی آمدنی کی تقسیم معاشرے کے ہاتھ میں ہو اور اس آمدنی کا بڑا حصہ افراد کی ذاتی ملکیت ہو۔"

۲۳۱۔ جدید اشتراکی تجربات

بہت سی جماعتوں نے نوع انسان کی فلاح کے لیے حکومت کے نئے تجربے کرنے کی کوشش کی ہے۔ بہت سے افراد حلقے بنا کر اشتراکی نظریوں کی تبلیغ کر چکے ہیں۔ یہ جماعتیں تین طرح کی تھیں:۔ نراجی، اشتراکی، اشتمالی۔ نظری نراجی کا یہ عقیدہ ہے کہ جدید نظام حکومت ایک بوجھ ہے جس میں معاشرتی زندگی دبی ہوئی ہے۔ اگر اس سے نجات مل جائے تو لوگ چھوٹے چھوٹے حلقوں میں رہا کریں گے جن میں نظم پوری طرح قایم رہے گا۔ اشتراکی بھی نظام حکومت اور نظم معاشرت کے موجودہ طریقوں سے بیزاری کے معاملے میں نراجیوں کے ہم خیال ہیں۔ لیکن ان کی تجاویز معاشرے کی از سر نو تشکیل کے متعلق ان سے بالکل مختلف ہیں۔ نراجی کہتے ہیں کہ حکومت کے اختیارات بہت

[1] Dr. Ely

زیادہ ہیں، انھیں جہاں تک ممکن ہو کم کرنا چاہیئے۔ اشتراکیوں کا قول ہے کہ حکومت جتنی ہونا چاہیئے۔ اس سے بہت کم ہوتی ہے۔ اس کا دائرہ اتنا وسیع کیا جا سکتا ہے کہ ساری جدید صنعتی زندگی پر حاوی ہو جائے۔ اشتمالی بھی ایک طرح کے اشتراکی ہیں وہ چاہتے ہیں کہ کل ملکیت مشترک ہو اور افراد میں حق ملکیت اور معاشرتی زندگی کے اعتبار سے کامل مساوات ہو۔ اشتراکی عموماً تفریقی انصاف کے حامی ہوتے ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ ہر شخص کو اپنی قابلیت یا بقول بعض اپنی ضرورت کے لحاظ سے حصہ ملنا چاہیئے۔

ان میں سے بہت سی جماعتیں حکومت کے عملی تجربات کر چکی ہیں مثلاً "اونائڈا کے اشتمالی"[1] "انجمن اماناً"[2] "ریاست ایووا کی جدید اکاریا"[3] اور کیلیفورنیا کی متعدد انجمنیں جو بیلامی[4] کے نام سے موسوم ہیں۔ یہ تجربے جو خالص اشتمالیت سے لیکر محض صنعتی امداد باہمی تک مختلف حیثیتوں کے تھے قسموں میں تقسیم نہیں کیے جا سکتے اس لیے کہ ان میں سے ہر ایک کا رنگ بالکل الگ تھا۔ پھر بھی جن تجربوں میں تھوڑی بہت مشابہت تھی ان کی ایک صنف قرار دی جائے تو تین قسمیں سمجھی جا سکتی ہیں:۔ وہ تجربے جن کا اصول یہ تھا کہ ہر شخص کو اس کی قابلیت اور خدمت کے لحاظ سے حصہ ملے، وہ جن میں ہر شخص سے مساوی خدمت لی جاتی تھی اور سب کو مساوی معاوضہ دیا جاتا تھا اور وہ جن کا مقصد محض صنعتی امداد باہمی تھا۔ تقریباً یہ سب ناکامیاب ثابت ہوئے کیوں کہ ان کا اصول ناقابل عمل تھا اور ان کے کرنے والوں میں مل کر کام کرنے کی صلاحیت نہیں تھی۔

---

[1] Oneida Communists

[2] Amana Society

[3] New Scaria of Sowa

[4] Beltamy Societies of California

بہت سے لوگ اس طرز کے قائل ہیں جو "مسیحی اشتراکیت" [1] کہلاتا ہے اس کا مفہوم یہ سمجھا جاتا ہے کہ ساری سیاسی، صنعتی اور عام معاشرتی زندگی ایک اشتراکی نظام کے ماتحت ہو جو مسیح کی تعلیم کے مطابق چلایا جائے۔ اس اصول پر کوئی خاص تجربے نہیں کیے گئے لیکن اس کی تبلیغ جے۔ ڈی۔ ایف مورس [2] اور چارلس کینگزلے [3] کے زمانے سے اب تک برابر ہوتی رہی ہے۔

امداد باہمی کی جماعتیں دو طرح کی تھیں ایک وہ جنھیں مبادلہ اور تقسیم دولت سے سروکار تھا دوسری وہ جنھیں پیدائش دولت سے تعلق تھا۔ ان میں سے بہت سی جماعتیں ناکامیاب رہیں صرف معدودے چند کامیاب ہوئیں۔ امداد باہمی کا فن سیکھنے میں مدتیں گذر گئیں اور جب تک یہ حاصل نہیں ہوا اور امداد باہمی کی صلاحیت رکھنے والوں کا ایک گروہ بہم نہ ہو گیا اس قسم کے تمام تجربے ناکامیاب ہوتے رہے۔ لیکن انگلستان میں تقسیمی امداد باہمی نے جو ۱۸۴۴ء میں کامیابی سے شروع ہوئی تھی بہت قوت پکڑ لی اور اب اس قسم کی سیکڑوں انجمنیں ہیں جو بڑے بڑے کاروبار کرتی ہیں۔ پیدائش دولت میں امداد باہمی کا رواج دینا اس سے کہیں زیادہ مشکل تھا۔ اس کی ابتداء انگلستان میں ۱۸۵۰ء میں بہت معمولی طریقے سے ہوئی تھی۔ اب یہ بہت وسیع چیز ہو گئی ہے اور اس نے ایک مستحکم قومی ادارے کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ امریکا میں دی گرینج [4] اور اتحاد کاشتکاران [5] تفریقی امداد باہمی کی مثالیں تھیں اور منی پولس [6] کی شرکتیں پیدائش دولت

---

[1] Christian Socialism

[2] J. F. D Maurice

[3] Charles Kingesley

[4] The Grange

[5] Farmer's Alliance

[6] Minneapolis

ہیں امداد باہمی کے عمدہ نمونے ہیں۔ تقسیم منافع کا اصول، جس کی مثال منی پولس کے پلسبری مل[1]، سن سنیٹی کی پراکٹر اور گیمبل کمپنی[2]، سینٹ لوئس کی این۔ او۔ نیلسن کمپنی[3]، ڈیٹن (اوہیو) کی کیش رجسٹر کمپنی[4] وغیرہ کے یہاں ملتی ہے، اس کوشش پر مبنی ہے کہ آجر اور اجیر میں اشتراکِ اغراض پیدا ہو اور مزدوروں کے طبقے کی معاشرتی حالت بدل جائے۔

۲۳۲- انفرادیت اور اشتراکیت

سیاسی انفرادیت، جس کی بنا انگلستان میں پڑی، امریکہ پر اس قدر حاوی رہی ہے کہ کوئی جدت جس میں صنعت کی ریاستی تنظیم یا اشتراکِ اغراض کا شائبہ بھی ہو پسند نہیں کی گئی۔ لوگ ہمیشہ اپنی انفرادی آزادی کی سختی سے حفاظت کرتے رہے اور اکثر انھوں نے صنعتی انضباط کے ایسے قوانین کی مخالفت کی جن سے انھیں حقیقی اور دائمی فائدہ پہنچتا۔ دوسری طرف اشتراکیوں کے انتہا پسندانہ نظریوں نے انفرادی نظام پر اس شدت سے حملے کیے کہ لوگ صنعت کے سرکاری انتظام کے نام سے خواہ مخواہ ڈرنے لگے۔ تاہم رفتہ رفتہ ریل اور دوسری بڑی مشترکہ صنعتوں میں ریاست کی مداخلت بڑھتی جاتی ہے۔ گو اشتراکی ریاست کا زمانہ ابھی دور ہے بلکہ غالباً اس کا موجودہ نظریہ پوری طور سے عملی صورت کبھی اختیار نہیں کرے گا، مگر اتنا ضرور ہے کہ ریاست

ا؎ ـ Pillsbury Mills

۲؎ ـ The Proctor and Gamble Company of Cincinnati

۳؎ ـ N. O. Nelson Company of St Louis

۴؎ ـ Cash Register Company of Dayton (Ohio)

پہلے سے کہیں زیادہ امور عامہ پر حاوی ہے اور اشتراکی اغراض بڑھتا جاتا ہے. فرد کی آزادی بدستور قایم ہے لیکن اس شخصی آزادی کے علاوہ ریاست صنعتی تنظیم وضبط اور معاشرتی اصلاح کے نئے نئے قوانین کے ذریعے سے اس کی مدد اور خدمت کر رہی ہے۔

۲۳۳۔ مساوات کے نصب العین

مساوات کا نصب العین جو چند ارباب فکر نے قایم کیا ہے جدید معاشرتی زندگی کے اہم موثرات میں سے ہے۔ ایک حد تک یہ نصب العین عیسوی کلیسا کے عمل پر مبنی ہے لیکن زیادہ تر اس کی وکالت انتہا پسند جمہوریوں اور اشتراکیوں نے کی۔ وہ نظام حکومت جو فرد کی انتہائی آزادی کا حامی اور اسی کے ساتھ جماعت کی زیادہ سے زیادہ فلاح کا کفیل ہو معاشرتی زندگی کا نصب العین سمجھا جاتا ہے۔ اخوت، حریت، اور مساوات کے نصب العین اس حیثیت سے مفید ہیں کہ یہ عمدہ حکومت کے بہت سے ضروری پہلوؤں کی طرف توجہ دلاتے ہیں لیکن ایک روشن خیال حکومت کا محکم ترین اساس انصاف ہے اور اگر یہ معاشرے کا مقصد قرار پائے تو زیادہ ترقی ہو سکتی ہے کیونکہ اس کے حاصل کرنے کا امکان زیادہ ہے۔ جدید معاشرے کا سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ صنعتی امور کی تشکیل انصاف کے اصول پر کی جائے۔

باب سوم

جبری نظم وضبط

۲۲۴۔ حکومت میں جبر کس حد تک ہونا چاہیے

حکومت کے اختیارات اس قدر معروف ہیں اور ایسے جاری وساری ہو گئے ہیں کہ انھیں لوگ عام طور پر نظم اجتماعی کا نصب العین یا کم سے کم اس کی ناگزیر شرط سمجھتے ہیں۔ عموماً یہ بے چون وچرا تسلیم کیے جاتے البتہ کبھی کبھی نراجی ان کی مخالفت کرتے ہیں اور ان کی جگہ نظم اجتماعی کا نیا طریقہ جاری کرنا چاہتے ہیں۔ معمولی شہری جبر کو حکومت کا لازمی عنصر اور نظم اجتماعی کا سبب سمجھتا ہے۔ یہ خیال پیدا ہونا قدرتی امر ہے۔ کیوں کہ دنیا میں ہر قانون کے ساتھ سزائیں ہیں، ہر حکومت کے پاس مستقل فوج ہے اور ہر معاشرے میں پولس موجود ہے۔ عمومی حکومت کی بہترین شکلوں میں بھی حکومت جبر کو اختیار کرتی ہے بلکہ سچ پوچھیے تو سیاسی پارٹیوں کے قائد بھی اپنی تحریکوں کی تنظیم میں اور اپنی حکومت کے نظم وضبط میں اتحاد عمل کی جگہ جبر سے کام لیتے ہیں جو کبھی کبھی قزاقوں کے تشدد سے کم نہیں ہوتا۔

اس میں شک نہیں کہ جبر حکومت کا لازمی عنصر ہے لیکن یہ نظم اجتماعی کا نصب العین نہیں کہا جا سکتا۔ یہ مسلم ہے کہ کسی نہ کسی کے ہاتھ میں نظم قایم کرنے کا اختیار ہونا چاہیے ورنہ حکومت نہیں چل سکتی۔ لیکن ایسی ریاست بھی قائم نہیں رہ سکتی جس کی حکومت محض جبر پر مبنی ہو۔ بہترین حکومت وہ ہے جو فوج اور پولس سے کم سے کم مدد لے۔ حکومت افراد کے اعمال کی محض ایک عارضی بندش ہے۔ اس وقت تک کہ نظم اجتماعی کے اصلی عناصر کام کرنے لگیں۔ اسی لئے قانون کو بہت کم لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے اور پولس کو صرف معدودے چند قانون شکنوں کو گرفتار کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔

۲۳۵۔ پولس کے جبر کی ابتدا

حکومت کے جبر کا طریقہ تاریخ میں ایک خاص زمانے سے شروع ہوا ورنہ غیر متمدن معاشرے میں جہاں فطری انصاف کا دور دورہ تھا طاقتور کمزوروں کو دبا لیتے تھے اور انھیں کوئی روکنے والا نہیں تھا۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا معاملہ تھا اور جو شخص اپنے معاملات کو سنبھال سکتا، اپنے جان و مال کی حفاظت کر سکتا، بلکہ جارحانہ اقدام کر کے اپنی قوت اور ملکیت میں اضافہ کر سکتا، وہی کامیاب ہوتا اور باقی رہتا۔ جو یہ نہ کر سکتا وہ زبردستوں کا زیر دست ہو کر رہتا۔ یہی حال قبائل کا تھا۔ جب اجتماعی زندگی نے نشو و نما پائی تو حفاظت ذات کی قوت حکومت کی قوت بن گئی لوگ حاکموں اور محکوموں میں تقسیم ہو گئے جن کے ہاتھ میں قوت تھی وہ ان لوگوں میں جو جنگ و جدل یا حکمت عملی کے ذریعے سے یا معاشرتی ضرورتوں سے ان کے مطیع ہو گئے تھے جبر سے کام لے کر نظم و ضبط قائم کرنے لگے۔

۲۴۶۔ قدیم زمانے کی قیادت

جسمانی طاقت، قوی ارادے یا قوت اختراع کی بدولت ایک شخص قائد بن جاتا تھا۔ روایات اور ضعیف الاعتقادی سے اس قیادت کو تقویت پہنچتی تھی۔ قائد کا اثر رفتہ رفتہ بڑھتا گیا یہاں تک کہ وہ بادشاہ بن گیا۔ ابتدا میں وہ جنگ و جدل، مجلس مشورہ یا مذہبی رسوم میں اپنے قبیلے کے اغراض و مقاصد کا محافظ ہونے کی وجہ سے عملاً بادشاہ ہوتا تھا۔ آگے چل کر رسم و آئین یا قانون نے اسے باضابطہ بادشاہ قرار دے دیا۔ قبیلے کی فلاح کے لیے لوگوں کی قیادت کرنے کی آڑ میں اس نے انھیں اپنی رعایا بنا لیا۔ وہ اکیلا حکومت کا سارا کام نہیں سنبھال سکتا تھا اور اپنے اختیارات کا مظاہرہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے اس نے بہت سے لوگوں کو اپنے ساتھ شریک کر لیا جو حکومت کے دست و بازو تھے اور بادشاہ کی نگرانی میں قبیلے یا قوم میں نظم و ضبط قایم رکھتے تھے اصولاً لوگوں کو یہ حق حاصل تھا کہ قائد یا بادشاہ کا انتخاب کریں لیکن عملاً بادشاہ ایسی تدبیر کرتا تھا کہ وہی منتخب کیا جائے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ خود اپنے آپ کو منتخب کر لیتا تھا۔

۲۴۷۔ حکمراں طبقے کی نشو و نما

قیادت پر مبنی شاہی حکومت کے بعد ہی امرا کی حکومت کی منزل آئی جو معاشرتی طبقوں کے فرق مراتب پر مبنی تھی۔ ایک حکمراں جماعت پیدا ہو گئی جو جماعت امرا کہلاتی تھی اور اس طبقے کے لوگ عوام سے بالکل جدا ہو گئے۔ وہ دوسروں سے بہتر اور برتر سمجھے جاتے تھے اور اسی مفروضہ برتری کی بنا پر حکومت کے دعویدار تھے۔ یہ حکمراں جماعت ہر شاہی حکومت میں، خواہ وہ استبدادی ہو یا مشروطی، موجود تھی، لیکن جن قوموں

کی ترقی جاری رہی ان میں نظم اجتماعی کے اور وسائل مثلاً مذہب، انصاف، ذہنی قابلیت، صنعتی تنظیم، ایثار۔ اظہار خیال کی آزادی اور معاشرتی زندگی کی ہم آہنگی نے نشو و نما پائی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جبری نظم و ضبط ضروری نہیں رہا اور حکمراں جماعت بیکار ہو گئی۔ مگر بعض قوموں میں شاہنشاہی کے اصول اس قدر راسخ ہو گئے ہیں اور حکمراں جماعت اتنی قوی ہے کہ پرانا طریقہ اب تک باقی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایک زمانے میں امرا کا وجود بادشاہ کے لیے ضروری تھا اور عموم کے لیے مفید تھا لیکن جس معاشرے میں اعلیٰ درجے کی جسمانی تنظیم، معاشرتی رابطہ اور قومی روح موجود ہو وہ اپنی نشو و نما کے دوران میں ان قدیم طریقوں کو ترک کر دیتا ہے۔ لوگوں کی زندگی حکمراں طبقے یا حکومت کی پابند نہیں ہے۔

۲۲۸۔ عمومی یا جمہوری حکومت میں نظم و ضبط کا مفہوم

خالص عمومی یا جمہوری حکومت میں بھی نظم و ضبط کے لیے جبر برتا جاتا ہے۔ اسے جبر کہتے ہیں یعنی معاشرہ اس کے ذریعے سے ایک خاص مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے۔ سچ پوچھیے تو عمومی حکومت جس میں ہر شخص بجائے خود بادشاہ سمجھا جاتا ہے ایک لحاظ سے محض خیالی چیز ہے کیونکہ معاشرے میں چند اصولوں کی، چند خیالوں کی بلکہ اصل میں چند افراد کی حکومت ہوتی ہے۔ ہماری عمومی حکومتوں میں رائے اور طرز عمل کا اختلاف اس قدر ہے کہ اکثر ارادۂ عامہ کو عمل میں لانا دشوار ہو جاتا ہے۔ اکثر عمومی حکومتوں میں قوت عمل کا بیحد اسراف ہوتا ہے کیونکہ وہ ہر شخص کی بات سننا چاہتی ہیں اور ہر شخص کو حکومت میں حصہ دار بنانے کی کوشش کرتی ہیں اگر صرف نظام حکومت کے لحاظ سے دیکھیے تو ایک روشن خیال

مطلق العنان بادشاہ کی حکومت سب سے زیادہ مستحکم ہوتی ہے اور اسی میں قوت عمل کی سب سے زیادہ کفایت ہوتی ہے وہ جو تجویز کرتی ہے مفاد عامہ کو مدنظر رکھ کے کرتی اور اسے اپنے ارادے اور اختیار سے اس طرح عمل میں لاتی ہے کہ کسی کے ساتھ بے انصافی نہ ہو۔ اگر ہم بلدیوں کی تعویق پسندی اور کاروبار میں ان کی کوتہ اندیشی پر غور کریں تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ معاشرے کی زیادہ سے زیادہ فلاح کی کوشش میں قوت عمل کا بہت اسراف ہے۔ مجالس وضع قوانین بھی اکثر معاشرتی ترقی کی کوشش میں ناکام رہتی ہیں۔ اس کے علاوہ خود عموم بھی اکثر کوتہ اندیش ہوتے ہیں اور اپنے برے بھلے کو نہیں سمجھتے اس لیے ان پر بازاری لیڈر اسی طرح حاوی ہو سکتے ہیں جیسے سچے مدبر۔ لیکن حکومت خود اختیاری کی مشکلات زیادہ تر معاشرتی تنظیم اور معاشرتی اداروں کی خامی سے پیدا ہوتی ہیں۔ حکومت بڑا مشکل فن ہے جس پر بہت کم لوگوں کو عبور ہوتا ہے۔ اچھے قوانین بنانے کے لیے بڑی قابلیت کی ضرورت ہے اور چونکہ مجلس وضع قوانین کے ارکان بدلتے رہتے ہیں اس لیے اس کی حیثیت مکتب کی ہے جس میں مبتدی تعلیم پاتے ہیں۔ اب رہے انتظامی عمال تو ان کا یہ حال ہے کہ جو شخص زیادہ رائیں حاصل کر لیتا ہے اسے عہدہ مل جاتا ہے۔ اس لیے اکثر وہ لوگ منتخب ہو جاتے ہیں جو اپنے کام کا بالکل تجربہ نہیں رکھتے۔ پھر بھی حکومت خود اختیاری میں ایک بڑا تحفظ (Safe gaurd) یہ ہے کہ عموم اپنے حاکموں اور عاملوں کو خود منتخب کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ عموم کی رائے عموماً صحیح ہوتی ہے۔ نظم و ضبط کا اصلی اختیار انھیں کے ہاتھ میں ہے اور اگر اپنی غفلت سے انھوں نے ناقص اور مسرف حکومت اپنے اوپر مسلط کر لی ہے تو اس کا الزام خود ان پر

ہے۔ معاشرتی نظم وضبط کے کماحقہ، نشو ونما پانے کے لیے عام ذہنی صلاحیت اور حکومتِ خود اختیاری کی پوری صلاحیت ناگزیر ہے۔

۲۳۹۔ عموم یا جمہور کا ارادۂ اجتماعی

جب جمہور کے ارادۂ اجتماعی میں بیداری اور حرکت پیدا ہو جائے تو وہ بھی شاہی حکومت سے کم مستبد اور تنگ نظر نہیں ہوتا۔ مگر اس میں ایک خوبی ایسی ہے جس سے اس کے عیوب کی تلافی ہو جاتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ گو اس کا عمل غیر مسلسل ہوتا ہے اور اس سے بہت سی غلطیاں سرزد ہوتی ہیں مگر ان غلطیوں کی اصلاح بھی ہوتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ برابر آہستہ آہستہ ترقی ہوتی جاتی ہے اس کی حقیقی کامیابی یہ ہے کہ اکثر لوگوں میں ذاتی اخلاقی دیانت پیدا کردے تاکہ وہ قانون کے محتاج نہ رہیں۔ جب یہ بات حاصل ہو جائے تو ایسی معاشرتی قوت ضابطہ وجود میں آ جائے گی جسے نہ نظام حکومت کی خامیاں برباد کر سکیں گی نہ بازاری لیڈروں کی سازشیں اور نہ ملازمت کے طالبوں کی "نالایقی اور گرسنہ چشمی"۔

باب چہارم

تعلیمی طریقہ

۲۴۰- جبر سرکشی کی محض عارضی روک ہے

نظم اجتماعی کی نشوونما بتدریج ہوئی اور جبری انضباط سے سرکشی کی محض عارضی روک تھام ہوتی رہی۔ آہستہ آہستہ خود ساختہ نظم اجتماعی پیدا ہوا اور معاشرے پر حاوی ہو گیا۔ معاشرہ اپنی بااصول تجدید یا اصلاح کی شعوری سعی تبھی کر سکتا ہے جب وہ اجتماعی نشوونما کے قوانین دریافت کر لے۔ اس سے اس بات کی تائید ہوتی ہے جو ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ نظم اجتماعی کے قائم ہونے کے لیے اعلیٰ درجے کی ذہنی قابلیت درکار ہے۔ اس لیے بہترین تدبیر یہ ہے کہ معاشرہ تعلیمی طریقے سے کام لے اور اسے نظم اجتماعی کی نشوونما کا ذریعہ بنائے۔

۲۴۱- حکومت خود اختیاری کے لیے ذہنی قابلیت درکار ہے

جب تک کسی قوم کے افراد میں اعلیٰ درجے کی ذہنی قابلیت نہ ہو وہ اپنے اوپر آپ حکومت نہیں کر سکتی۔ تاریخ شاہد ہے کہ حکومت خود اختیاری میں وہی قومیں کامیاب ہوئی ہیں جن میں ذہنی قابلیت

عام تھی۔ جو جمہوری سلطنتیں ناکام رہیں ان کی ناکامی کا سبب زیادہ تر یہی تھا کہ عموم میں علم و فن کی اشاعت نہیں ہوئی تھی۔ جن ملکوں میں قابلیت اور قوت صرف چند شہریوں تک محدود ہوتی ہے اور عوام نافہم ہوتے ہیں وہاں جمہوریت نہیں بلکہ صرف شاہنشاہی پنپ سکتی ہے اور اگر یہی صورت حال باقی رہے تو تھوڑے دن میں خود بخود شہنشاہی جمہوریت کی جگہ لے لے گی۔ آج کل ہر طرف حکومت خود اختیاری کے فطری حقوق کا چرچا سننے میں آتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اگر فطرت نے انسان کو یہ حقوق دیے تو ان کی بنا ذہنی قابلیت پر ہے۔ یہ دعویٰ محض لاطائل ہے کہ جو شخص انسانی پیکر رکھتا ہے اسے ہر قسم کے انفرادی اور اجتماعی اعمال بجا لانے کا حق ہے خواہ وہ اس کے لیے اور دوسروں کے لیے مضر ہی کیوں نہ ہوں۔ معاشرے کی تعمیر کے بعد فطری حقوق ارادہ اجتماعی کی صورت میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ بد قسمت ہے وہ قوم جو عمومی یا خود اختیاری حکومت ایسے وقت میں اختیار کر لے جب اس کے افراد میں اتنی قابلیت اور دیانت نہ ہو کہ اسے قائم رکھ سکیں۔ ایسی صورت میں ایک مضبوط مرکزی حکومت جو جبر پر مبنی ہو عموم کے لیے زیادہ مفید ثابت ہوتی ہے خصوصاً اگر حکمراں اتنے دانشمند ہوں کہ اپنی قوم کے حقیقی مفاد کو سمجھیں اور حکومت کی قوت سے اس کی محافظت کریں۔

۲۴۴۔ افراد معاشرے کی عام تعلیم کے ذریعے سے رائے عامہ کی تہذیب ضروری ہے

اگر نفس اجتماعی جاہل اور کمزور ہو تو رائے عامہ کا فیصلہ غلط ہوتا ہے اور عام سیاسی یا معاشرتی زندگی کی سطح پست ہوتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ کوئی جماعت ایک مدت تک ادنیٰ درجے کا نظم اجتماعی قائم رکھے لیکن پائدار اور ترقی پذیر وہی معاشرہ ہو سکتا ہے

جس میں رائے عامہ تو ہی اور بلند ہے۔ اس کے لیئے عام ذہنی قابلیت اور عام تعلیم درکار ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہر معاشرے میں چند قابل افراد رائے عامہ کی تشکیل کرتے ہیں اور عموم کو جس راہ پر چاہتے ہیں چلاتے ہیں لیکن اگر عام لوگوں میں اتنی قابلیت نہیں ہے کہ اپنے قائدوں کے خیالات کو سمجھ کر قبول کریں تو رائے عامہ کا نام ہی لینا بیکار ہے یہ کہنا چاہیے کہ چند افراد کی رائے حکمراں ہے۔ غرض رائے عامہ یا ارادۂ اجتماعی کا کما حقہٗ اظہار تبھی ہو سکتا ہے جب افراد ذہنی قابلیت رکھتے ہوں اور ہم آہنگی سے تبادلۂ خیالات کر سکتے ہوں۔ اس کے لیے انفرادی صلاحیت کے علاوہ مکمل نظام معاشرت کی ضرورت ہے۔

۲۴۳۔ تعلیم سے طرز حکومت کی اصلاح

جوں جوں ذہنی قابلیت بڑھے گی ہر فرد حکومت اور قانون کی حقیقت سے زیادہ واقف ہوگا۔ اس کا معاشرتی نصب العین رفتہ رفتہ بلند ہو جائے گا۔ جوں جوں تعلیم عام ہوگی طرز حکومت اور معیار حکومت میں اصلاح ہوگی۔ مثلاً اب تعلیم سے انصاف کا احساس زیادہ تیز ہو جاتا ہے اور اسے برتنے کے وسائل زیادہ مکمل ہو جاتے ہیں۔ انصاف کے عمل میں آنے سے پہلے معقول نصب العین کا پیدا ہونا ضروری ہے۔ لیکن انصاف کی حقیقت سمجھنے کے بعد ہی قانون اور انصاف کے عملی نظام کو مکمل کرنا بہت دشوار ہے۔ ایک آزاد قوم پر حکومت کرنے کے لیے قوانین وضع کرنے میں زندگی کے اور سب شعبوں سے زیادہ تدبر، قابلیت اور عمل اجتماعی کی ہم آہنگی درکار ہے۔ حکومت خود اختیاری کے اس نظام کا ناقص ہونا اس کا سب سے بڑا سبب ہے کہ اس حکومت میں اتنی قوت عمل ضائع ہوتی ہے اور اس قدر اسراف ہوتا ہے۔ خود ہمارے جمہوریے (امریکہ) میں ہر سال ایسے قوانین وضع ہوتے ہیں جو معاشرے کے

حقیقی مفاد کے خلاف ہیں۔ ہماری عدالتیں فیصلہ کرنے میں اس قدر دیر لگاتی ہیں جس کی انتہا نہیں۔ اور ادھر صنعتی زندگی کی نشوونما کا یہ حال ہے کہ روز حالات بدلتے ہیں اور نئے قوانین بنانے اور نئے قانونی مسئلوں کو طے کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ نظام سیاست کے ناقص ہونے کے سبب سے حکومت اور قانون ہماری شہری زندگی کی نشوونما کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ اکثر صورتوں میں بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر ہمارے یہاں روشن خیال شاہی حکومت ہوتی جو لوگوں کی آئندہ ضروریات کا اندازہ کر سکتی اور اپنے اختیار سے انھیں فوراً پورا کر دیتی تو حالت اس سے بہتر ہوتی۔ لیکن استبدادی حکومت میں جو خطرات ہیں ان سے دوسری خرابیاں پیدا ہونے کا احتمال ہے۔

۲۴۴۔ قانون کی تائید کے لیے تعلیم عامہ کہاں تک ضروری ہے

اس کا امکان ہے کہ عاقبت اندیشانہ عمل اجتماعی سے یا وضع قوانین کے ناقص نظام سے ایسے قانون بنا دیئے جائیں جنھیں جمہور قبول نہ کریں۔ اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی نئے قانون کے جاری ہونے کے بعد خود ادارات حکومت کی پوری تائید حاصل ہونے میں بہت دیر لگ جاتی ہے۔ مگر اس عرصے میں تعلیمی طریقہ اپنا کام کرتا رہتا ہے اگر کوئی قانون عدالتوں میں تسلیم کر لیا جائے تو تعلیم کے ذریعے اس کی کامل اور آزادانہ تائید پر آمادہ کیئے جا سکتے ہیں لیکن اگر وہ قانون لوگوں کی نظر میں ناپسندیدہ ہے تو اس کے خلاف مسلسل احتجاج ہوتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ منسوخ کر دیا جائے۔ مثلاً آج کل طریقۂ محصول کی اصلاح کے لیے ایک شور برپا ہے لیکن اگر کوئی نیا قانون منظور ہو تو لوگوں کو اس کا عادی ہونے کے لیے اچھی خاصی کوشش کرنا پڑے گی۔ اگر عدالتیں اسے اچھا اور منصفانہ قانون

تسلیم کرلیں اور لوگوں کی ایک معقول تعداد اس کی پابندی پر آمادہ ہو جائے تو تعلیم کے ذریعے سے جمہور رفتہ رفتہ اس کے قائم کئے ہوئے معیار پر لائے جا سکتے ہیں۔

ہم بے تامل یہ کہہ سکتے ہیں کہ کوئی ایسا قانون جسے رائے عامہ کی تائید حاصل نہ ہو بالآخر کامیاب نہیں ہو سکتا مگر یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ قانون خود ایک معلم ہے۔ جب ارادۂ اجتماعی کی تائید سے اس کا نفاذ ہو جائے تو وہ نصب العین اور لائحۂ عمل کا کام دیتا ہے۔ لوگ اس سے ہدایت کے طالب ہوتے ہیں اور اس طرح ان کا اچھے برے کا معیار یکساں ہو جاتا ہے۔ قانون کے تعلیمی عمل کی عمدہ مثال ریاست کنساس[1] کا امتناع مسکرات کا قانون ہے۔ یہ قانون بعض سیاسی واقعات سے اور سیاسی قوتوں کے یکجا ہو جانے سے اس وقت منظور ہو گیا جب کنساس کے اکثر باشندے اس کے خواستگار نہیں تھے۔ اس کے جاری رہنے کے لیے شراب نوشی کے مخالفین کو مسلسل کوشش کرنا پڑی جو جمہور کو شراب کی مضرات سے آگاہ کرتے تھے۔ اور امتناعی قوانین کی ضرورت ثابت کرتے تھے۔ مگر اس قانون نے ایک جھنڈے کا کام دیا جس کے پیچھے مخالفین شراب کی فوج جمع ہو کر لڑتی تھی۔ اس بات سے کہ دستور اساسی کے مطابق اور مجلس وضع قوانین کے فیصلے سے گویا جمہور نے اس امتناعی قانون کی ذمہ داری قبول کرلی تھی تعلیمی کوشش کو بڑی مدد ملی۔ تاہم جن جماعتوں میں اکثر لوگ اس قانون کی طرف سے بے پروا ہیں وہاں اس کی خلاف ورزی اس کثرت سے ہوتی ہے کہ اس کا نفاذ ہو ہی نہیں سکتا بلکہ جہاں یہ نافذ ہے وہاں بھی نیک خیال لوگوں کو ہمیشہ اس کی نگہداشت

---

[1] Kansas

اور پاسبانی کی ضرورت پڑتی ہے۔

۲۴۵۔ معاشرتی زندگی کی مخصوص تعلیم

غرض جو ریاست حکومت خود اختیاری کی بدولت مستحکم بنیاد پر قائم ہے اسے اپنے شہریوں کی عمدہ تعلیم کا اہتمام کرنا چاہیے۔ اگر وہ ترقی کے اعلیٰ مدارج پر پہنچنا چاہتی ہے۔ تو لوگوں میں محض عام ذہنی قابلیت کا ہونا کافی نہیں کیونکہ اس کے باوجود بھی یہ ممکن ہے حکومت عمومی کا غلط طرز عمل اس کی بہترین کوششوں پر پانی پھیر دے ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کے باشندوں کو خاص طور پر ان فنون کی تعلیم دی جائے جو نظم وضبط اجتماعی سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہاں اس تفصیل کا موقع نہیں کہ کون کون سے فنون سکھائے جائیں اور کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔ مگر ہم مختصر طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ عام قومی مدارس میں ان سب علوم کی تعلیم ہونا چاہیے جن کے ذریعے سے لوگ قوم کی سیاسی اور صنعتی تاریخ اس کے معاشرتی اور معاشی حالات، اس کے طرز حکومت اس کے اساسی قانون اور عام قانون غرض اس کی اجتماعی زندگی کے کل پہلوؤں سے واقف ہو جائیں اس کے علاوہ سرکاری عہدہ داروں کے لئے فنی مدارس ہونا چاہئیں جہاں وہ ملازم ہونے سے پہلے اپنے کام کی مخصوص تعلیم حاصل کریں۔ اگر کوئی ریاست اپنی حفاظت اور فلاح عامہ کے لئے تعلیم دیتی ہے مگر ان فنون کی تعلیم سے غافل ہے تو وہ اپنی شعوری ترقی اور ضبط اجتماعی کے بہترین وسائل سے کام نہیں لے رہی ہے۔

باب پنجم

معاشرتی عدم مساوات

۲۴۶۔ افراد کی معاشرتی تقسیم

مساوی حقوق اور مساوی مواقع کا اصول تسلیم کر لیے جانے کے باوجود معاشرتی ناہمواریاں نہیں مٹ سکیں کیونکہ ہر شخص کی حیثیت معاشرے میں ایک حد تک اس معیار سے معین ہوتی ہے کہ اس میں صلاحیت عمل کتنی ہے یعنی وہ مقابلے یا اتحاد عمل کے کاموں میں صرف کرنے کے لیے کتنی قوت رکھتا ہے اور اس سے کام لے کر کہاں تک ترقی کرتا ہے۔ گو جمہوریت پسند معاشروں میں یہ رجحان پایا جاتا ہے کہ سب افراد کو ایک معاشرتی سطح پر لے آئیں اور حسب نسب کے امتیازات مٹا دیں تاہم انفرادی زندگی میں اس قدر تنوع ہے کہ قابلیت اور معاشرتی حیثیت میں ناہمواری پیدا ہو جاتی ہے۔ معاشرہ حرکت کرتا ہے مگر "معاشرتی حرکت کی سطحیں" متعدد ہیں اس لیے لوگوں کے کئی طبقے بن گئے ہیں اور ہر طبقے کے افراد اپنے پیشے کے تعلق سے وابستہ ہیں۔ مثلاً ایک کارخانے میں ایک خاص قسم کا کام کرنے والے مزدور جمع ہوتے ہیں۔ اسی طرح تعلیم

دینے والوں، صرافوں اور ریل کے ملازموں کی جماعتیں علیحدہ علیحدہ ہیں۔ غرض صنعتی پیشوں میں یہ نظر آتا ہے کہ معاشرتی گروہ بندی کام کے لحاظ سے ہوتی ہے۔ پھر ان گروہوں کے اندر قابلیت یا عہدے کے لحاظ سے کئی جماعتیں بن جاتی ہیں۔ مثلاً کاروباری دنیا میں ایک بڑے کارخانے کے اندر، منیجر، محرر، مشین چلانے والے اور مددگار ہوتے ہیں۔ اگرچہ ان کو ایک دوسرے پر کوئی مقررہ تفوق حاصل نہیں پھر بھی معاشرتی تقسیم ایک حد تک کام کی قدرتی تقسیم کے لحاظ سے ہوتی ہے۔

۲۴۷۔ وہ عدم مساوات جو انفرادی خصوصیات سے پیدا ہوتا ہے

جہاں کہیں افراد معاشرہ کے متعلق "مساوات" کا لفظ استعمال ہو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ہر شخص کو مقابلے یا اتحاد عمل کے میدان میں اپنی قابلیت کے استعمال کے بہترین مواقع منتخب کرنے کی آزادی ہو یہ مراد نہیں ہوتی کہ سب کی صلاحیتیں اور حالات یکساں کر دئے جائیں یا سب کی کارگزاری برابر ہو۔ دنیا ایک بازار ہے اور لوگ اس میں اپنی قابلیت اور خدمت کا مبادلہ زیادہ سے زیادہ نفع کے ساتھ دوسری کارآمد چیزوں سے کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی بضاعت جسمانی طاقت، ذہنی قوت، اخلاقی سیرت، مذہبی طرز طبیعت یا ذاتی کشش ہوتی ہے۔ مثلاً ایک دلکش شخصیت رکھنے والا کاروبار یا معاشرت میں وہ حیثیت حاصل کر سکتا ہے جو ایک غیر دلکش آدمی کو نصیب نہیں ہو سکتی جب تک اس میں اور برتر صفات مثلاً قوت ارادی یا ذہنی قابلیت موجود نہ ہوں جو اس کے روکھے پن پر غالب آجائیں۔

مختصر یہ کہ قدرتی اسباب مثلاً خلقی خصوصیات کے اختلاف سے عدم مساوات کے بہت سے عناصر پیدا ہو جاتے ہیں جن لوگوں میں کوئی پیدائشی جسمانی نقص ہوتا ہے انھیں صحیح الجسم اشخاص کا مقابلہ کرنے میں دقت پیش آتی ہے یعنی موخر الذکر اشخاص کے وسائل

اور قوت عمل زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لیے وہ معاشرے میں برتر رتبہ حاصل کر لیتے ہیں۔ وہ لوگ جن میں خلقی طور پر ذہنی قابلیت ہوتی ہے اگر اس سے اچھی طرح کام لیں تو کم قابلیت کے لوگوں پر سبقت لے جاتے ہیں اور معاشرتی دنیا میں اعلیٰ مدارج پر فائز ہوتے ہیں اسی طرح ان اشخاص کو جو طبعاً اعلیٰ اخلاقی صفات رکھتے ہیں پیدائشی اخلاقی عیوب رکھنے والوں کے مقابلے میں زیادہ آسانیاں اور کم دقتیں ہوتی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ برتر صفات سعی اور کوشش سے بے نیاز نہیں کر سکتیں اس لیے کہ جس انسان میں یہ سب خوبیاں بدرجۂ اتم موجود ہوں وہ بھی اس شخص سے پیچھے رہ جائیگا جو اپنے وسائل اور قوت ارادی کی تنظیم کر سکتا ہے اور اس سے کام لے سکتا ہے۔ تاہم جو شخص اعلیٰ جسمانی، ذہنی اور اخلاقی صفات رکھتا ہے اور ظاہری خوبیوں سے بھی آراستہ ہے اس کے لیے برتر رتبہ حاصل کرنا مقابلتہً آسان ہے اور جو ان میں سے ایک وصف سے یا کل اوصاف سے عاری ہے وہ عموماً انفرادی یا معاشرتی حیثیت سے پہلے کی برابری نہیں کر سکتا۔

۲۴۸۔ وہ عدم مساوات جو طبعی یا قدرتی ماحول سے پیدا ہوتا ہے

بارہا دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ بنجر زمین پر آباد ہوتے ہیں وہ خود اور ان کی اولاد دائمی افلاس میں گرفتار رہتی ہے۔ بہت سی قومیں اور نسلیں اختیاراً یا جبراً نامناسب مسکن میں رہنے کی وجہ سے جمود کی زندگی بسر کرتی رہیں یا قدرتی اور معاشرتی ماحول کے دباؤ سے صفحۂ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹ گئیں یا مٹا دی گئیں۔ زمین کے بنجر ہونے کے بعد آب و ہوا کے اثرات کا درجہ ہے۔ اگر آب و ہوا خراب ہو تو لوگوں کی صحت برباد ہو جاتی ہے۔ ان کی قوت عمل اور قوت حیات گھٹ جاتی ہے۔ یہ خرابیاں پانی کی بدرروی کا اچھا انتظام نہ ہونے سے

رطوبت کی زیادتی سے، سردی گرمی کے غیر معمولی تغیر سے، یا عام مضر صحت حالات سے پیدا ہوتی ہیں۔ ہمارے پیش نظر ایک جماعت ہے جو (امریکا کی) ایک مغربی ریاست میں دریا کے کنارے آباد تھی۔ دریا پہاڑ سے گرتا تھا لیکن میدان میں پہنچ کر تقریباً ہموار سطح میں بہتا تھا۔ برف پگھلنے کے زمانے میں پانی زور شور سے گرتا تھا اور نیچے آکر پھیلتا تھا مگر روانی نہ ہونے کے سبب سے جا بجا دلدل ہوگئی تھی اور یوں بھی بند پانی سڑا کرتا تھا۔ عفونت اور مچھروں کی کثرت سے لوگ سال کے بڑے حصے میں بیمار رہا کرتے تھے جس کی وجہ سے ایک طرف تو ان کی محنت کی قوت کم ہو جاتی تھی اور دوسری طرف ڈاکٹروں کی فیس اور دوا علاج کا خرچ بڑھ جاتا تھا۔ یہاں تک کہ بیچاروں کو اپنے کھیت رہن رکھ کر گزر بسر کرنا پڑتی تھی۔ آخر انھیں اس نشیبی زمین سے بھاگ کر نیچی پہاڑیوں پر پناہ لینا پڑی جہاں صحت بخش آب و ہوا نے ان کی جان بچائی۔ خط استوا کے گرد رہنے والوں کو آب و ہوا کا مقابلہ کرنے میں اتنی دقتیں ہوتی ہیں کہ اس خطے میں تہذیب و تمدن کی ترقی ناممکن ہے۔ ممکن ہے کہ ایک زمانے میں سائنس امراض کے اسباب اور حفظان صحت کے اصول پر اس قدر عبور حاصل کرلے کہ آب و ہوا کے مضر اثرات کو زائل کرکے اور قدرت کے نامحدود وسائل سے کام لے کر اعلیٰ تمدن کی نشو و نما کی جا سکے۔

اسی طرح پودوں کے طفیلی دشمن انسان کے بھی دشمن ہیں۔ یہ کیڑے پودوں پر اس طرح ٹوٹ پڑتے ہیں اور انھیں چاٹ جاتے ہیں کہ جماعت کی ساری معاشی پیداوار برباد ہو جاتی ہے اور لوگ مفلس بلکہ کنگال ہو جاتے ہیں۔ اس کا اثر ان کی معاشرتی اور معاشی حالت پر پڑتا ہے اور وہ دنیا کی دوسری قوموں سے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ اسی طرح مہلک جراثیم جو آج کل انسانی زندگی کے سب سے بڑے دشمن ہیں بیماریاں پھیلا کر انسان کی جسمانی، ذہنی اور معاشرتی ترقی

کو روک دیتے ہیں۔ کچھ دن پہلے یہ خیال تھا کہ پیلا بخار مائی جر توموں سے پیدا ہوتا ہے لیکن اب یہ معلوم ہوا کہ پیلا اور لال بخار دونوں حیوانی جراثیم سے پیدا ہوتے ہیں۔ جب سائنس نوع انسانی کے ان چھوٹے دشمنوں کی حقیقت معلوم کرلے گی اور ان کے عمل کو روکنے کی تدابیر دریافت کرلے گی تو بیماریاں کم ہوجائیں گی اور تنازع للبقا اور حصول دولت کی کشمکش میں قوموں کے درمیان اتنی عدم مساوات نہیں رہے گی۔

شکاری جانوروں اور زہریلے کیڑوں کے خلاف جنگ کرنے کی ضرورت سال بسال کم ہوتی جاتی ہے مگر زہریلے جراثیم اور طفیلی نباتات کے نقصانات کی وجہ سے تنازع للبقا شدید تر ہوتا جاتا ہے۔ جب سائنس اور معاشی تنظیم کی مدد سے ان دشمنان بشر کا مقابلہ کیا جائے گا تو رفتہ رفتہ ان کے حملوں سے نجات مل جائے گی اور رفتہ رفتہ جماعتوں کی زندگی میں عدم مساوات کم ہوجائے گی۔

۲۴۹- اتفاقی عدم مساوات

بہت سے لوگوں کی معمولی معاشرتی حیثیت اتفاقی حوادث مثلاً زلزلہ طوفان، سیلاب، قحط ریل لڑنے، آگ لگنے اور صنعتی زندگی کے عام حادثوں سے برباد ہوجاتی ہے۔ ان کا اثر ان کی زندگی پر اس قدر پڑتا ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کے دوش بدوش کام کرنے کے قابل نہیں رہتے بعض میں مصیبت کے بعد سنبھل جانے کی خلقی قوت ہوتی ہے اور بعض ایسے گرتے ہیں کہ پھر نہیں اٹھ سکتے۔ مثلاً ایک خاندان کے لوگوں کی زمین دریائے کنساس کے کنارے تھی جس سے انھیں سالہا سال معقول آمدنی ہوتی رہی اتفاقاً ایسا سیلاب آیا کہ ان کی کھڑی کھیتی برباد ہوگئی بعض کھیت بہہ گئے اور جو باقی رہے انھیں بھی بہت نقصان پہنچا۔ سیلاب اتر جانے کے

بعد وہ اپنے گھر لوٹ گئے اور بڑی محنت سے بچی کھچی زمین پر کاشت کرنے لگے اپنی کھوئی ہوئی دولت دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ مگر بدقسمتی سے میعادی بخار نے ان سب کو صاحب فراش کر دیا اور تھوڑے دن کے بعد وہ خیرات پر بسر کرنے لگے چھ مہینے کے اندر ایک کھاتا پیتا خاندان محض اتفاقی حادثوں سے نان شبینہ کو محتاج ہو گیا۔ ایسے واقعات روزمرہ ہوتے رہتے ہیں کہ ایک خاندان جو معاشرتی، سیاسی اور صنعتی دنیا میں کامیابی حاصل کر رہا ہے کسی حادثے کے سبب سے تنزل کرنے لگتا ہے اور اسے اپنی سابقہ حیثیت پر دوبارہ پہنچنے کی کوئی امید نہیں رہتی۔

۲۵۰- وہ عدم مساوات جو معاشرتی ماحول سے پیدا ہوتی ہے

علاوہ قدرتی موثرات کے جو تنازع للبقا اور حصول دولت کی کشمکش میں عدم مساوات پیدا کرتے ہیں۔ معاشرتی دباؤ اور ماحول کے بعض ایسے اثر بھی ہیں جو مصنوعی حالات پر مبنی ہیں۔ سب سے پہلے تو تمول اور افلاس کی عدم مساوات ہے جو ہر قدم پر نظر آتی ہے اور جس کے اسباب میں علاوہ انفرادی خصوصیات اور قدرتی عوامل کے معاشرتی ماحول بھی داخل ہے۔ اگر چند لوگ جماعت کی ساری دولت کو کھینچ لیں اور اسے من مانے طریقے سے خرچ کریں تو دوسروں کو ان کے مقابلے میں حصول دولت کا موقع بہت کم رہ جاتا ہے۔ جدید معاشرتی زندگی میں پیدائش دولت کے لئے سرمائے کا ہونا اس قدر ضروری ہے کہ جو شخص اس سے خالی ہو وہ معاشی جدوجہد میں سرمایہ رکھنے والے کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس کو جو تنگ و تاریک مکان میں پیدا ہوتا ہے اور افلاس و بدحالی کے ماحول میں رہتا ہے اس شخص کے مقابلے میں کتنی دقتیں ہیں جو محل میں پیدا ہوتا ہے اور عیش و عشرت اور تہذیب

کی گود میں پلتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ پیدائشی مفلس کبھی کبھی پستی سے بلندی پر پہنچ جاتا ہے لیکن بے حد کوششوں سے اور بڑی مشکلوں سے یہ بھی ممکن ہے کہ محل میں پیدا ہونے والا ان موقعوں سے جو اسے حاصل ہیں فائدہ نہ اٹھائے اور اپنی زندگی برباد کردے۔ لیکن یہ کلیہ اپنی جگہ پر قائم ہے کہ تمول اور افلاس کے فرق کی بدولت سب لوگوں کو قوت اور مرتبہ حاصل کرنے کی جد و جہد میں مساوی موقع نہیں ملتا۔

صنعتی حالات کو بھی اس میں دخل ہے کہ بعض لوگ کامیاب ہوتے ہیں اور بعض نہیں ہوتے۔ اگر معاشرے میں عام خوشحالی ہو تو فرد کے لئے کامیاب ہونا آسان ہے لیکن اگر تجارت کی کساد بازاری ہو یا عام حالت اچھی نہ ہو تو بہت مشکل ہے۔ یہ حالات برابر بدلتے رہتے ہیں۔ اور کبھی کبھی عاقبت اندیش اور سوجھ بوجھ رکھنے والے لوگ بھی غیر متوقع صنعتی تغیرات کی بدولت تباہ ہو جاتے ہیں۔ بعض لوگوں کو خوش قسمتی سے اس کا موقع مل جاتا ہے کہ تجارت میں ان لوگوں کے ساتھ کام کریں جن کا کاروباری دنیا میں بڑا اثر ہے اور یا ان صنعتی کاموں کو شروع کریں جو معاشرتی حالات کی موافقت سے کامیاب ہوتے ہیں اور بعض کو اچھے کاروباری تعلقات نصیب نہیں ہوتے اس لئے وہ کامیابی سے محروم رہتے ہیں۔

یہ کاروباری تنظیم کا بڑا نقص ہے کہ بہت سے لوگوں کو کامیابی کا موقع نہیں ملتا۔ جدید زمانے کے کاروبار میں انفرادی سعی کی راہ میں بڑی مشکلات حائل ہیں لیکن اس تدبیر سے دور کی جارہی ہیں کہ لوگ پیدائش دولت اور تقسیم دولت کے لئے شرکتیں اور انجمنیں قائم کر رہے ہیں۔ اگر کسی زمانے میں کاروبار پوری طرح امداد باہمی کے اصول پر منظم ہو گیا تو سب کے لئے مواقع قریب قریب مساوی ہو جائیں گے اور ایک حد تک دولت کی تقسیم

معاشرے میں نئے سرے سے کی جائے گی۔
امریکہ والے اس پر فخر کرتے ہیں کہ ہمارے ملک میں لوگوں کو سیاسی اور مادی قوت و اثر حاصل کرنے کا مساوی موقع ملتا ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اور معاشرتی شعبوں کی طرح یہاں بھی نہ صرف قابلیت میں بلکہ مواقع عمل میں بھی عدم مساوات ہے جس کی وجہ سے افراد کے سیاسی اور معاشرتی جد وجہد کے نتائج یکساں نہیں ہوتے۔ سیاسی دنیا میں عدم مساوات یقینی طور پر موجود ہے اور ہمارے جدید سیاسی اور مادی ادارے اسے دور نہیں کر سکے ہیں۔ ممکن ہے کہ لوگوں کو ایک حد تک آزادی عمل حاصل ہو لیکن اس آزادی سے سیاسی مساوات ہنوز پیدا نہیں ہوئی۔ صرف قانون لوگوں کو اس بات پر مجبور نہیں کر سکتا کہ وہ دوسروں کے معاشرتی حقوق کا احترام کریں۔ اس کے لئے سیاسی اور معاشرتی نشوونما کا تدریجی عمل ضروری ہے۔
مذہبی عقائد سے بھی عدم مساوات پیدا ہوتا ہے۔ بعض لوگوں میں مذہبیت زیادہ ہوتی ہے جس کی بدولت وہ کلیسا کی تنظیم میں دخیل ہو جاتے ہیں اور اس طرح امتیاز حاصل کرتے ہیں۔ بعض میں یہ صلاحیت کم ہوتی ہے اور انھیں کم تر رتبہ پر قناعت کرنا پڑتی ہے۔ بعض کو دنیاوی کامیابی کی کوشش میں ایک با اثر مذہبی جماعت کی تائید حاصل ہوتی ہے، بعض اس سے محروم ہوتے ہیں اور انھیں اپنی جد وجہد میں مقابلتہً دقت ہوتی ہے۔
اسی طرح یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ ہر شخص کو اپنے طرز زندگی کے انتخاب کا یکساں موقع ملتا ہے۔ اس انتخاب پر ماحول کا اثر پڑتا ہے۔ نفس اجتماعی کی قوت انتخاب جو معاشرتی حالات پیدا کرتی ہے انفرادی قوت انتخاب کو ایک حد تک مغلوب کر لیتی ہے یا کم سے کم محدود کر دیتی ہے۔ معاشرتی طبقوں کے فرق مراتب کو بھی افراد کی معاشرتی حیثیت کے تعین میں بہت کچھ دخل ہے۔ جو شخص جماعت کے اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتا ہے اسے ادنیٰ خاندان والے سے زیادہ کامیابی کا موقع حاصل ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک انسان کامیابی کے خلقی اوصاف رکھتا ہے اور معمولی صورت حال

میں بہت ترقی کرتا مگر خاندانی تعلقات اچھے نہ ہونے کے سبب سے مجبور ہوجاتا ہے۔ بہت سے لوگوں کی ناکامیابی کا باعث ان کے رشتہ دار ہوتے ہیں۔ یہاں ہم خصوصیت سے اس طبقے کی طرف اشارہ نہیں کر رہے ہیں جو "طبقۂ اشراف" کہلاتا ہے۔ اس کا امتیاز من مانا اور مصنوعی ہے اور اس سے یہ کسی طرح کامیاب نہیں کہلا سکتا۔ ہمارا مطلب یہ ہے کہ ہر خاندان کا آدمی اپنے رشتہ داروں کی کمزوری یا بداخلاقی کے سبب سے مفید اور بااثر رتبہ حاصل کرنے سے محروم رہتا ہے۔

۲۵۱۔ عدم مساوات کو کم کرنے والے مؤثرات

غالباً تعلیم جو ہمارے جمہوریے کی مختلف ریاستوں میں دی جاتی ہے سب سے بڑی مساوات پیدا کرنے والی اور معاشرتی زندگی کی ناہمواری کو دور کرنے والی قوت ہے۔ لوگوں کے ایک ہی مدرسے میں تعلیم پانے سے ایک حد تک قابلیت اور مواقع عمل کی برابری پیدا ہوتی ہے اور تھوڑی بہت امید ہو سکتی ہے کہ معاشرتی عدم مساوات رفتہ رفتہ دور ہو جائے گا۔ پھر بھی یہ نظر آتا ہے کہ قوی طبیعت اور ذہن رکھنے والے کو اب بھی زندگی کی دوڑ میں اپنے کمزور حریفوں پر سبقت لے جانے کا موقع حاصل ہے اور جو اشخاص برتر دماغ اور قوت ارادی رکھتے ہیں وہ اعلیٰ تعلیم کے مواقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی قوت بڑھا سکتے ہیں اور اپنے ساتھیوں پر اقتدار حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ نوع انسانی کے لئے بڑی نعمت ہے کہ اب تعلیم کا پرانا اصول نہیں رہا جس کا مقصد یہ تھا کہ ایک طبقے کو دوسرے طبقے پر تفوق حاصل ہو یا یوں کہئے کہ لوگوں کو بیکار زندگی بسر کرنے کی تربیت دی جائے بلکہ یہ وسیع تر تصور پیدا ہو گیا ہے کہ تعلیم کی غرض عموم کی اصلاح و ترقی اور ان میں یہ صلاحیت پیدا کرنا ہے کہ کم وقت میں زیادہ اور بہتر کام کر سکیں۔

غرض اس بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انفرادی زندگی میں ایسا تنوع موجود ہے جو دور نہیں کیا جا سکتا اور اس کی بدولت مواقع عمل میں اور قوت و اثر

میں عدم مساوات ہونا لازمی ہے۔ سچ پوچھئے تو مقصود بھی یہ نہیں کہ یہ تنوع باقی نہ رہے بلکہ صرف یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سب کو بقا اور ترقی کا مساوی موقع ملے۔ معاشرے کے مدنظر یہ اصول ہونا چاہیئے کہ ہر فرد کی قابلیت اور قوت پوری طرح نشوونما پا سکے اور اس میں رکاوٹیں نہ پیدا ہوں۔ اس لئے اسے سائنس اور قانون کی مدد سے یہ کوشش کرنا چاہیئے کہ حتی الامکان قدرتی عدم مساوات دور ہو جائے یا کم ہو جائے۔ یہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ حفظان صحت کی ترقی، اسباب امراض کے ازالے، حادثات کے حفظ ما تقدم، جراثیم اور شکاری جانوروں کے استیصال، اور مناسب ورزش اور تفریح کے انتظام کا ایک عملی پروگرام جاری کیا جائے۔ مصنوعی عدم مساوات ایک حد تک اس طرح دور کی جا سکتی ہے کہ انفرادی حقوق و فرائض کی بہتر تعلیم دی جائے اور ایسے قوانین نافذ ہوں جو سرکاری ملازمتوں، عام حق رائے دہندگی، سرکاری عمارتوں اور وسائل نقل و حمل کے مساوی حق استعمال کے مناسب اصول معین کر دیں۔ ان قوانین کے وضع کرنے اور قانونی مساوات قائم کرنے میں خاص اہتمام اور توجہ کی ضرورت ہے۔ اگر ان کے ساتھ طرز زندگی کے انتخاب اور تعلیم کے بھی مساوی مواقع مہیا کر دئے جائیں تو معاشرتی عدم مساوات برائے نام رہ جائے گی۔

باب ششم

انصاف پر مبنی حکومت

۲۵۲۔ انصاف کسے کہتے ہیں؟

مدنی انصاف رائے عامہ اور قانون کی مدد سے فرد کے حقوق کا تعین اور حفاظت کرتا ہے اور اس پر معاشرتی فرائض عائد کرتا ہے۔ وہ انفرادی اور اجتماعی اعمال کے جائز یا ناجائز ہونے کو جانچتا ہے۔ انصاف جماعت کے ہر فرد کو مساوی موقع دیتا ہے۔ وہ اس کا فیصلہ کرتا ہے کہ کون چیز اس کی ہے اور کون نہیں ہے۔ حکومت کل ارکانِ معاشرہ کے درمیان انصاف قائم رکھتی ہے۔ اس سے زیادہ وہ کر بھی نہیں سکتی۔ اور کاموں کو افراد بطورِ خود اس سے بہتر انجام دے سکتے ہیں۔ میڈیسن[1] کہتا ہے "حکومت کا بلکہ خود مدنی معاشرے کا مقصد انصاف ہی ہے۔" مساوات یا اخوت نہیں ہے کیونکہ ان چیزوں کا رائج کرنا حکومت کے اختیار میں نہیں ہے۔ انصاف کا تصور کسی فطری حق یا قانون پر مبنی نہیں ہے بلکہ اس کی بنا معاشرے کے اخلاقی احکام پر ہے۔ اس لئے نظم اجتماعی

[1] Madizon

یا انفرادی ماحول کے اختلاف کے لحاظ سے اس میں بھی اختلاف ہوتا ہے۔ ممکن ہے انصاف کی ابتدا فرد کے احساسِ عدل سے ہوئی ہو لیکن اس کا اظہار اجتماعی احکام ہی کی شکل میں ہوتا ہے۔

فطری انصاف یہ ہے کہ انسان اپنے من مانے مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کرے اور کوئی اس میں مزاحم نہ ہو۔ اس کا وجود صرف اس طوائف الملوکی ہی ہو سکتا ہے کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا معاملہ ہو۔ یہ حیوانی تنازع للبقا کا اصول ہے یا یوں کہیے کہ ایک حیاتیاتی قانون ہے جو انسانی سعی پر عائد کیا جاتا ہے۔ سب سے زیادہ اس کا اثر ان افراد پر ہوتا ہے جو غیر معاشرتی زندگی بسر کرتے ہیں یا اس جماعت پر جس کی خصلت بھیڑیوں کی سی ہوتی ہے۔ فطری انصاف کی یادگار قبائل کی موروثی جنگ کی شکل میں یا زیادہ وسیع پیمانے پر قوموں کے تنازع للقوہ میں نظر آتی ہے۔

۲۵۳۔ فریق ثالث

مدنی انصاف کا تعلق دو متنازع فریقوں یا اصولوں اور ایک فریقِ ثالث سے جو ان کے درمیان فیصلہ کرتا ہے ہوتا ہے۔ ہر نظمِ اجتماعی میں یہ فیصلہ کرنے والا فریق موجود ہوتا ہے۔ حکومت جو ریاست کے اختیارات کی مظہر ہے انصاف کا تعین کرتی ہے اور اسے عمل میں لاتی ہے۔ یہی فریق ثالث یا فریق ثالث کا نمایندہ دو متنازع افراد یا فریقوں کی نزاع کا فیصلہ کرتا ہے۔

ریاست کی ارتقا میں حکومت کی مختلف شکلیں اور اس کی نشو و نما کے مختلف طریقے ہو سکتے ہیں لیکن انصاف کی نشو و نما طریق حکومت کی پابند نہیں ہوتی بلکہ ریاست کے ساتھ ساتھ ہوتی رہتی ہے۔ غیر متمدن گروہوں میں مدنی انصاف نہیں پایا جاتا۔ البتہ جس جماعت میں خود ساختہ یا جماعت کے منتخب کیئے ہوئے قائد موجود ہوں اس میں کسی نہ کسی حد تک اجتماعی انصاف کا رجحان ہونا ضروری ہے۔ خود ساختہ قائد کی حکومت تبھی قائم رہ سکتی ہے کہ دوسرے اس کی اطاعت کریں۔ اکثر قیادت موروثی ہو جاتی ہے اور ایک ہی

شخص کی نسل میں رہتی ہے۔ یا اگر وہ یا قبیلے میں اتنا ربط موجود ہو کہ وہ اپنا قائد منتخب کر سکے تو قیادت انتخاب پر مبنی ہوتی ہے۔ بہر حال قائد خواہ وہ خود ساختہ ہو یا موروثی ہو۔ یا لوگوں کا منتخب کیا ہوا ہو بالواسطہ یا بلا واسطہ ارادۂ عامّہ کا نمایندہ ہوتا ہے۔ جہاں کہیں حکومت کا وجود ہوتا ہے قائد یا بادشاہ دراصل محض ارادۂ عامہ کا عمل میں لانے والا ہوا کرتا ہے۔ حکومت کی پشت و پناہ ارادۂ اجتماعی کی قوت یعنی حق "فرماں روائی" ہے۔ اس ارادۂ اجتماعی یا حقِ فرمانروائی کے کارکن بادشاہ، حکمران اور عمال ہیں اور اس کے مظاہر دستورِ اساسی، قانون اور حکومت ہیں لیکن آخری عدالتِ مرافعہ اور محلِ انصاف وہ خود ہی ہے۔ انصاف کی سطح اپنے سرچشمے یعنی منظم معاشرے کے ارادۂ اجتماعی سے بلند نہیں ہو سکتی۔ ہر جماعت میں جو معیار معاشرتی تعلقات کے علم کا اور نظری اور عملی اخلاق کا بھی ہوتا ہے اس کے علاوہ انصاف کا عمل درآمد عدالتوں کی نوعیت اور اہلیت اور حکومت کے نظام پر موقوف ہے۔ انصاف کا انتظام بادشاہ یا وزرا یا ججوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ اس کے اختیارات عارضی طور پر پارلیمنٹ اور دستورِ اساسی کو حاصل ہوتے ہیں لیکن اس کا اصل سرچشمہ منظم جماعت کا حکم یعنی معاشرے کا ارادۂ اجتماعی ہے۔

۲۵۴۔ فرد کا تعلق جماعت سے

ہر طرزِ حکومت میں فرد کو جماعت یا معاشرے سے ایک خاص قسم کا تعلق ہوتا ہے۔ یہ تعلق ایک طرف حکومت کے اور دوسری طرف انفرادی آزادی کے درجے اور تقابر موقوف ہے۔ فرد کا جماعت کے ماتحت ہونا انتہائی شکل میں اشتراکیت میں نظر آتا ہے۔ افلاطون کی "ریاست" میں اس کی بہت واضح مثال ملتی ہے۔ بلکہ یونان کی عملی حکومت میں بڑی حد تک فرد جماعت میں جذب ہو گیا تھا۔ جدید جمہوریت کا نصب العین اس قسم کے سیاسی اور معاشرتی اتحادِ عمل پر زور دیتا ہے جس میں فرد کو زیادہ سے زیادہ آزادیٔ رائے حاصل ہو۔ یعنی اس میں انفرادی آزادی کا رنگ غالب ہے گو اس کی بنا کل افراد کے

اتحادِ عمل اور اتحادِ مقصد پر ہے۔
انفرادیت کی انتہائی شکل سیاسی بقائے اصلح کا اصول ہے۔ ریاست میں اگر انفرادیت حد تک پہنچ جائے تو استبدادی حکومت قائم ہو جاتی ہے اور تاریخ میں یہ صورت بار بار پیش آتی ہے۔ لیکن جب انفرادیت کے پیشِ نظر اکثر افراد کی فلاح اور معاشرے کی ترقی ہو تو یہ ایسے سیاسی اتحادِ عمل کی صورت اختیار کرتی ہے جس میں ہر فرد کی صلاحیت بخوبی نشو و نما پا سکے۔

۲۵۵۔ جمہوری حکومت کا نصب العین

یہ عقیدہ کہ سب انسان فطری طور پر آزاد اور برابر ہیں اور چند لا ینفک حقوق رکھتے ہیں اگر پوری طرح تحلیل کیا جائے تو اس کے معنی بس یہی ہیں کہ وہ اپنے لئے قانون بنانے اور اپنے حاکموں کے منتخب کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ یہ حاکم عارضی طور پر فرمانروائی کا اختیار برتتے ہیں لیکن اصل میں وہ جمہور کے ملازموں کے طور پر کام کرتے ہیں۔ فرمانروائی کے تعین میں فطری حق انسانیت کے نظریے پر، جسے فرانسیسی فلسفیوں نے رواج دیا ہے، حد سے زیادہ زور نہیں دینا چاہیئے۔ فرد کو اپنے اوپر آپ حکومت کرنے کا حق اسی طرح حاصل ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کے ساتھ جو بھی مقصد رکھتے ہیں اتحادِ عمل کرے۔ اس لیے حکومت یا انفرادی آزادی عمل کے حق کا سرچشمہ شعور اجتماعی ہے۔ یعنی موجودہ حالت میں فرد کو صرف وہی کام کرنے کا حق ہے جس کی معاشرہ اجازت دے۔ حکومت کا حق حکومتِ خود اختیاری کی قابلیت سے ملتا ہے نہ کہ محض انفرادی وجود رکھنے سے محض انسان کی صورت اور انسانوں کی سی جسمانی اور نفسی خصوصیات رکھنے سے حکومت خود اختیاری کی اہلیت حاصل نہیں ہو جاتی۔ اس کا سرچشمہ انصاف اور فلاح عامہ کے وہ اصول ہیں جو ایک فرد دوسروں کے ساتھ مل کر متعین کرتا ہے فطری حق صرف ایک ہے یعنی حیوانی زندگی کا حق جو بقائے اصلح کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے حقیقی آزادی معاشرتی اتحادِ عمل کی بنا پر حاصل ہوتی ہے۔ حکومت کا فطری حق اگر ہے تو وہ طبعی نہیں بلکہ معاشرتی حق ہے۔
یہ اصول اس امر سے واضح ہو جاتا ہے کہ انسان معاشرے میں پیدا ہوتا ہے جس پر مروجہ قوانین اور اجتماعی ضابطوں کی حکومت ہے جنہیں وہ بہ حیثیت

فرد کے مٹا نہیں سکتا۔ اگر وہ ان اصول وضوابط میں تبدیلی کرنا چاہے تو صرف عمل اجتماعی سے کر سکتا ہے۔

مختصر یہ کہ معاشرہ انصاف کے جو اصول معین کرے وہی فرد کی سیاسی اور معاشرتی آزادی کی بنیادیں اور ہمیشہ رہیں گے۔

۲۵۶۔ جمہور کے شعوری یا عقلی احکام

غرض جمہور کا اجتماعی ارادہ ہیئتِ سیاسی یا معاشرے کے افراد کے درمیان انصاف قائم کرتا ہے۔ جب نفس اجتماعی انصاف کے اصول معیّن کر دے اور انھیں عمل میں لائے تو گویا حکومت کا کام ختم ہو گیا۔ یہ اجتماعی انصاف انفرادی صلاحیت اور قابلیت کو پوری طرح مدِ نظر رکھتا ہے اور افراد کو ایک محدود دائرے کے اندر باہمی مقابلے کی اجازت دیتا ہے۔ وہ مساوات کے اس اصول کو جو عوام کے ذہن میں ہے ترک کر دیتا ہے بلکہ اس پر زور دیتا ہے کہ ہر شخص کو جہاں تک ممکن ہو اس کا موقع دیا جائے کہ اپنی صلاحیتوں کو نشو و نما دے اور اپنی قوتوں سے کام لے اس حد کے اندر جو خدا نے اُس کے لئے مقرر کر دی ہے، محض انسان صورت ہونے کی وجہ سے کسی کو آزادیِ عمل کا حق نہیں۔ یہ حق محض انفرادی قابلیت اور اجتماعی مصلحت کی بنا پر ملتا ہے۔ انسانی زندگی کا نظم و ضبط قوانین اور معاشرتی احکام کے مطابق سیاسی امور کے علاوہ صنعت و تجارت میں بھی ہونا چاہیئے۔ اگر سیاسی آزادی اور مدنی انصاف کے لئے قوانین کی ضرورت ہے تو صنعتی آزادی اور معاشی انصاف کے لئے بھی ہے۔ جس طرح سیاسی امور میں آزاد مقابلے سے طوائف الملوکی یا قدرتی انصاف کا دور دورہ ہوتا ہے اور اس کا انجام سیاسی استبدادیت ہے اسی طرح صنعتی زندگی میں آزاد مقابلے سے معاشی طوائف الملوکی پیدا ہوتی ہے اور اس کا انجام معاشی استبدادیت ہے۔

بابِ ہفتم

ترقی کا معیار

۲۵۷۔ تغیر اور ترقی کا فرق۔

چونکہ تہذیب بہت سے پیچیدہ عناصر سے مرکب ہے اس لئے ترقی کا اندازہ کرنا بہت مشکل ہے۔ معاشرے میں ایک وقت میں ہزار ہا تغیرات ہوتے رہیں جس کے آخری نتیجے کا تخمینہ اس قدر دشوار ہے کہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ان میں سے کون سی چیز ترقی کی علامت ہے اور کونسی نہیں۔

واقعات کے مشاہدے سے اور تاریخ کے مطالعے سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر تغیر ترقی نہیں ہے۔ مسلّمہ نظریۂ ارتقا جو زندگی کی نشو ونما کو مانتا ہے اس کی رجعت قہقری کا بھی قائل ہے۔ انفرادی زندگی کی طرح معاشرے میں بھی ترقی اور تنزل دونوں کا امکان ہے۔ اس کا فیصلہ کرنے سے پہلے کہ معاشرہ ترقی کر رہا ہے یا نہیں اس کے مقاصد یا نصب العین معین کر لینا ضروری ہے۔ ہماری منزل مقصود کیا ہے؟ معاشرہ کدھر جا رہا ہے؟ اس کے علاوہ ترقی کے ناپنے کا کوئی پیمانہ بھی مقرر ہو جانا چاہیئے۔ آرٹ، ادب، اخلاقی اور سیاسی عمل کا معیار کیا ہے؟ اگر ہمارا نصب العین ہمیشہ ایک سا رہتا تو ترقی کا اندازہ اس کی نسبت سے آسانی سے ہو سکتا تھا۔ مگر مشکل یہ ہے کہ ہمارے مقصد

برابر بدلتے رہتے ہیں اور ہمارے لئے سوائے اس کے کوئی تدبیر نہیں کہ عمل اجتماعی کے نتائج کو دیکھ کر فیصلہ کریں کہ آیا امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ معاشرے میں انسان کے تحفظ اور نشوونما کی صلاحیت بڑھ رہی ہے یا نہیں تاہم بعض نتائج ایسے ہیں جو بلاشبہ ترقی کی علامت سمجھے جا سکتے ہیں اور وہ حسب ذیل ہیں۔

۲۵۸۔ معاشرے میں اجتماع یا ربط کا بڑھ جانا

جوں جوں معاشرہ نشوونما پاتا ہے اس کا اندرونی ربط بڑھتا جاتا ہے اس کے افراد میں باہمی ہمدردی زیادہ ہوتی ہے، ان کے خیالات و جذبات متحد اور مشترک ہوتے ہیں۔ فرد کا تعلق جماعت سے زیادہ واضح اور زیادہ گہرا ہوتا ہے۔ دنیا کی ہر نسلی جماعت میں عمل اجتماعی کے آغاز کے بعد جب رسم و رواج کی جگہ قانون کی حکومت ہوتی ہے عصبیت زیادہ ہو جاتی ہے اب مختلف نسلوں کے گروہ ایک حکومت کے ماتحت رہتے ہیں یکساں قومی زندگی بسر کرتے ہیں اور تھوڑے دنوں میں ان کے خیالات و جذبات میں اتحاد پیدا ہو جاتا ہے اس ربط یا اجتماع کی بدولت خیالات اور احساس کی جو ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے وہ عمل اجتماعی کی رفتار اور قوت بڑھا دیتی ہے۔

۲۵۹ معاشرے کے اعضا یا شعبوں کی تفریق

معاشرے کی ارتقا کے دوران میں ایک طرف تو جسم اجتماعی میں وسعت اور اندرونی ربط پیدا ہوتا ہے اور دوسری طرف یہ جسم مختلف اعضا میں تقسیم ہو جاتا ہے جو ایک دوسرے سے وابستہ ہوتے ہیں۔ جب سے کہ معاشرہ نخرمائی یا یکرنگ حالت سے نشوونما پا رہا ہے اس کے اعمال اور اعضا یا شعبے برابر متفرق ہوتے جاتے ہیں۔ یہ بھی معاشرتی ارتقا کا ایک ذریعہ ہے تقسیم محنت کا اصول ضروریات زندگی کی بنا پر معاشرے کے علٰحدہ علٰحدہ گروہ بنا دیتا ہے ہر گروہ کا ایک خاص وظیفہ یا کام ہوتا ہے۔ حکومت پر نظر ڈالئے تو ایک

زمانے میں کل قوتیں ایک شخص کی ذات میں مجتمع تھیں۔ آگے چل کر یہ پارلیمنٹوں، عدالتوں، فوجی اداروں اور مذہبی جماعتوں میں تقسیم ہو گئیں۔ اب بھی یہ تفریق کا عمل برابر جاری ہے۔ جب ضرورت پڑتی ہے نئی وزارتیں، نئے کمیشن، نئے بورڈ یعنی حکومت کے نئے ادارے قائم ہو جاتے ہیں۔ اس نشوونما سے معاشرے کی قوت میں بیحد اضافہ ہو جاتا ہے اور وہ نوعِ انسانی کے لئے بڑے بڑے کام انجام دے کر اپنی ترقی کا ثبوت دیتی ہے۔ معاشی دنیا میں بھی یہی عمل جاری ہے۔ ہر نئی صنعت کو ماہرانِ فن کی ایک نئی جماعت کی ضرورت ہوتی ہے اور ہر نئی ایجاد کے لئے مزدوروں کا ایک گروہ خاص طور پر تعلیم دے کر طیار کیا جاتا ہے۔

۲۶۰۔ معاشرے کے اعضا یا شعبوں کے باہمی تعلقات کا زیادہ منظم ہونا

معاشرتی نشوونما میں صرف یہی نہیں ہوتا کہ حکومت کے موجودہ اعضا زیادہ مکمل ہو جائیں بلکہ ان کے باہمی تعلقات زیادہ منظم ہو جاتے ہیں۔ تغیر اور مشق سے ان میں زیادہ مطابقت پیدا ہو جاتی ہے اور سب چولیں ٹھیک بیٹھ جاتی ہیں۔ عملِ اجتماعی کی یہ مکمل صورت جس میں تمام اعضا یا شعبوں میں تعاملِ تام ہوتا ہے معاشرے کی کارگذاری کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتی ہے۔ غرض ہم یہ دیکھتے ہیں کہ معاشرہ اس لحاظ سے ترقی کر رہا ہے کہ اس کے اعضا یا وظائف کی تعداد بڑھتی جاتی ہے، یہ زیادہ مکمل ہوتے جاتے ہیں اور ان کی باہمی مطابقت اور ترتیب سے معاشرہ ایک مکمل مشین کی حیثیت اختیار کرتا جاتا ہے۔

۲۶۱۔ ہر آنے والی نسل کو بہتر ماحول نصیب ہوتا ہے

ترقی کا اندازہ کرنے میں ایک اور اہم عنصر اس بات کا دیکھنا ہے کہ آیا موجودہ نسل گزشتہ نسل کے مقابلے میں بہتر ماحول، بہتر وسائل اور بہتر طریقہ ہائے عمل رکھتی ہے اور کم وقت اور کم قوت صرف کر کے زیادہ کام کر سکتی ہے یا نہیں۔ اگر ہم وائسمان[1]

[1] Weismann

کے نظریے کو تسلیم کرلیں کہ مستقل موروثی خصوصیتیں انسانوں میں نسلاً بعد نسلً منتقل ہوتی ہیں اور فرد کی اکتسابی خصوصیتیں اسی کی ذات تک محدود رہتی ہیں تو تہذیب و تمدن کی ترقی کی امید اسی پر منحصر ہے کہ ہر آنے والی نسل کو بہتر ماحول میسر آئے۔ یعنی ترقی کی شرائط یہ ہیں کہ آیندہ نسل کے پاس زیادہ قوت ہو زیادہ وسائل ہوں اور بہتر طریقہ ہائے عمل ہوں۔ ان شرائط پر معاشرے کی ترقی اگر بالکل نہیں تو بڑی حد تک موقوف ہے۔ اس سے تعلیم کی اہمیت اور طریقۂ تعلیم کی اصلاح کی ضرورت ثابت ہوتی ہے۔ آج کل کی معاشرتی جمہوریت کے مقاصد اور انفرادی ترقی کے مواقع کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ دنیا بہت تیزی سے ترقی کر رہی ہے۔

۲۶۲- نسل کی اصلاح اور ترقی

سائنس کے استعمال سے انسان بیماریوں سے محفوظ ہوگیا ہے اور زندگی کی مدت اور کارگزاری بڑھ گئی ہے۔ جوں جوں بیماری کا استیصال ہوتا جاتا ہے یا وہ قابو میں آتی جاتی ہے نسل کی جسمانی حالت آہستہ آہستہ بہتر ہوتی جاتی ہے۔ اموات کا اوسط دو فیصدی کم ہوجانے کے یہ معنی ہیں کہ جماعت کی محنت کی قوت بڑھ گئی، عام صحت بہتر ہوگئی اور انفرادی زندگی کی مدت میں اضافہ ہوگیا۔ کمزوروں کی خبرگیری سائنس کے مطابق کرنے سے ان کے جسم پنپتے جاتے ہیں اور اگر مناسب تدابیر اختیار کی جائیں تو دنیا میں بقائے اصلح کی جگہ بقائے افضل کا دور دورہ ہوجائے۔ اگرچہ معاشرے کے قوے میں انحطاط پیدا کرنے والے اثرات بھی پڑ رہے ہیں لیکن بہتر غذا، بہتر طریق زندگی اور حفظانِ صحت کے انتظام کی بدولت نسل کی جسمانی حالت ترقی کر رہی ہے۔ اس طرح انسانی انتخاب سائنس کی مدد سے طبیعی انتخاب کی تکمیل کر رہا ہے اور جو لوگ سب سے افضل ہیں انھیں کو حیاتی بقا کے لحاظ سے "اصلح" بنا رہا ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اجتماع دولت اور جدید ایجادات و انکشافات سے افراد کی مادی خوشحالی میں بھی اضافہ ہورہا ہے۔

۲۶۳۔ سیاسی مواقعِ عمل میں مساوات پیدا کرنا

سیاسی طریقوں کے تغیرات اور حکومت کی نشو و نما کی بدولت ایک جمہوری معاشرہ پیدا ہو گیا ہے جس میں ہر فرد کل جماعت سے بالکل یکساں تعلق رکھتا ہے۔ عمومی حکومت میں ہر فرد کو یہ حق حاصل ہے کہ مجلسِ وضعِ قوانین کے ارکان کو جو قانون بناتے ہیں اور ان عمال کو جو اسے عمل میں لاتے ہیں منتخب کرنے میں اپنی رائے دے۔ اس کے علاوہ ہر شخص کو خود یہ موقع حاصل ہے کہ مجلس وضع قوانین کا رکن ہو جائے۔ جو شخص چاہے سیاسی زندگی شروع کر سکتا ہے اور اپنی قابلیت اور خدمات کے مطابق امتیاز حاصل کر سکتا ہے۔ سیاسی زندگی میں روز بروز مساوات بڑھتی جاتی ہے اور یہ ترقی کا ثبوت ہے۔ قدیم امرائی حکومت کی جگہ جس میں معدودے چند آدمی حکومت پر قابض اور متصرف تھے، اب عمومی حکومت قائم ہے جس میں کثرتِ رائے سے فیصلہ ہوتا ہے۔ بعض اوقات اس آزادیٔ رائے میں دولتمندوں کے اثرات اس طرح خلل انداز ہوتے ہیں کہ بہت سے لوگ ترقی کے موقعوں سے جو انھیں ملتے محروم ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات چند لوگ سازشوں، چالوں اور رشوت کے ذریعے سے جمہور کو ان کے سیاسی حقوق اور مواقع سے بھی محروم کر دیتے ہیں۔ لیکن یہ حالات دیرپا نہیں ہوتے اور آخر میں کل افرادِ جماعت کو سیاسی آزادی حاصل ہو جاتی ہے۔

۲۶۴۔ صنعتی مواقعِ ترقی میں مساوات پیدا ہونا

جاگیرداری نظام میں ہر شخص کی ایک جگہ مقرر تھی اور اسے اس کی اجازت نہ تھی کہ اپنی معاشرتی حیثیت تبدیل کر سکے۔ یورپ کی طبقہ بندی محنت اور عمل کی آزادی میں مخل تھی۔ ایک طبقے کو جو مواقع حاصل تھے وہ دوسرے کو نہ تھے۔ رفتہ رفتہ یہ انسانوں کو جدا کرنے والی دیواریں ٹوٹ گئیں اور ہر فرد کو یہ حق حاصل ہو گیا کہ جو طرزِ زندگی اختیار کرنا چاہے کرے۔ حال میں دولت کے اجتماع اور صنعت کی تنظیم نے یہ رنگ اختیار کر لیا ہے کہ بظاہر کل افراد کو ترقی کا

موقع نہیں رہا۔ امریکہ میں اب تک بے محصول زمینوں کی کثرت سے پیشے کے انتخاب میں بڑی آزادی رہی ہے کیونکہ جو شخص اپنے کام سے یا اپنی تنخواہ سے مطمئن نہ ہو بغیر کسی معاوضے کے کاشت کے لئے فارم لے سکتا تھا اور نئی صنعتی زندگی شروع کر سکتا تھا۔ دوسرے لحاظ سے دیکھئے تو اجتماعِ دولت اور شرکتِ تجار نے قدرتی وسائل کو بہت نشو و نما دی ہے اور صنعتی معاشرے کے ہر فرد کے لئے نئے مواقع عمل پیدا کر دئے ہیں۔ ممکن ہے کہ کسی شخص کا دائرۂ عمل شرکتِ تجار یا دولتمند سرمایہ داروں کی بدولت ایک لحاظ سے محدود ہو گیا ہو لیکن دوسرے لحاظ سے اسے ہزاروں نئے پیشوں میں سے کوئی پیشہ اختیار کرنے کا موقع حاصل ہے۔ صنعتی زندگی کے لئے قابلیت اور مہارت کی ضرورت ہے اور اب اسی کی بنا پر پیشے کا انتخاب ہوتا ہے۔ اس طرح صنعتی جد و جہد کے مواقع زیادہ ہونا اور ان میں مساوات ہونا بھی قوم کی رفتار ترقی کا پیمانہ ہے۔

۲۶۵۔ دولت کا فلاحِ عامہ کیلئے صرف کیا جانا

روز بروز معاشرے کی فاضل دولت اسکولوں، گرجاؤں، کتب خانوں ورزش گاہوں، کھلے باغوں اور تفریح گاہوں کی تعمیر میں صرف ہو رہی ہے اور جس کی وجہ سے جمہور کی حالت بہتر ہوتی جاتی ہے اور انفرادی طور پر دولت سے زندگی کی آسائشیں بڑھتی جاتی ہیں۔ ٹیلیفون، تار برقی اور نقل و حمل کے تیز رفتار ذریعے اس کے مشاہد ہیں کہ دولت سے فلاحِ عامہ کو کتنی ترقی ہوتی ہے۔ ان مشینوں کی مدد سے جو کارخانوں میں زراعت میں اور کان کنی میں استعمال ہوتی ہیں، لوگ پرانے زمانے کے مقابلے میں جب ہر کام ہاتھ سے کیا جاتا تھا زیادہ کام کر سکتے ہیں اور زیادہ آسانی سے کر سکتے ہیں۔ ان سب چیزوں کی بدولت ذہنی، اخلاقی اور معاشرتی ترقی کے لئے زیادہ فرصت ملتی ہے۔ دولت کی وجہ سے بہتر مکانات، بہتر اسباب خانہ داری، بہتر پوشاک غرض راحت و معیشت کے بہتر سامان میسر ہیں۔ اور یہ معاشرتی ترقی کی صریحی علامت ہے۔ جن قوموں کی دولت میں اضافہ نہیں ہوا ہے وہ ترقی

کے وسائل سے محروم ہیں۔ ان کے لئے نشو ونما کا کوئی موقع نہیں اس لئے کہ ذرائع عمل ہی مفقود ہیں۔ بغیر دولت کے اجتماع اور اس کے صحیح استعمال کے ترقی ممکن نہیں یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہیئے کہ ترقی صرف مقدارِ دولت پر منحصر ہے۔ اصل میں اس کے صحیح استعمال سے لوگوں کی سیاسی اور معاشرتی زندگی سدھرتی ہے۔ دولتمندوں کو روز بروز یہ احساس ہوتا جاتا ہے کہ وہ اس فاضل دولت کے امین ہیں جو جماعت نے پیدا کی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اسے کسی ایسے کام میں صرف کرنا چاہیئے جس سے نوعِ انسانی کو فائدہ پہنچے۔

۲۶۶۔ قدرتی وسائل کی مطابقت انسانی ضروریات سے

ترقی کا کوئی معیار اس سے زیادہ واضح نہیں کہ انسان نے عالمِ فطرت پر کس حد تک قابو حاصل کرلیا ہے۔ سچ پوچھئے تو نوعِ انسانی کی ترقی پوری طرح اسی سے ظاہر ہوتی ہے کہ وہ کتنی طبیعی قوتوں کو ہاتھ لگاتا ہے اور ان سے کہاں تک فائدہ اٹھاتا ہے۔ کسی نئی غذا کے دریافت ہونے سے یا کسی طبیعی قوت یا عنصر مثلاً بجلی، بھاپ، ریڈیم کے نئے استعمال سے نوع انسانی گوناگوں ترقیاں کرتی ہے۔ یہ سائنس کی تحقیقات اور اس کے صنعتی استعمال کا میدان ہے۔ انسان کو قدرتی وسائل کے استعمال سے یہ فائدہ حاصل ہوتا ہے کہ بغیر زیادہ سعی کے اس کی کارگذاری بڑھ جاتی ہے۔ اس کی وجہ سے لوگوں کی جد وجہد کم نہیں ہوئی بلکہ مقدار اور قوت دونوں کے لحاظ سے بڑھ گئی اور ان کے عمل کے نتائج میں پہلے کی بہ نسبت زمین آسمان کا فرق ہوگیا ہے۔ بجلی کا استعمال وسیع پیمانے پر دریافت ہونے کے بعد نوع انسانی کی ترقی کی رفتار دو چند ہوگئی۔ بھاپ سے کام لے کر صنعتی زندگی کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ نقل وحمل کے سستے ذرائع کی بدولت دولت پیدا کرنے والوں اور صرف کرنے والوں کو یکجا ہونے کا موقع ملا اور اس سے بے شمار منافع حاصل ہوئے۔ طب یا کیمیا کے نئے اصولوں کے دریافت ہونے سے عام صحت بہتر ہوگئی اور عمر کا اوسط بڑھ گیا جس کے فوائد

کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ یہ سب قدرتی وسائل کو انسان کی ضروریات سے مطابقت دینے کی مثالیں ہیں۔ قوم کی تہذیب کا معیار یہی ہے کہ اس نے عالم فطرت پر کس حد تک قابو حاصل کیا ہے اور کتنا کام لیا ہے۔ مختصر یہ کہ دنیا کی ترقی کا اندازہ طبیعی قوتوں کے استعمال سے ہوتا ہے۔

حصۂ پنجم

معاشرتی مرضیات

حصہ پنجم

معاشرتی مرضیات

باب اوّل

معاشرتی مرضیات کی ماہیت

۲۶۷۔ طبعی اور غیر طبعی معاشروں کا فرق

طبعی معاشرے کی تعریف مشکل ہے، سب سے بڑی دشواری غالباً یہ ہے کہ صحت کا کوئی ایسا معیار موجود نہیں جسے سب تسلیم کرتے ہوں۔ وہ معاشرہ جس کے سب وظائف مکمل ہوں جس کی ہیئت ترکیبی کے کل اجزا کامل ہوں محض ایک خیالی چیز ہے۔ اس لئے کہ واقعی معاشرہ کبھی مکمل نہیں ہوتا۔ اِس سے کچھ کم مگر اسی قسم کی دقت ایسے فرد کی تعریف میں پیش آتی ہے جو جسمانی ذہنی اور اخلاقی حیثیت سے کامل ہو۔ ظاہر ہے کہ جسمانی تکمیل کا معیار ذہنی یا اخلاقی معیار کمال کے مقابلہ میں آسانی سے معین ہو سکتا ہے۔ مگر جب تعین کی کوشش کیجئے تو اس میں بھی دشواری پیش آتی ہے۔ اب اخلاقی فضیلت کو لیجئے۔ وہ کون سا معیار ہے جس کے ذریعے سے ہم یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ایک فرد اخلاقی حیثیت سے دوسرے سے

زیادہ مکمل ہے یا نہیں ؟ اگر ہم انجیل کے زریں اصول کو رہنما بنائیں تو تو یہ کیسے طے ہو گا کہ کس شخص کا عمل اس سے زیادہ قریب ہے ؟ اسی طرح ذہنی خصوصیات کی اتنی قسمیں ہیں اور ہر ایک کے اتنے مختلف مدارج ہیں کہ اگر کوئی عام معیار موجود بھی ہو تو بھی ان سب کو صحت کے ساتھ جانچ کر یہ بتانا کہ دو شخصوں میں سے کس کا ذہن زیادہ مکمل ہے بہت ہی مشکل ہے۔

پھر بھی ہم طبعی جسم اور طبعی اخلاق کا کوئی نہ کوئی تصور ضرور رکھتے ہیں جس سے مقابلہ کر کے ہم بعض کیفیات اور خصوصیات کو غیر طبعی قرار دیتے ہیں اسی طرح معاشرے میں بھی طبعی اور غیر طبعی حالت میں تمیز کی جا سکتی ہے۔ اگر لوگ ہم آہنگی سے اتحاد عمل کی زندگی بسر کرنے لگیں اور اسی کے ساتھ انفرادی صلاحیتوں کو نشو و نما کی پوری آزادی حاصل ہو تو معاشرے کو طبعی کیا قریب قریب مکمل سمجھنا چاہیئے۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ معاشرہ مختلف وظائف اور شعبے رکھتا ہے جو ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ اب اگر ان میں سے کوئی شعبہ ناقص ہے یعنے اس کا عمل دوسرے شعبوں کی ضرورتوں کے مطابق نہیں یا وہ اپنے طبعی وظیفہ کے ادا کرنے سے قاصر ہے بلکہ معاشرے پر اور بوجھ ڈالتا ہے تو معاشرہ غیر طبعی کہلائیگا۔ یہ ضروری نہیں کہ اس کا سارا نظام ناقص قرار دیا جائے بلکہ صرف وہ اجزا ناقص کہلائیں گے جو اپنے اصلی یا طبعی وظائف پوری طرح ادا نہ کر سکتے ہوں۔

۲۶۸۔ معاشرتی جدوجہد کے معیار مختلف معاشروں میں جدا جدا ہوتے ہیں

معاشرتی زندگی میں بیحد تنوّع ہے اس لئے یہ معین کر دینا ضروری ہے کہ معاشرے کے طبعی ہونے کے لئے کم سے کم شرائط کیا ہیں اول تو لوگوں کو زمین سے اور دوسرے قدرتی وسائل سے وابستگی ہونا

چاہیے، تاکہ وہ غذا حاصل کر سکیں۔ پھر اس مقدار میں اور اتنی آسانی سے پیدا کی جا سکے کہ دوسرے مشاغل کے لیے وقت بچ رہے۔ پیدایش دولت اور تقسیم دولت امداد باہمی کے اصول ہیں۔ کوئی طبقہ اپنے حصہ کا کام انجام دینے سے بری یا اس سے محروم نہ ہو۔ ذہنی ترقی کی آزادی اور مساوی مواقع حاصل ہو۔ اخلاق کا اعلیٰ معیار قائم کرنے اور قائم رکھنے کی تدابیر اختیار کیجاتی ہوں۔ افراد کی جان و مال کی حفاظت ہوتی ہو۔ غالباً طبعی معاشرے کے لازمی شرطیں بس اتنی ہی ہیں لیکن اعلیٰ درجہ کا معاشرہ وہ ہے جس میں ان کے علاوہ اور باتیں بھی پائی جائیں مثلاً مذہبی عقیدت اور جمالی ذوق، افلاس، محتاجی، عیوب اور جرائم سے پاک ہونا، ایسے طبقوں کا نہ ہونا جو معاشرتی زندگی کے فرائض ادا کرنے سے قاصر ہوں۔ یہ آخری شرطیں کبھی تمام و کمال پوری نہیں ہوتیں مگر آہستہ آہستہ معاشرہ ان سے قریب ہوتا جاتا ہے۔ کیونکہ نشو و نما کے ساتھ ساتھ اس کے عیوب اور نقائص کم ہوتے جاتے ہیں اور اس کے وظائف زیادہ طبعی اور صحیح العمل ہوتے جاتے ہیں۔

۲۶۹۔ معاشرتی مرضیات کی خصوصیتیں

معاشرتی مرضیات کا موضوع کبھی کبھی کوئی عام نقص بھی ہوتا ہے جو سارے جسم اجتماعی میں پھیل گیا ہو۔ لیکن عموماً اس میں کسی خاص گروہ یا حکومت کے کسی خاص وظیفے کے نقائص سے بحث کی جاتی ہے۔ سب سے پہلے تو افلاس اور دولت کا عدم توازن ہے بعض لوگوں کو دولت کی زیادتی معاشرے کے لیے بے کار کر دیتی ہے اور بعض کو اس کی کمی اس سے بھی نکما کر دیتی ہے۔ اس طرح یہ دونوں گروہ اپنے طبعی معاشرتی فرائض ادا نہیں کر سکتے اور اس اعتبار سے وہ ناقص سمجھے جاتے ہیں۔ افلاس جب محتاجی کی حد تک پہنچ جائے اور لوگ اس کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنی مرضی کے خلاف عمل کرنے لگیں تو یہ سب سے بڑا معاشرتی مرض ہے۔ اس کی

بدولت انسان اپنی جسمانی اور ذہنی قوتوں کو آزادی سے معاشرے کی خدمت کے لئے استعمال نہیں کر سکتا۔ اس کی کارگزاری بہت کم ہوتی ہے اور اس کا معاوضہ بھی قلیل ہوتا ہے۔ مصلحوں اور عمرانی فلسفیوں کو ہمیشہ یہ فکر رہی ہے کہ ایک طرف افلاس کو اور دوسری طرف دولت اور سعی کے بیکار صرف کو کیونکر روکیں۔ دونوں صورتوں میں بعض افراد معاشرتی اتحادِ عمل کے کام کے نہیں رہتے کیونکہ حالات انھیں معاشرے کے مفید ارکان بننے سے روکتے ہیں۔ نکمّے امیروں کو بظاہر نا اہل غریبوں کے مقابلہ میں کام کرنے کا زیادہ موقع حاصل ہے لیکن اصل میں دونوں موقع کو نہ سمجھنے اور اس سے مناسب فائدہ نہ اٹھانے کے سبب سے ان خرابیوں میں مبتلا ہوئے ہیں۔

۲۷۰ - محتاجی اور گداگری

افلاس اور محتاجی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یہ محض غیر طبعی حالت نہیں بلکہ ایک معاشرتی بیماری ہے جو افراد کو لاحق ہوجاتی اور افلاس کے برخلاف معاشرتی حالات کے بدلنے سے دور نہیں ہوسکتی۔ جہاں محتاجی اور گداگری کسی معاشرے میں پیدا ہوئی تو پھر جونک کی طرح اس کا خون چوستی ہے اور اس کی کوئی خدمت انجام نہیں دیتی۔ طبعی معاشرہ محتاجوں اور گداگروں کو طفیلی کیڑے سمجھتا ہے اور ان سے اپنے وظائف کی ادائی کی کوئی توقع نہیں رکھتا۔ وہ کوشش کرتا ہے کہ یہ مرض بڑھنے نہ پائے ورنہ یہ اس کے حق میں عذاب ہوجاتا ہے کیونکہ جو لوگ معاشرے سے مدد لیتے ہیں اور اس کی کوئی خدمت نہیں کرتے ان کا بوجھ اسے پنپنے نہیں دیتا۔ محتاجی کی خرابیاں یہیں تک محدود نہیں بلکہ اس کے سبب سے طرح طرح کی بیماریاں اور عیوب پیدا ہوتے ہیں اس کی وجہ سے معاشرہ کو گھن لگ جاتا ہے اور نہ صرف اس کی قوتِ عمل بلکہ اس کا اخلاق بھی برباد ہوجاتا ہے

سچ پوچھیے تو یہ سب سے بڑی معاشرتی بیماری ہے۔

۲۷۱- جرائم

جرم معاشرتی مرضیات کی بدترین شکل ہے۔ معاشرے کے نقائص میں اس سے زیادہ غیر عمرانی اور غیر طبعی کوئی چیز نہیں۔ مجرم نظم اجتماعی کا کھلا دشمن ہے۔ وہ صریحاً معاشرتی زندگی کے بنیادی اصولوں پر حملہ کرتا ہے وہ تعمیر معاشرت کا مخالف ہے بلکہ اجتماعی احساس سے قطعاً محروم ہے کیونکہ جن لوگوں کے ساتھ اسے اتحادِ عمل کرنا چاہیے تھا انھیں وہ برباد کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ معاشرے سے بغیر خدمت کے معاوضہ لے اور دوسروں کی محنت کی کمائی غصب کرلے۔ وہ معاشرتی اتحاد اور معاشرتی زندگی کے قوانین کا کھلم کھلا مقابلہ کرتا ہے۔ جرم سے صرف انھیں لوگوں کا نقصان نہیں ہوتا جو اس کی زد میں آتے ہیں۔ بلکہ کل معاشرے کو صدمہ پہنچ جاتا ہے۔ مجرم عموماً معاشرتی اتحادِ عمل میں کوئی حصہ نہیں لیتے مگر اب یہ دستور ہوتا جاتا ہے کہ سزا کے دوران میں ان سے مفید کام لیا جائے۔

۲۷۲- عیوب

عیب معاشرے کی قوت حیات کو آہستہ رو مرض کی طرح برباد کرتا ہے چاہے وہ کوئی صورت اختیار کرے اس کی کیفیت غیر طبعی ہوتی ہے۔ اس کو روکنے کی صرف یہ تدبیر ہے کہ افراد کی اصلاح کی جائے۔ مگر اس کا اثر فرد تک محدود نہیں ہوتا بلکہ یہ روگ رفتہ رفتہ سارے معاشرے کو لگ جاتا ہے اور اس کی طبعی جدوجہد میں خلل پڑتا ہے۔ عیوب اور جرائم لازم ملزوم ہیں عموماً قانون بنانے میں یہ اہتمام کیا جاتا ہے کہ عیوب بھی جرائم کی حد میں داخل کر دئے جائیں۔ عیوب کی اصلاح اس لیے مشکل ہے کہ یہ اندر ہی اندر پھیلتے ہیں اور جن لوگوں

کو ان سے سابقہ پڑتا ہے آہستہ آہستہ ان کے اخلاق کو بگاڑتے ہیں ان کی قوتوں کو زائل کر دیتے ہیں اور انھیں طبعی معاشرتی جد وجہد کے کام کا نہیں رکھتے۔

۲۷۳-ناقص الجسم اور ناقص العقل افراد

ناقص الخلقت لوگوں مثلاً اپاہجوں، گونگوں، بہروں، اندھوں، ضعیف العقلوں اور دیوانوں کو بھی معاشرتی نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیئے اس لیے کہ ان کے وجود کا تعلق کل معاشرے سے ہے، نہ صرف ان کی خبر گیری جماعت کے ذمے ہے بلکہ ان کی تعداد کے بڑھنے میں قصور بھی بڑی حد تک اُسی کا ہے۔ اسے روکنا معاشرے کا کام ہے اور اس میں غفلت کرنا معاشرتی بیماری کی علامت ہے۔ اصلاح معاشرت کے بہت سے اہم مسائل انھیں ناقص الخلقت لوگوں کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان مسائل کو حل کرنے کی تدبیروں کا ذکر ہم کسی آیندہ باب میں کریں گے۔

۲۷۴-خاندانی مرضیات

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ تاریخ کی رو سے بھی اور ہیئت ترکیبی کے لحاظ سے بھی معاشرے کی بنیاد خاندان ہے اس کا ماحصل مقصد بچوں کی پرورش کے لیے اچھا ماحول مہیا کرنا ہے۔ ضمنی طور پر خاندان میں اور معاشرتی شعبوں کا رنگ بھی پایا جاتا ہے مگر یہ ممکن ہے کہ باوجود ان سب شعبوں کے ناقص ہونے کے خاندان طبعی حالت میں ہو۔ معاشرے کی غیر طبعی کیفیت یا حالتِ مرض کا اصل سبب میاں اور بیوی، والدین اور بچوں، بھائیوں اور بہنوں کے معاشرتی تعلقات کا ناقص ہونا ہے۔

غالباً ایک طبعی گھر بار کی پہلی شرط یہ ہے کہ والدین کی جسمانی اور نفسی صحت اچھی ہو اگر ان دونوں کی یا ان میں سے ایک کی

صحت خراب ہو تو صرف بچوں ہی میں نہیں بلکہ خاندانی تعلقات میں بھی حالتِ مرض پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی صورت اس وقت بھی ہوتی ہے جب میاں بیوی کے مزاج اور اخلاقی سیرت میں میل نہ ہو اس سے جو آپس کے جھگڑے پیدا ہوتے ہیں وہ جسمانی یا نفسی بیماری سے کم خطرناک نہیں غالباً معاشرتی زندگی کے کسی اور شعبے کے نقائص اتنے دیرپا نہیں ہوتے جتنے خاندانی تعلقات کے نقائص اور ان کا رفع کرنا یا روکنا بھی سب سے زیادہ مشکل ہے۔ خاندانی زندگی نج کی چیز ہے اور بیرونی مداخلت سے محفوظ ہے، اور شادی کی رسوم اور میاں بیوی کے تعلقات میں اس قدر نزاکت ہے کہ ان کے نظم و ضبط کے لیے عام قوانین بنانا بہت مشکل ہے، امریکہ کی کم سے کم چھ ریاستوں نے پچھلے چند سال کے اندر مجالس وضع قوانین میں ایسے مسودات قانون پیش کیے جن کا یہ منشا تھا کہ شادی کی رسم پر قیود عائد کی جائیں اور ان لوگوں کو، جو شدید امراض میں مبتلا ہیں نکاح کے اجازت نامے نہ دئیے جائیں سچ پوچھیے تو کل معاشرے کے مفاد کے لیے اس سے زیادہ سخت قوانین کی ضرورت ہے۔ ہم ذیل میں ایک مکمل نصب العین کا خاکہ پیش کرتے ہیں جس کے مطابق قانون بنائے جا سکتے ہیں:-

کسی شخص کو، جو صحیح العقل نہ ہو (اس میں ضعیف العقل اور دیوانے دونوں آ گئے) شادی کی اجازت نہ دی جائے۔

ہر شادی کے امیدوار کے پاس صحت کے تصدیق نامے ہونا چاہئیں جن سے یہ معلوم ہو سکے کہ وہ بعض مخصوص موروثی امراض سے پاک ہے۔

کسی شخص کو جس نے عضویات اور حفظانِ صحت کے مقررہ لکچر نہ سنے ہوں شادی کا اجازت نامہ نہ دیا جائے ان لکچروں کا انتظام ہر ملک میں باضابطہ طور پر عام مدرسوں میں یا مدارسِ شبینہ میں ہونا چاہیئے۔

کسی شخص کو جو اپنے ذریعۂ معاش کا تصدیق نامہ نہ پیش کرے شادی کا اجازت نامہ نہ دیا جائے۔
ہر ملک میں ایک رجسٹر رکھا جائے جس میں کل باشندوں کے نام مع ولدیت، عمر، تاریخ ولادت، پیشہ وغیرہ کے درج ہوں۔
ان قوانین کو عمل میں لانے میں بڑے احتیاط کی ضرورت ہوگی لیکن اگر ان کا پوری طرح نفاذ ہو جائے تو ان سے یقینی طور پر موجودہ حالت کی اصلاح ہو جائے گی۔
طلاق کے سبب سے خاندان میں افتراق پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے اس کا شمار بھی حالت مرض میں ہے۔ لیکن اس کی اصلاح اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ میاں بیوی کے تعلقات کی اصلاح نہ ہو۔ شادی کی سب سے بہتر اور برتر صورت وہ ہے جو رفاقت اور اتحاد عمل پر مبنی ہو۔ جس میں میاں بیوی عمر بھر محبت، ہمدردی اور باہمی امداد کے ساتھ بسر کرنے پر راضی ہوں، اس طرح اس پاک چیز کی بنیاد پڑتی ہے، جسے گھر کہتے ہیں اور جہاں بچوں کی پرورش و تربیت ہوتی ہے لیکن اکثر شادی کے محرک ادنیٰ مقاصد ہوتے ہیں بعض لوگ نفسانی خواہشات پوری کرنے کے لیے شادی کرتے ہیں، اور بعض اس نیت سے کہ ایک اچھی گھروالی اور خادمہ مل جائے جیسے کوئی گھوڑا خریدتا ہے۔ بعض کو بڑھاپے میں خبر گیری کرنے والی کی ضرورت ہوتی ہے اور بعض کو روپیے کا لالچ ہوتا ہے۔ اسی طرح بعض عورتیں محض گھر بنانے کے لئے یا نان نفقہ حاصل کرنے کے لئے شادی کرتی ہیں، انھیں شوہر کی ذات سے غرض نہیں ہوتی بعض اس لئے کہ شادی کرنا اچھا سمجھا جاتا ہے، یا کنوارا رہنا منحوس خیال کیا جاتا ہے اور بعض زبردستی بیاہ دی جاتی ہیں مگر اکثر لوگ بے سوچے سمجھے جلدی سے شادی کر بیٹھتے ہیں اور پھر اپنی حماقت پر پچھتاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا آخری سہارا طلاق کے ترمیم قوانین ہیں۔ اس

صورتِ حال کی اصلاح بہت کچھ انفرادی اور اجتماعی روشن خیالی اور شادی کے عمدہ قوانین سے ہو سکتی ہے۔ لیکن خاندانی حالتِ مرض کو دور کرنے میں سب سے زیادہ مدد طلاق کے مناسب قانون سے ملے گی جو نہ بہت سخت ہو اور نہ بہت نرم۔

حالتِ مرض کے دوسرے اسباب معاش کی تنگی، گھر کا اچھا نہ ہونا صحت بخش غذا اور حفظانِ صحت کے وسائل کی کمی اور خاندانی نظم وضبط کی خرابی ہیں۔ جہاں اخلاقی معیار پست ہو اور معاشرہ نامکمل حالت میں ہو وہاں خاندانی زندگی کے برے اثرات اس قدر قوی ہوتے ہیں کہ انھیں دور کرنا بہت مشکل ہے۔ جس شخص کو خود اس کے گھر نے بگاڑا ہو اس کی پوری اصلاح کی کوئی تدبیر نہیں بلکہ اگر خاندان میں انضباط کی کمی ہو اور بچوں کی تربیت سے غفلت برتی جائے تو بھی انھیں وسیع معاشرتی زندگی کے لئے طیار کرنا ناممکن ہے۔

۲۷۵۔ ریاست کی خرابیات

اگر ہم ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو دیکھیں جو وفاقی جمہوریت کی مثال سمجھی جاتی ہیں تو یہ نظر آتا ہے کہ یہ حکومت نصب العین سے بہت دور ہیں اور ان کا عمل بہت ناقص ہے۔ حکومت کے بہت سے نقائص کا باعث معاشرتی زندگی کا نامکمل ہونا ہے۔ آزادی کتنی ہی مکمل کیوں نہ ہو مگر اسراف پر مبنی ہوتی ہے۔ اور آزاد یا عمومی حکومت نامکمل حکومت ہے۔ اس کا قایم کرنا اور قایم رکھنا بہت مشکل ہے۔ وضع قوانین کا کوئی علم نہیں بلکہ کوئی فن بھی نہیں جس کی عمدہ تعلیم ہوتی ہو حکومتِ خود اختیاری میں شہری اپنے وضع قوانین کے اختیارات ایک ایسی جماعت کو تفویض کر دیتے ہیں جس کے اکثر افراد ناتجربہ کار ہوتے ہیں اور قبل اس کے کہ یوں لوگوں کی ضروریات سے واقف ہوں ان کی میعاد پوری ہو جاتی ہے اور ان کی جگہ دوسرے منتخب ہو جاتے ہیں۔ ہماری بنیادی

قوانین اب تک متروک قانون سے بھری پڑی ہے، جن سے جمہور کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا اور بعض جواب تک نافذ ہیں وہ بیکار بلکہ مضر ہیں۔ پھر ارباب سیاست کی رشوت ستانیاں اور بازاری لیڈروں کی ریشہ دوانیاں اور بھی غضب ڈھاتی ہیں۔ غرض حکومت کی خرابیوں کو دیکھتے ہوئے ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ سیاست اور حکومت میں صریحی حالتِ مرض موجود ہے۔

۲۷۶۔ تعلیم کی مرضیات

ہمارا نظامِ تعلیم بھی اکثر صورتوں میں ذرائع کو مقاصد کے مطابق بنانے میں ناکامیاب رہتا ہے۔ وہ دانشمند شہری پیدا کرنے سے قاصر ہے وہ ذہنی تعلیم پر اس قدر زور دیتا ہے کہ ہمارے نوجوان شدت سے عصبی المزاج ہوجاتے ہیں اور جسمانی حیثیت سے کمزور رہ جاتے ہیں اور مدرسوں کی تعلیم اکثر نامکمل اور غیر متوازن ہوتی ہے اور اس کے معاشرتی نتائج خراب ہوتے ہیں کہ اس پر حالتِ مرض کا اطلاق ہوتا ہے اس میں بہت سے صریحی نقائص موجود ہیں۔ مثلاً طرز تعلیم کی خرابی مدرسوں کی نالائقی، درس میں ہم آہنگی نہ ہونا۔ نصاب کا مقصدِ تعلیم نہ پورا کرسکنا۔ ادب کے ذریعے سے جو تعلیم ہوتی ہے وہ بھی بہت ناقص ہے۔ ہر طرح کی کتابیں چھپتی ہیں اور شائع ہوتی ہیں۔ جمہور انھیں کتابوں کو پسند کرتی ہے جن میں تفریح اور دلچسپی کا سامان ہو۔ بہت سی عامیانہ کتابوں کا اثر صریحاً مضر اور مخرب اخلاق ہے۔ ادب اشاعتِ علم کا ذریعہ ہے اگر یہ باطل کو حق بنا کر دکھائے، زندگی کا غلط تصور پیدا کرے، نامناسب اور نامعقول خواہشوں کو ابھارے اور لوگوں کو دھوکہ دے تو اس سے اخلاق کا بگڑنا لازمی ہے۔ چاہے اشاعتِ علوم کا آلہ کتنا ہی مکمل ہو مگر جب معلومات کی اشاعت ہوتی ہے اس میں بیماری کے جراثیم موجود رہیں۔

اخبار بھی حالت مرض سے خالی نہیں انھیں دعوے ہی کہ ہم رائے عامہ کے رہنما ہیں اور جمہور کے معلم ہیں۔ مگر وہ اکثر اپنی رائے بیچ دیتے ہیں اور جو کچھ لکھتے ہیں اس میں صرف اپنے نفع کا اور خریداروں کو خوش رکھنے کا خیال رکھتے ہیں۔ انھیں اس سے بحث نہیں کہ حقیقت کیا ہے اور ان کے مضامین کا معاشرے پر کتنا خراب اثر پڑے گا۔ زیادہ تر اخبار تجارتی مقصد رکھتے ہیں اور خبروں کے بازار کی مانگ پوری کرتے ہیں۔ بعض بدترین قسم کے پرچے لوگوں کو دھمکا کر رشوت لیا کرتے ہیں اور ان کا منہ بند کرنے کے لیے انھیں اشتہارات دیئے جاتے ہیں اس لیے اخبار کی چند در چند خدمات اور فوائد کا اعتراف کرتے ہوئے ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ ان میں بہت سی خرابیاں ہیں۔

بہت سے اخبار "سنسنی خیز" مضامین شائع کرتے ہیں، جن سے غلط رائے قائم ہوتی ہے اور غیر اہم تفصیلات سے لوگوں کے وقت ضائع کرتے ہیں اس صورت حال کی اصلاح کی کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آتی اس لیے کہ معاشرہ آج کل اعصابی ہیجان میں مبتلا ہے اور اسے گرما گرم خبروں کی ضرورت ہے اگر کوئی سنجیدہ اور خشک اخبار نکلے تو اسے کوئی بھی نہ پڑھے۔ چارلس ایچ شیلڈن[1] نے بڑی کوشش کی کہ آج کل کے اخبارات میں مذہب کا رنگ پیدا کریں مگر وہ ناکامیاب رہے۔ ان کے اخبار میں بہت سی اچھی باتیں تھیں مثلاً جرائم کی خبروں میں صرف ضروری واقعات بیان کئے جاتے تھے اور جھوٹے اشتہارات شائع نہیں ہوتے تھے لیکن لوگوں نے اسے اخبار کی حیثیت سے پسند نہیں کیا۔ آج کل وہی اخبار کامیاب ہوسکتا ہے جسکی عبارت میں رنگینی یا شوخی اور چٹخارا ہو اور جو بہت سی خبریں دیا کرے اگر وہ دلچسپ نہ ہو تو اس کے خریدار بہت کم ہوں گے۔ اخبار ایک تعلیمی خدمت ہے اور اس کی اصلاح رائے عامہ پر موقوف ہے۔ اخبار کا مالک وہی مال نکالتا ہے جس کی بازار میں کھپت ہو پھر بھی ہر سال اونچے درجے کے اخبارات کی تعداد کم ہوتی جاتی ہے اور یہ اس بات

[1] Charles H. Sheldon.

کی علامت ہے کہ معاشرے کا اخلاقی معیار بلند ہو رہا ہے۔

۲۷۷۔ غیر معاشروں کا گروہ

معاشرے کی ایک حالتِ مرض جس پر کم نظر پڑتی ہے غیر معاشرت پسند لوگوں کا وجود ہے۔ ایک طرف تو ایسے اشخاص ہیں جن کا سارا وقت دوسروں کی بھلائی کی کوشش میں صرف ہوتا ہے۔ یہ ہمیشہ افراد کی راحت و بہبود یا کل معاشرے کی حقیقی فلاح کی دھن میں رہتے ہیں اور ذاتی اغراض سے بالکل پاک ہوتے ہیں۔ ان میں جذبۂ ہمدردی اتنا شدید ہوتا ہے کہ مرض کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔ دوسری انتہا پر وہ افراد ہیں جو اتنے خود غرض ہیں کہ انھیں اپنے بنی نوع سے مطلق ہمدردی نہیں۔ ان کی زندگی کا ہر لمحہ خود اپنی بقا اور ترقی کی کوشش میں صرف ہوتا ہے اور انھیں اپنے فائدے کے لیے دوسروں کو نقصان پہنچانے میں ذرا بھی تامل نہیں ہوتا، یہ عمرانیات کی اصطلاح میں "غیر معاشر" کہلاتے ہیں۔ چونکہ مکمل معاشرے کے لیے کل افراد کے اتحادِ عمل کی ضرورت ہے اس لئے ظاہر ہے کہ ان لوگوں کا وجود بھی ایک حالتِ مرض ہے۔

اس کے علاوہ بڑے شہروں میں، جہاں مختلف اقوام کے لوگوں کی گنجان آبادی ہوتی ہے۔ اور زبان طرزِ زندگی رسوم و روایات اور مقاصد کے اختلاف کے سبب سے اجتماعی ربط اور اتحادِ عمل بہت کم ہوتا ہے، بہت سے شدید معاشرتی نقائص نظر آتے ہیں جو امراض کی حد تک پہنچ گئے ہیں بڑے شہروں کی معاشرتی حالت کو دیکھتے ہوئے اس کی بہت سخت ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ہر طرح کے عیوب اور جرائم کے خلاف مسلسل جنگ کی جائے۔ اور سب دیہات برائیوں سے خالی نہیں ہوتے۔ یہ سچ ہے کہ گاؤں کے ہٹے کٹے مضبوط لوگ شہر میں آتے ہیں مگر ان میں سے بعض مجرم اور بد چلن بھی ہوتے ہیں۔ پھر بھی بدیہی اور معاشرتی نقائص کا مرکز شہر ہی ہے۔

باب دوم

خیرات اور اس کی تنظیم

۲۷۸- خیرات کا فلسفہ

خیرات کے معنی عام طور پر محتاجوں کو بھیک دینا اور بیماروں اور بیکسوں کی خبرگیری کرنا سمجھے جاتے ہیں۔ جو مفہوم آج خیرات کے لفظ کا ہے اس کے لئے پہلے بھیک کا لفظ استعمال ہوتا تھا بائبل میں (خیرات یا احسان) محبت یا عام انسانی ہمدردی کے معنی میں آیا ہے اس وسیع مفہوم کے لحاظ سے اس کے موضوع ہر طبقے اور حیثیت کے لوگ جنھیں ہمدردی اور مدد کی ضرورت ہو، ہو سکتے ہیں، جدید علمی اصطلاح میں خیرات غریبوں، کمزوروں، بیماروں اور بیکسوں کی مدد کو کہتے ہیں اور خیراتی اداروں سے مراد وہ ادارے ہیں جہاں یہ مدد اشتراکِ عمل کے اصول پر دی جاتی ہے۔ موجودہ زمانے میں خیرات محض انفرادی فرض نہیں بلکہ ایک اجتماعی وظیفہ بن گئی ہے۔ یہ ایک ذریعہ ہے کُل معاشرے کی محافظت اور اس کی طبعی صحت اور نشو ونما کو تقویت پہنچانے کا۔ معاشرہ کمزوروں کی خبرگیری کر کے معاشرتی امراض اور اخلاقی تنزل کا سدِ باب کرتا ہے۔ اور اس طرح گویا خود اپنی حفاظت کرتا ہے۔ گداگری، جنون، مرگی، ضعف العقلی اندھے پن اور بہرے پن کے انسداد سے اور ان امراض کے مریضوں کی خبرگیری سے طبعی اور صحیح جسمِ اجتماعی کی قوت بڑھتی ہے بعض فلسفیوں کا

جن میں ہربرٹ اسپنسر بھی شامل ہے، یہ خیال ہے کہ تنومند لوگوں کی مزید نشو و نما کی کوشش چاہیئے اور کمزوروں اور ضعیفوں کو اُن کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے، یہ لوگ نظریۂ ارتقا اور بقائے اصلح کے اصول کے کٹر پیرو ہیں۔ ان کے قول کے مطابق طبعی ارتقا کے اصول کو نافذ کرنے کے لیئے نوعِ انسان کو چاہیئے کہ اپنی ساری کوشش نسل کے بہترین افراد کی ترقی میں صرف کرے، ناقص الخلقت لوگوں کی امداد میں قوت عمل ضائع نہ کرے۔ وہ یہاں تک کہتے ہیں کہ اگر معاشرے کے کمزور اور بیمار افراد ہلاک ہوجائیں تو صحیح الجسم اور تنومند لوگوں سے نسل چلے گی اور آیندہ کوئی کمزور نہ ہوا کرے گا۔ یہ ارتقا کا ایک مسلمہ اصول ہے اور پھلوں، پھولوں کی کاشت اور جانوروں کی افزائشِ نسل میں اس پر برابر عمل ہوتا ہے، لیکن نوعِ انسانی کی نشو و نما میں اس کا استعمال بغیر چند قیود کے نہیں کیا جا سکتا۔ معاشرے میں اتنا اندرونی ربط ہے اور اس کے افراد کے باہمی تعلقات اتنے گہرے ہیں کہ اگر تنومند اپنی حفاظت کرنا چاہتے ہیں تو انھیں کمزوروں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ ہم اپنے جسم کے متعلق یہ نہیں کہہ سکتے کہ اگر ہاتھ میں کوئی بیماری ہے تو کیا پرواہ ہے سر، قلب اور دھڑ سلامت رہنا چاہیئے، کیونکہ اگر یہ بیماری پھیلی تو سر، قلب اور دھڑ کو بھی لے ڈالے گی۔ اِس لیے اور باتوں سے قطعِ نظر کرکے محض اپنی حفاظت کے لئے معاشرے پر کمزوروں اور ناقص الخلقت لوگوں کی خبر گیری واجب ہے۔ اس کے علاوہ اگر وہ انتہائی خود غرضی برتنے لگے تو اس میں ایثار کا مادہ نہ رہے گا، بلکہ ہمدردی بھی بہت کم ہوجائے گی اور ان بہتر صفات کے نہ رہنے سے نوعِ انسانی کا انحطاط شروع ہو جائے گا۔ غرض اگر خیرات کا مصرف صحیح ہو تو اس سے کمزوروں کی حفاظت ہوتی ہے معاشرتی بیماریاں پھیلنے نہیں پاتیں اور تنومند بے غرضانہ جد و جہد کی برکت سے اور زیادہ قوی ہو جاتے ہیں۔

۲۷۹۔ خیرات سب قوموں میں پائی جاتی ہے

خیرات کا طریقہ بہت قدیم ہے اور سب قوموں میں کم و بیش مستقل معاشرتی زندگی پیدا ہونے کے بعد اس کا رواج نظر آتا ہے۔ ہندوستان۔ مصر ایران اور چین کے فلسفیوں نے غریبوں کی خبر گیری کے پاکیزہ اور ہمدردانہ اصول کی تلقین کی ہے اور ان کے اکثر قوانین میں خیرات کی عملی تجاویز موجود ہیں۔ ایتھنس میں غریبوں کی مدد کے لئے باضابطہ طور پر ٹیکس وصول کیا جاتا تھا۔ ارسطو نے اس ٹیکس کی بجائے امداد کا یہ طریقہ تجویز کیا کہ زمین کے چھوٹے چھوٹے قطعے محتاجوں کو تقسیم کیے جائیں تاکہ وہ اپنی قوتِ بازو سے روزی کما سکیں۔ وحشی قبائل عموماً غریبوں اور ضعیفوں کی خبر گیری نہیں کرتے لیکن میکسکو کے ازٹیک[1] قبیلے اور پیرو کے انکاس[2] قبیلے نے اتنی ترقی کر لی تھی کہ ان کے یہاں ان لوگوں کی مدد کا معقول انتظام تھا۔ پہلے قبیلے میں غریبوں کی مدد کی عام ہدایت تھی اور دوسرے میں یتیم خانے قائم تھے۔ یہودیوں کی عبادت گاہوں میں خیرات تقسیم ہوتی تھی اور عبرانی سلطنت جمہوری غریبوں کی خبر گیری کا بندوبست کرتی تھی۔ جب یہودیوں کے معبد عیسائیوں کا گھر بنے تو خیرات بدستور تقسیم ہوتی رہی اور جب ان کی جگہ گرجے قایم ہوے تو وہ بھی ان کی تقلید کرنے لگے۔ یہ قابل لحاظ بات ہے کہ عیسائیوں میں سب سے پہلے جو کلیسا کا عہدہ دار مقرر ہوا وہ "ڈیکن[3]" تھا اور اس کا سب سے بڑا فرض یہ تھا کہ جماعت کے غریبوں کی خبر گیری کرے۔

خیرات کی تقسیم کے متعلق بہت سے مسائل جن پر ہم آج غور کر رہے ہیں عہد قدیم کی قوموں کے پیش نظر رہ چکے ہیں لیکن یہ کہنا پڑتا ہے کہ فلسفیوں کے پاکیزہ اقوال کے باوجود حقیقی خیرات عملی طور پر بہت کم پائی جاتی تھی حکیموں

[1] Aztecs

[2] Incas

[3] Deacon

کی تعلیم مذہب اور خیرات کے متعلق کچھ اور تھی اور لوگوں کا عمل کچھ اور تھا اس کے علاوہ ان قوموں کا نظام حکومت اور نظم معاشرت اس قسم کا تھا کہ بہتر سے بہتر ریاستوں میں بھی افلاس اس قدر جلد پھیلتا کہ اس کا دور کرنا مشکل تھا۔

خیرات کے پرانے طریقے میں سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ خیرات کی اصل محرک ذاتی اغراض تھیں۔ لوگ ضعیف الاعتقادی اور خوف کے سبب غریبوں کی امداد کرتے تھے تاکہ ان پر دیوتاؤں کی نظر عنایت ہو جائے ان کی نیت ایثار پر نہیں بلکہ استیثار پر مبنی تھی اور انھیں حاجتمندوں کی مدد کی سچی خواہش نہیں تھی اس لیے وہ بے دیکھے بھالے بھیک دیتے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فقیروں اور گداگروں کا ایک گروہ پیدا ہو گیا، قدیم معاشرے میں لوگ محتاج پر ترس کھاتے تھے لیکن کلیسا کی تعلیم کی بدولت وہ اسے اس نظر سے نہیں دیکھتے تھے کہ یہ ہمارا جیسا انسان ہے جس کی مدد کرنا چاہیے، بلکہ اسے جنت کا دروازہ سمجھتے تھے، ساری خیرات عارضی امداد تک محدود تھی اور غریبوں کی مستقل فلاح کی کوئی باقاعدہ کوشش نہیں کی جاتی تھی، یعنی تنظیم بالکل مفقود تھی خیرات کے یہ معنی تھے کہ فقیر کے آگے روٹی کا ٹکڑا اس خیال سے پھینک دیا جائے کہ وہ کسی طرح نظر کے سامنے سے ہٹ جائے اور دل سے دور ہو جائے۔ قدیم قوموں کی خیرات کی یہ خصوصیت ایک حد تک آج بھی موجود ہے بہت سے لوگ جو کچھ دیتے ہیں اپنے ضمیر کو تسکین دینے کے لیے یا مرحڑیے سائل سے پیچھا چھڑانے کے لیے دیتے ہیں، ان کی نیت اس خاص شخص کی امداد کی نہیں ہوتی۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اب تک خیرات کو خواہ وہ کسی قسم کی ہو جنت کا دروازہ سمجھتے ہیں۔

۲۸۰۔ اہل روما کی خیرات

چونکہ مذہب عیسوی کے آغاز کے زمانہ میں روئے زمین پر روما کا نظام سلطنت حاوی

تھا۔ اِس لیے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شاہنشاہی کے قائم ہونے سے پہلے اور اس کے بعد وہاں خیرات کا جو حال تھا اس کا مختصر طور پر ذکر کر دیا جائے، جمہوری حکومت کے زمانے میں اہل روما دو طبقوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ ایک تو امرا کا طبقہ تھا جس کے ہاتھ میں دولت اور سیاسی قوت تھی اور دوسرا بے مایہ غریبوں کا، پہلا طبقہ کل دولت اور وسائلِ دولت پر قابض تھا، اِس لیے دوسرا اس کا دست نگر تھا اور اسکی خیرات پر بسر کرتا تھا، امرا کو اپنا اثر قائم رکھنے کے لیے سیاسی قوت کی ضرورت تھی اس لیے عوام ان سے روپیہ لے کر اپنے ووٹ بیچتے تھے، آگے چل کر عوام کی تعداد اور قوت بڑھ گئی، اور ان میں خود سری پیدا ہو گئی۔ پھر بھی ہر وہ شخص جو روما میں سیاسی قوت حاصل کرنا چاہتا تھا انھیں راضی رکھنے پر مجبور تھا اِس لیے کہ وہاں کوئی متوسط طبقہ نہیں تھا جو ملک کی سیاسی اور معاشرتی زندگی میں توازن قائم رکھتا، غلامی کے رواج کی وجہ سے ہر قسم کی محنت ذلیل سمجھی جاتی یہاں تک کہ سوائے سیاسی قیادت اور زمینداری کے اور ہر پیشے کو لوگ بری نظر سے دیکھتے تھے، سوائے اس کے اور کوئی صورت نہ تھی کہ ایک طبقہ دوسرے طبقے کی کفالت کرے، اِس لیے غریب لوگ امیروں کی داد و دہش کے امیدوار رہتے تھے۔

سلطنت کے قائم ہونے کے بعد یہ بات اور بڑھ گئی، یہ اندازہ کیا جاتا ہے کہ اگسٹس[1] کے زمانے میں شہر روما میں پانچ لاکھ اسی ہزار اشخاص دوسروں کی امداد پر بسر کرتے تھے شاہنشاہوں کا دستور تھا کہ تخت نشینی کے موقعے پر بڑی بڑی رقمیں انعام کے طور پر تقسیم کرتے تھے اور ان کے ارکین سلطنت بھی ان کی تقلید کرتے تھے۔

جب یہ خبر ساری سلطنت میں مشہور ہوی کہ روما میں غلہ اور شراب دل کھولکر تقسیم ہوتی ہے تو بہت سے لوگ آکر شہر میں جمع ہو گئے کہ اِس سے

---

[1] Augustus

فائدہ اٹھائیں۔ صوبہ جات میں گداگری کا رواج عام نہ تھا لیکن روما میں بھیک منگوں کی بیحد کثرت تھی۔

غریبوں کو فاقے سے بچانے کے لیے غلے کا بھاؤ سرکاری طور پر مقرر کرنے کی بہت سی کوششیں کی گئیں اور کائیس گراکس[1] کے زمانے میں پانچ آنس فی لبشل کا نرخ ہوگیا جو اصل لاگت سے بھی کم تھا، ظاہر ہے کہ اس کی وجہ سے غلے کی کاشت اور درآمد کم ہوگئی اور مجبوراً پھر وہی طریقہ اختیار کرنا پڑا۔ کہ عوام کو غلہ مفت بانٹا جائے۔ اب غلہ اور آگے چل کر شراب اور تیل بلا امتیاز ہر کس و ناکس کو تقسیم ہونے لگا اور یہ سخاوت ہر شہنشاہ کے عہد میں بڑھتی گئی۔ ارباب سیاست بازاری لیڈروں اور سرکاری عمال کی اس داد و دہش کا اندازہ کرنے کے لیے چند مثالیں کافی ہیں ۷۲ء قبل مسیح میں تقریباً چار لاکھ اڑتیس ہزار ڈالر کے قریب تقسیم ہوئے ۴۶ء قبل مسیح میں تینتیس لاکھ پچھتر ہزار تک نوبت پہنچ گئی۔ قیصر آگسٹس کے زمانے میں تین لاکھ بیس ہزار آدمیوں کو غلہ بٹا کرتا تھا اور رفتہ رفتہ یہ تعداد بڑھتی رہی سالانہ تقسیم نیرو[2] کے زمانے سے سیویرس[3] کے عہد تک ۱۵ لاکھ ڈالر ہونے لگی، یہ تقسیم ریاست روما یا بلدیہ روما کے عمال کے ہاتھوں ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ سرکاری عہدوں کے خواستگار اور بازاری لیڈر اپنے منصب پر اس طرح قائم رہ سکتے تھے کہ اپنی ناجائز کمائی میں سے عوام کو بھی حصہ دیں۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ نیرو نے اپنے عہد سلطنت میں روما میں نوکرور پینسٹھ لاکھ ڈالر کی اشیاء خوردنی تقسیم کیں اور ہیڈرین[4] کی داد و دہش کا اوسط فی کس ۱۶۵ ڈالر ہوتا ہے۔ ان چیزوں کی صحیح مقدار

---

[1] Cains gracchus

[2] Nero

[3] Severus

[4] Hddrian

معلوم کرنا مشکل ہے لیکن ان تخمینوں سے بھی کچھ تھوڑا بہت اندازہ ہوتا ہے کہ کتنی بڑی بڑی رقمیں صرف کیجاتی تھیں۔ مگر یہ صحیح معنی میں خیرات نہیں تھی بلکہ گداگری کو فروغ دینے کا ایک باضابطہ طریقہ تھا۔ اس کی وجہ سے لوگوں کا یہ حق مسلّم ہوگیا کہ وہ ریاست سے امداد طلب کریں۔ اس میں شک نہیں کہ اہلِ روما ذاتی اغراض کی بنا پر اپنے شہر کے باشندوں خصوصاً رومی شہریوں کی پرورش کرتے تھے لیکن اصل میں ان میں مصیبت زدوں سے ہمدردی کرنے کا مادہ بہت کم تھا، اس زمانے میں بھی اصول کی حمایت کی جاتی تھی کہ ناقص الخلقت بچوں کو پھینک دینا چاہیئے اور بوڑھوں کو مرجانے دینا چاہیئے تاکہ وہ معاشرے پر بار نہ ہو۔ روما میں نہ شفاخانے تھے، نہ محتاج خانے اور نہ ناقص الخلقت لوگوں، غریبوں اور مصیبت زدوں کی خبرگیری کے اور کوئی وسائل۔ یہ چیزیں عیسوی کلیسا کے لئے اٹھا رکھی گئی تھیں جس نے خیرات کی بنا بجائے گندی سیاسی پالیسی کے ہمدردی اور خدا ترسی پر رکھی۔

۲۸۱۔ عیسوی کلیسا کی خیرات

ابتدائی زمانے کی عیسائی جماعتیں اپنے غریب ارکان کی خبرگیری کو اپنا بڑا فرض جانتی تھیں۔ اس تعلیم کا کہ سب انسان ایک دوسرے کے بھائی ہیں، یہ تقاضا تھا کہ برادرانہ محبت کی گرم بازاری، کلیسا کے اصول و عقائد رومی نظریے اور نظام کے بالکل برعکس تھے۔

ساری نوعِ انسانی کی محبت دل میں لئے ہوئے کلیسا نے غریبوں مصیبت زدوں اور مظلوموں کی مستقل امداد کا کام شروع کیا۔ رومیوں کے قدیم سرد مہر فلسفے کے مقابلے میں اس نے انسانوں کی گرم جوش محبت کے اصول کی تلقین کی اور اس پر عمل کرکے اس زمانے کی خیرات کا سارا کام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

۲۸۲- کلیسا کی خیرات کے نتائج

کلیسا نہ صرف اپنی چھوٹی چھوٹی جماعتوں کے ارکان کی خبر گیری کرتا تھا بلکہ ان لوگوں کی بھی جن سے انھیں سابقہ پڑتا تھا۔ اس نے اپنی ساری قلمرو میں صومعے قائم کیے جو غریبوں اور مظلوموں کے لیے مامن کا کام دیتے تھے۔ اس نے شفاخانے اور محتاج خانے تعمیر کیے اور ساری دنیا کو خیرات اور برادرانہ ہمدردی کا سبق دیا۔ روما میں گداگری کا رواج صدیوں سے چلا آتا تھا اب اس کا سارا بوجھ مخیر کلیسا کے سر پڑ گیا جس کا اٹھانا اسے دشوار ہو گیا۔

سلطنت روما کے زوال کے بعد سیاسی قوت کلیسا کے ہاتھ میں آئی جس کا وہ اپنی خدمات کی بنا پر مستحق بھی تھا اور اسی کے ساتھ اس پر یہ ذمہ داری عائد ہوئی کہ اپنی ساری رعایا کی خبر گیری کرے۔

چونکہ کلیسا کو سب کے ساتھ مساوات برتنے کا خیال تھا اور بلا امتیاز خیرات تقسیم کرتا تھا، اس لیے ہزاروں آدمی اس سے بیجا فائدہ اٹھا کر کاہلی اور آرام طلبی کی زندگی بسر کرنے لگے اور پیشہ ور گداگر بن گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرون وسطیٰ میں اور عہد جدید کے آغاز میں ہزاروں لاکھوں آدمی خیراتی انجمنوں اور اداروں کا دامن تھام کلیسا کی سخاوت کے طفیل میں زندگی بسر کرتے تھے، اور اس معاملہ میں کلیسا کو کوئی الزام بھی نہیں دیا جا سکتا تھا، کیونکہ جب وہ خیرات کی تلقین کرتا تھا تو اس پر عمل کرنا بھی ضروری تھا۔

خیرات کا ایک اور طریقہ بھی تھا جس میں صرف دینے والے کا فائدہ مد نظر تھا۔ اس کا اصول یہ تھا کہ جو کچھ دیا جائے وہ خدا کو دیا جائے جو غریبوں کا داتا ہے اور دینے والے کو اس کا صلہ بہشت میں ملے گا۔ اس لیے خیرات عیسائیوں کی نجات کا ذریعہ اور ان کا مذہبی فریضہ بن گئی۔ یہ اصول اگر اعتدال کے ساتھ برتا جائے تو اچھا ہے، لیکن جب یہ نوبت پہنچ جائے کہ زمینیں اور جائدادیں غریبوں کے نام پر وقف کی جائیں مگر ان سے سوائے

اس کے کہ دینے والے کو ثواب ملے اور کسی شخص کو فائدہ نہ پہنچے تو یہ محض خود غرضی کا اصول بن جاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس سے کلیسا کا اخلاق بگڑتا ہے کیونکہ وہ روحانی نجات کی طمع دلا کر روپیہ وصول کرتا ہے

۲۸۳۔ ریاست کی خیرات

جب معاشرے میں جاگیرداری نظام رائج ہوا تو ہر شخص کا ایک ٹھکانا ہو گیا۔ اور خیرات کی ضرورت نہیں رہی۔ اس نظام کے زوال کے بعد غریبوں کی تعداد بہت بڑھ گئی اور کلیسا کے سر اتنا بوجھ آن پڑا کہ بغیر ریاست کی شرکت کے اس کا برداشت کرنا ناممکن تھا۔ آہستہ آہستہ یورپ کی قومیں غریبوں کی امداد کی تدابیر اختیار کرنے لگیں۔ ان میں سب سے ممتاز انگلستان تھا۔

پہلے مزدوری کے متعلق قوانین پاس کئے گئے، جن کا مقصد یہ تھا کہ مزدور اپنی غلامی کے حالت میں رکھے جائیں جو جاگیرداری نظام نے پیدا کر دی تھی۔ چودھویں اور پندرھویں صدی میں جو قوانین پاس ہوئے ان میں سے ایک ترک وطن کرنے والوں کی تعزیر کا تھا (نمبر ۱۲ عہد رچارڈ دوم)۔ جب ہنری ہشتم نے صومعوں کو توڑ دیا تو ترک وطن بہت بڑھ گیا اور اسے روکنے کے سخت قوانین بنائے گئے (یہ عہد اڈورڈ ششم) اور غریبوں کے لیے محصول وصول کرنے کی غرض سے ہر کلیسائی حلقے میں محصل مقرر کئے گئے۔ خیرات ابھی تک کلیسا کے توسط سے تقسیم ہوتی تھی، البتہ الزبتھ[1] کے عہد سے ریاست نے خیرات کی طرف بہت زیادہ توجہ کی اور خیرات کی تقسیم کلیسائی عہدہ داروں کے ہاتھ سے نکال کر ریاست کے حکام کو تفویض کی گئی۔ متعدد قوانین بنائے گئے اور یہ سلسلہ ۱۶۰۱ء کے قانون (نمبر ۴۳ عہد الزبتھ) پر ختم ہوا جو انگلستان کے "قانون مفلسین" کی بنیاد سمجھا جاتا ہے۔ اس کے بعد وقتاً فوقتاً اور قوانین کے ذریعہ سے اس قانون میں

[1] Elizabeth.

ترمیم اور اصلاح ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ غریبوں کی امداد کا ایک مکمل نظام بن گیا۔ یہ قوانین بہت سی باتوں کے لحاظ سے مفید تھے مگر عملدرآمد کا طریقہ غیر دانشمندانہ تھا جس کا یہ اثر ہوا کہ گداگروں کی تعداد بڑھتی گئی اور ان کی امداد کی رقم میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ ریاست نے یہ اصول مدنظر رکھا تھا کہ کل حاجتمند امداد کے مستحق ہیں اور چونکہ تقریباً سب مزدور حاجتمند تھے اس لیے ان کی بھی مدد کرنا پڑتی تھی۔ مصارف بڑھتے گئے یہاں تک کہ ۱۷۸۳ء میں بہ قول فاول[۱] کے غریبوں کی امداد میں بیس لاکھ چار ہزار دو سو اڑتیس پاونڈ صرف ہوئے۔ ۱۸۰۳ء میں بیالیس لاکھ ترسٹھ ہزار چھ سو چھانوے تک نوبت پہنچی۔ سب سے زیادہ صرف اس مد میں ۱۸۱۸ء میں ہوا (اٹھتر لاکھ ستر ہزار آٹھ سو ایک پونڈ) جب آبادی صرف ایک کروڑ دس لاکھ تھی۔

۱۸۳۴ء میں "قانون امدادِ مفلسین" میں ترمیم اور اس کے انتظام میں اصلاح کی گئی اور اس کے بعد اور قوانین کے ذریعے سے مزید ترمیم و اصلاح ہوتی رہی۔ یہ قوم سابقہ کوتہ اندیشانہ طرز عمل کے برے نتائج سے اب تک نقصان اٹھا رہی ہے۔ اگرچہ اس کا امدادِ مفلسین کا نظام دنیا کی سب قوموں سے زیادہ منظم ہے لیکن اس کی وجہ سے اسے زیر باری بھی سب سے زیادہ اٹھانی پڑتی ہے۔

۲۰۴ ہیمبرگ اور ایلبرفیلڈ[۲] کا نظام خیرات

۱۷۶۵ء کے لگ بھگ ہیمبرگ میں گداگروں اور محتاجوں کی امداد کا ایک نیا طریقہ جاری ہوا۔ اٹھارھویں صدی کے وسط سے آخر صدی تک یورپ میں خستہ حال اور فلاکت زدہ لوگوں کی بہت بڑی تعداد

ے[۱] Fowle, Poor Law, p. 73.

ے[۲] Hamburg-Elberfeldt System.

اکٹھا ہو گئی تھی ۔ ان کی امداد کی تحریک بھی جلد شروع ہو گئی ۔ یورپ میں سخاوت اور خیرات کا دریا بہنے لگا ۔ اس سے بیکسوں اور غریبوں کو مدد تو ضرور ملی لیکن طریقہ اس قدر غیر دانشمندانہ اور غیر منظم تھا کہ مجموعی معاشرے کو اس سے فائدے کی بجائے نقصان پہنچا ۔ ہیمبرگ سالہا سال سے مشرقی اور مغربی ملکوں سے تجارت کر رہا تھا اس لئے وہاں دولت کی افراط تھی اور چونکہ یہ آفاقی شہر[1] تھا اس لئے ہزارہا آدمی یہاں مزدوری کی یا خیرات کی تلاش میں جمع ہو گئے تھے ۔ سڑکیں گداگروں سے بھری ہوئی تھیں اور ہزاروں آدمیوں کو مختلف ذرائع سے مدد ملتی تھی ۔ آخر وہاں کے شہریوں نے ایک انجمن قائم کی جس کا اصل مقصد یہ تھا کہ شہر کے نظام حکومت کی اصلاح ہو ۔ اس انجمن کے سامنے ایک شخص پروفیسر بش[2] نامی نے غریبوں کی خبر گیری کی ایک نئی تجویز پیش کی جس پر عمل بھی ہونے لگا ۔ اس نے ایک مرکزی دفتر قائم کیا اور شہر کو متعدد حلقوں میں تقسیم کرکے ہر حلقے میں ایک ناظر مقرر کیا ۔ محتاجوں کو اپنی مدد آپ کرنے کی تربیت دی جاتی تھی اور اگر انھیں کام نہ مل سکے تو کام بھی مہیا کیا جاتا تھا ۔ لوگوں کو گھروں پر خیرات بانٹنے کی ممانعت تھی ۔ بچوں کے لئے ایک صنعتی مدرسہ اور بیماروں کے لئے شفاخانے قائم کئے گئے تھے ۔ غرض ہر شخص کی ضرورت اور استحقاق کے مطابق اس کی مدد کا انتظام تھا ۔ اس سے ہیمبرگ کی حالت میں ایک انقلاب ہو گیا ۔ گداگر یا تو بھاگ گئے یا کام کرنے لگے ۔ بچوں کی مصیبت دور ہوئی اور انھیں صنعتی تعلیم ملنے لگی جس کی بدولت وہ روزی کمانے کے قابل ہو گئے ۔ مریضوں کی خبر گیری ہونے لگی ۔ سڑکوں پر گداگری موقوف ہو گئی ۔ غرض سارا نقشہ بدل گیا ۔ تیرہ برس کامیابی سے چلنے کے بعد اس نظام میں زوال شروع ہوا ۔

---

[1] Cosmopolitan.

[2] Professor Busch.

مگر آگے چل کر پھر اصلاح ہوگئی۔ یہ اصول جرمنی کے ایک چھوٹے سے شہر ایلبرفیلڈ تک پہنچا اور وہاں کسی قدر ترمیم کے بعد رائج ہوا۔ اس لئے ایلبرفیلڈ تک کا انتظام جو خیرات کا کام کرنے والوں میں اس قدر شہرت رکھتا ہے اصل میں وہی ہیمبرگ کا نظام ہے، البتہ اس میں خفیف سی اصلاح ہوگئی ہے۔

۲۸۵۔ ہیمبرگ اور ایلبرفیلڈ کے نظام کی ترویج

ہیمبرگ کے نظام کے نمونے پر یورپ کے سب بڑے شہروں میں طریقۂ خیرات میں اصلاح کی گئی۔ ویئنا اور برلن میں خیرات کے تنظیم کے نئے طریقے رائج کئے گئے جن کا مقصد غریبوں کی باضابطہ امداد کرنا اور گداگری کو روکنا تھا۔ انیسویں صدی کے وسط میں یہ کوشش از سرِ نو شروع ہوئی۔ اس زمانے میں لندن کے خیراتی ادارے بہت ناقص حالت میں تھے۔ بہت سی انجمنیں قائم تھیں مگر ان میں اشتراکِ عمل نہیں تھا۔ سنہ ۱۸۶۹ء میں لندن میں خیرات کی تنظیم ہوئی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ خیراتی انجمنیں ایک دوسرے سے، "قانونِ امدادِ مفلسین" کا انتظام کرنے والے عہدہ داروں سے اور مضافات کے خیراتی اداروں سے اتحادِ عمل رکھیں، کام آپس میں بانٹ لیا جائے، گداگری موقوف کردی جائے مستحقوں کو مدد پہنچائی جائے اور افلاس کے اسباب کی تحقیقات کرکے اور امدادِ ذاتی کا طریقہ رائج کرکے محتاجوں کی تعداد بڑھنے نہ دی جائے۔

۲۸۶۔ ریاستہائے متحدہ (امریکہ) میں خیرات کی تنظیم

سب سے پہلے سنہ ۱۸۷۷ء میں "تنظیمِ خیرات کی بفیلو سوسائٹی[1]" قائم ہوئی جو امریکہ میں اس قسم کی تحریکوں کی ہراول تھی۔ اس نے ہیمبرگ اور ایلبرفیلڈ کے نظامِ خیرات کی، جو لندن اور دوسرے شہروں میں رائج ہو چکا تھا، تقلید کی۔ اس نے جن اصولوں کا اعلان کیا وہ یہ تھے:۔ گداگری اور آوارہ گردی

[1] Buffalo Society of charity Organization.

کا انسداد اور ان کے اسباب کی تحقیق اس کا انتظام کہ خیرات بلا امتیاز تقسیم نہ ہو اور ایک ہی شخص کو دو دو جگہ سے مدد نہ ملے۔ جماعت کو چھوٹے فقیروں سے بچانا۔ ہر مستحق کی امداد کی کوشش۔ امداد کام کی بنا پر دینا، غریبوں کی گھریلو زندگی ان کی صحت اور ان کے اخلاق کی اصلاح۔ بچوں کو گداگری سے محفوظ رکھنا۔
ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے حسب ذیل تدابیر اختیار کی جاتی تھیں۔ خیراتی انجمنوں سے اشتراکِ عمل، خواستگاران امداد کے استحقاق کی چھان بین اور مفلسوں کی حالت کی عام تحقیقات، سائلوں کا ایک باضابطہ رجسٹر بنانا اور ہر شخص کو اس کی انفرادی ضرورت کی مناسبت سے مدد دینا۔ یہ انجمن اس بات پر بھی زور دیتی تھی کہ افلاس اور گداگری کا علمی نظر سے مطالعہ کیا جائے۔ اس طرح وہ غریبوں کی حالت سُدھارنے اور خیرات کو علمی اصول پر منظم کرنے کی کوشش کرتی تھی۔

۲۸۷۔ علمی اصول پر مبنی خیرات

خیرات کی تقسیم کے اٹکل پچو طریقوں سے محتاجی کم ہونے کے بجائے اور بڑھتی تھی رفتہ رفتہ یہ طوفانِ بے تمیزی کم ہوا اور علمی حیثیت سے اس کے چند بنیادی اصول قائم کئے گئے۔ ان میں سے ہم چند اصول بیان کرتے ہیں:-

(۱) محتاجوں کو امداد ذاتی (اپنی مدد آپ کرنے) کی تعلیم دیجائے۔
(۲) ہر شخص سے اس کی صلاحیت کے لحاظ سے کام لیا جائے۔
(۳) بلا امتیاز خیرات بہت خطرناک ہے، اس کی قطعاً ممانعت کر دی جائے۔
(۴) جو امداد دی جائے اس میں پانے والوں کا مستقل فائدہ مدِ نظر رکھا جائے۔
غرض خیرات کو علمی اصول پر مبنی کرنے کے معنے یہ ہیں کہ امداد کا وہ طریقہ اختیار کیا جائے جس سے اصلاح بھی ہو۔
رفتہ رفتہ ہمارے معاشروں پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی ہے کہ دوسروں کی مدد اس طرح کرنا کہ انھیں نقصان نہ پہنچے بہت مشکل کام ہے۔ بلا امتیاز خیرات اب اچھی نظر سے نہیں دیکھی جاتی۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اندھا دھند

فیاضی بعض اوقات کنجوسی سے زیادہ مضر ہوتی ہے۔ ہمارا یہ منشاء نہیں کہ خیرات یا فیاضی روک دی جائے بلکہ ہم اس بات کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں کہ انسان کا فرض صرف دیدینا نہیں بلکہ یہ دیکھنا بھی ہے کہ جو کچھ دیا ہے اس سے اچھا نتیجہ حاصل ہو۔ عملی اصول پر مبنی خیرات دینے والوں کو دیکھ بھال کے بوجھ سے سبکدوش نہیں کرنا چاہتی، بلکہ ان پر یہ مزید ذمہ داری عائد کرتی ہے کہ غریبوں کی اور زیادہ خدمت کریں اور بہترین طریقے سے کریں۔ بے سوچے سمجھے ہاتھ اٹھا کر دیدینا سہل ہے اور ذمہ داری کے احساس کے ساتھ خیرات کا صحیح مصرف دریافت کرنا مشکل ہے۔ گزشتہ ربع صدی میں امریکہ میں غریبوں کی امداد کے طریقوں کی بہت کچھ اصلاح ہو گئی ہے۔

باب سوم

افلاس کے اسباب اور اس کو دور کرنے کی تدابیر

۲۸۸- افلاس کے اصلی اور ضمنی اسباب

افلاس کے اسباب معلوم کرنا اس لیے مشکل ہے کہ اکثر یہ بہت سے مختلف موثرات کا نتیجہ ہوتا ہے جو مدتوں سے کام کر رہے ہیں۔ اور اس پر کیا موقوف ہے کل معاشرتی مظاہر کا یہی حال ہے۔ ممکن ہے کہ افلاس کے بعض فوری اسباب ہوں جو آسانی سے معلوم کر لئے جائیں لیکن ان کے علاوہ اور بہت گہرے اسباب ہوتے ہیں جن کا سلسلہ صدیوں پہلے کے واقعات اور بنیادی معاشرتی قوتوں تک پہنچتا ہے۔ تاہم اعداد و شمار جمع کرنے اور بہت سی مثالوں پر غور کرنے سے اصلی اسباب معلوم کیے جا سکتے ہیں۔

۲۸۹- افراد قوم کی نفسی خصوصیات

سب سے پہلی چیز افراد کی ارثی خصوصیات ہیں۔ اس کا تعین ابھی پوری طرح نہیں ہو سکا ہے کہ موروثی اثرات کو افلاس کے پیدا کرنے میں کہاں تک دخل ہے مگر یہ ظاہر ہے کہ اس کی تہ میں سابقہ نسلوں کی کوئی نہ کوئی کمزوری ضرور ہوتی ہے۔ ماحول کے اثرات اس معاملے میں وراثت سے زیادہ قوی ہوتے

ہیں۔ ہم بے تامل یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر کسی قوم کے افلاس کے چار سبب ہیں تو ان میں سے تین ماحول سے پیدا ہوئے ہیں؛ اور ایک وراثت سے۔ یعنی افلاس کے ماحول پر مبنی اور وراثت پر مبنی اسباب میں تین اور ایک کی نسبت ہوتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ افلاس کے اسباب معلوم کرنے میں نظام عصبی کا ماؤف ہونا، یا جسمانی امراض، یا افراد کی بعض اور ارثی خصوصیات نظر انداز نہیں کی جا سکتیں تاہم غالب اثر ماحول ہی کا ہوتا ہے۔

۲۹۰۔ قوت حیات کی کمی اور سستی

بہت سے لوگوں میں بعض عضویاتی خصوصیات کی وجہ سے قوتِ حیات کم ہوتی ہے اور وہ خلقی طور پر سست ہوتے ہیں۔ ان کے لئے ان رکاوٹوں پر آنا دشوار ہے۔ جو ہر شخص کو تنازع للبقا اور حصولِ دولت کی کشمکش میں پیش آتی ہیں۔ ان کا جمود جو افلاس کی جڑ ہے اس وقت تک دور نہیں ہو سکتا جب تک ان کی جسمانی اور نفسی خصوصیات بالکل بدل نہ جائیں۔ اس طرح کی انفرادی خصوصیات کا قدرتی نتیجہ افلاس ہے۔

۲۹۱۔ بیماری

وارنر[1] نے اپنی کتاب ”امریکہ کی خیرات“ میں اعداد و شمار سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ افلاس کا سب سے بڑا سبب بیماری ہے اس کی وجہ سے جتنے خوشحال لوگ رفتہ رفتہ انتہائی عسرت میں مبتلا ہو جاتے ہیں کسی اور چیز سے نہیں ہوتے۔ بفیلو، بوسٹن، نیو یارک اور دوسرے بڑے شہروں میں جو تحقیقات کی گئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیماری افلاس کا اصلی سبب ہے۔ لیکن تجارت کی کساد بازاری کے زمانے میں افلاس کام نہ ملنے کی وجہ سے بھی پیدا ہوتا ہے۔ لیکن یہ افلاس عارضی ہوتا ہے مستقل اور دیرپا نہیں ہوتا۔

---

[1] Warner, American Charities

بیماری، جس سے آدمی کام کے قابل نہیں رہتا، اُسنے دواؤں کی قیمت اور ڈاکٹروں اور نرسوں کی فیس کے لیے حد مصارف برداشت کرنا پڑتے ہیں، سارے خاندان کو مقروض اور نادار کردیتی ہے۔ بعض اوقات اس قرض اور عسرت سے نجات پانا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اکثر بیماری خاندان کے کمانے والے افراد کو مہینوں یا برسوں کے لئے بیکار کردیتی ہے یا ان کی موت کا باعث ہوتی ہے اور ان کے متعلقین نانِ شبینہ کو محتاج ہو جاتے ہیں۔ ایسی مصیبتوں کا لازمی نتیجہ افلاس ہے۔

۲۹۳۔ سوجھ بوجھ کی کمی

بہت سے لوگ باوجود نیک نیت اور محنتی ہونے کے سوجھ بوجھ کی کمی سے اپنی کمائی کا صحیح مصرف نہیں جانتے ہیں۔ وہ خود اپنے گھر کو نہیں سنبھال سکتے اس لئے ان کا زندگی کی مشکلات سے عہدہ برآ ہونا مشکل ہے۔ وہ خورو نوش کا سامان یا کپڑے یا اوزار خریدنے میں سلیقے اور کفایت سے کام نہیں لے سکتے۔ برخلاف اس کے جو لوگ سلیقہ مند، منتظم اور کفایت شعار ہوتے ہیں وہ قلیل آمدنی سے کام چلاتے ہیں اور آہستہ آہستہ اپنا سرمایہ بڑھا لیتے ہیں۔ افلاس کے متعلق یہ پرانا قول بہت صحیح ہے کہ "مفلسوں کی تدبیر بھی ناقص ہوتی ہے۔" بہت سے لوگ برسوں افلاس کی مصیبت جھیلنے کے بعد دوبارہ آسودگی حاصل کر لیتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں کچھ ایسے بھی ہیں جنھیں بار بار ترقی کے موقعے ملتے ہیں لیکن وہ ان سے فائدہ اٹھانا نہیں جانتے اور دائمی افلاس میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ چاہیے تقدیر ان کے لئے کتنی اچھی صورتیں نکالے ان کی سوء تدبیر سے ترقی کی ساری کوششیں ناکامیاب رہتی ہیں۔ جن اشخاص کو غریبوں کی امداد کا تجربہ ہے وہ جانتے ہیں کہ جب تک اس قسم کے لوگوں کی سوجھ بوجھ کی کمی کسی طرح نہ پوری کی جائے ان کی مدد کرنا ناممکن ہے۔ روپیہ کو یہ لوگ برباد کر دیتے ہیں، موقعے کو ہاتھ سے کھو دیتے ہیں اور ایسی ایسی غلطیاں کرتے ہیں کہ افلاس سے چھٹکارہ پانے کی ساری کوششوں پر پانی پھر جاتا ہے۔

۲۹۴۔ مُضر عادتیں اور خواہشیں۔

جن لوگوں کو مضر چیزوں کی لت ہے ان کی کفایت شعاری اور ترقی کا بڑا دشمن بغل میں موجود ہے۔ اگرچہ نشوں کے استعمال کو افلاس کا حقیقی سبب قرار دینے میں مبالغہ کیا گیا ہے لیکن انہیں شک نہیں کہ یہ بھی ایک بڑا سبب ہے کہ لوگوں میں اپنے برتے پر کام کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی۔ بہت سے خاندان اس وجہ سے پھٹے حالوں رہتے ہیں کہ کمانے والا فرد اپنی کمائی شراب خانہ میں اڑا دیتا ہے۔ اس عادت کی بدولت اس کی محنت کی قوت اور دوسروں سے مقابلہ کرنے کی صلاحیت کم ہوتی جاتی ہے۔ شراب سے ذہنی، اخلاقی اور جسمانی قوتیں برباد ہو جاتی ہیں اور دولت اس طرح صرف ہوتی ہے کہ اس کا کوئی معاوضہ نہیں ملتا۔ ہر قسم کی نشہ لانے والی، اعصاب کو بے حس کرنے والی ہیجان میں لانے والی اشیا کا استعمال فضول خرچی ہے اور افلاس کے قوی اسباب میں داخل ہے۔ بری تیں عام طور پر سیکھنے سے پیدا ہوتی ہیں۔ وراثت کا اثر اس حد تک ہے کہ جسمانی اور نفسی ساخت کے کمزور ہونے سے جسم اور نفس برے اثرات آسانی سے قبول کر لیتا ہے۔

الکوہل ایک خاص طریقہ سے قوت ارادی کو کم کر دیتی ہے اور اخلاقی جرأت کو برباد کر دیتی ہے جو کامیابی کے لئے نہایت ضروری صفت ہے۔ اعصاب کو بے حس کرنے والی چیزیں زیادہ مقدار میں استعمال کی جائیں تو نشے کے حکم میں داخل ہیں۔ تمباکو اگرچہ جسم کو زیادہ نقصان نہیں پہنچاتی لیکن اگر کثرت سے استعمال کی جائے تو نظام اعصاب پر برا اثر ڈالتی ہے اور کام کی قوت گھٹا دیتی ہے۔ اس میں شراب اور دوسرے نشوں سے زیادہ خرچ ہوتا ہے اور جو شخص اس کا عادی ہو جائے اس کا سارا فاضل روپیہ اسی کی نذر ہو جاتا ہے۔ مارفین، افیون، کوکین، وغیرہ جو غم غلط کرنے کے لئے یا درد کی تکلیف سے نجات پانے کے لئے استعمال کی جاتی ہیں اکثر انسان کو افلاس میں مبتلا کرتی ہیں بلکہ ٹھکانے لگا دیتی ہیں۔

۲۹۴۔ غیر دلکش شخصیت

بہت سے لوگوں کو اس نامعلوم چیز کی وجہ سے جسے "شخصیت" کہتے ہیں بڑی دقتیں اٹھانا پڑتی ہیں۔ یہ نہ تو صرف جسمانی ساخت یا ذہنی صفات کا نام ہے اور نہ محض وضع و لباس یا عادات کا بلکہ ان سب کا مجموعہ ہے اسی کی وجہ سے ایک شخص دوسرے شخص کو پسند یا ناپسند کرتا ہے۔ بعض اوقات دو شخص ایک عہدے کے خواستگار ہوتے ہیں اور ان میں سے ایک صرف اس سبب سے کامیاب ہوتا ہے کہ وہ دلکش شخصیت رکھتا ہے اور دوسرا اسی چیز کے نہ ہونے سے ناکامیاب رہتا ہے۔ البتہ تقرر ہو جانے کے بعد اصلی سیرت کام آتی ہے اور ہنس مکھ محنتی اور مستقل مزاج آدمی کامیاب ہوتا ہے اور جھگڑالو' بدمزاج اور ہٹیلا ناکامیاب رہتا ہے۔ ایک حد تک یہ دلکش شخصیت اکتساب سے پیدا ہوسکتی ہے لیکن زیادہ تر ارثی خصوصیات اور بچپن کی تربیت پر موقوف ہوتی ہے جب مزدوروں میں تخفیف کرنے کی ضرورت پڑتی ہے تو اکثر اس کا فیصلہ قابلیت کے لحاظ سے کیا جاتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ سب سے پہلے شورش پسند اور بدمزاج لوگ علیحدہ کئے جاتے ہیں۔ جھگڑالو اور کھرے لوگ ہمیشہ لڑا کرتے ہیں اور ان کی وجہ سے کام میں خلل پڑتا ہے آج کل کامیاب ہونے والے لوگ وہی ہیں جو قوی دل، معاشرت پسند اور مل جل کر کام کرنے والے ہیں جن لوگوں میں یہ صفات نہ ہوں انکا کامیاب ہونا بہت مشکل ہے۔

۲۹۵ منٹھاپن[1] اور کاہلی

منٹھاپن بھی ایک قسم کی عادت سی ہے جو بعض انفرادی خصوصیات سے پیدا ہو جاتی ہے۔ منٹھا آدمی اپنا کام بے سلیقگی اور بے دلی سے کرتا ہے وہ کام میں دیر لگاتا ہے۔ ٹالتا رہتا ہے اور محنت سے بچتا ہے۔ وہ کاہلی اور احدی پن میں وقت ضائع کرتا ہے۔ وہ کمرے کی کھڑکیاں کھلی چھوڑ دیتا ہے جس کے سبب سے اسے گرم کرنے میں بہت ایندھن صرف ہو جاتا ہے۔ وہ باغ کی ترکاریوں کی دیکھ بھال میں

[1] Shiftlessness.

سستی کرتا ہے یہاں تک کہ انھیں پالا مار جاتا ہے۔ غرض وقت کی کفایت نہ کرسکنے سے ہر چیز میں اصراف اور گھاٹا ہوتا ہے۔ یہ لوگ جب تک ایسی عادتوں کے بندے ہیں ان کا افلاس میں مبتلا رہنا لازمی ہے۔ وہ عادتیں جن سے قوت حیات یا اعصابی قوت برباد ہو جاتی ہے سستی پیدا کرتی ہیں۔

۲۹۶۔ جلق اور کثرت جماع

بری عادتوں سے، جو جسم کے ست کو چوس لیتی ہیں اور منطقی ترتیب سے سوچنے کی قوت ضائع کر دیتی ہیں، انسان کی کارکردگی کم ہو جاتی ہے اور افلاس پیدا ہوتا ہے۔ جو لوگ غریبوں کی امداد میں مصروف رہتے ہیں وہ اکثر دیکھتے ہیں کہ افلاس مدتوں کی بری عادتوں کا نتیجہ ہے۔ ان عادتوں کا سب سے خراب اثر عام قوائے جسمانی پر اور مزاج پر پڑتا ہے۔ یہ قدرتی طور پر مرض کی سی صورت اختیار کر لیتی ہیں جو سارے نظام جسمانی کو کمزور کر دیتا ہے۔ اس قسم کے لوگوں میں عزم واستقلال، پیش قدمی اور دم اکس کی کمی ہوتی ہے اور حصول دولت کی کشمکش میں دوسرے ان سے آگے بڑھ جاتے ہیں اور یہ رہ جاتے ہیں۔

۲۹۷۔ مضر اور بدمزہ کھانا

بہت سے لوگ اس غذا کے استعمال سے غریب ہو جاتے ہیں جس میں پرورش کی قوت کم ہوتی ہے۔ بہت سے ایسے ہیں جن کی ناکامی کا سبب ضعف معدہ وغیرہ بیماریاں ہیں جو غذا کی خرابی سے پیدا ہو گئیں۔ یہ ثابت کر دیا گیا ہے کہ پندرہ سینٹ (تقریباً ساڑھے سات آنے) روز میں مفید غذا اتنی کافی مقدار میں مہیا ہو سکتی ہے کہ ایک مزدور کی صحت کو قائم رکھے۔ لیکن بعض اوقات اچھا گوشت بری طرح پکانے سے بدمزہ ہو جاتا ہے اور اس کی پرورش کی قوت زائل ہو جاتی ہے اور عموماً وہ مزدور جنھیں ادنیٰ قسم کا اور برا پکا ہوا کھانا ملتا ہے اس کے برے اثرات سے بچنے کے لئے قوت کی دوائیں استعمال کرتے ہیں۔ ادنیٰ غذا سے کافی پرورش نہیں ہوتی اور کمزوری اور بیماری پیدا ہوتی ہے۔

۲۹۸۔ خاندانی رشتوں کی پروانہ کرنا

خاندانی رشتوں کی پروانہ کرنا بھی افلاس کا ایک سبب ہے۔ بہت سے لوگ خاندان کے درہم برہم ہوجانے سے غریب ہو گئے ہیں۔ اکثر شوہر بیوی بچوں کو چھوڑ دیتا ہے اور کبھی کبھی بیوی کبھی شوہر اور بچوں کو چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ بعض اوقات طلاق کے سبب سے بچے بے گھر ہو جاتے ہیں اور کس مپرسی میں پڑ جاتے ہیں۔ اسکے علاوہ کبھی یہ صورت بھی ہوتی ہے کہ میاں بیوی کے مزاج میں موافقت نہ ہونے سے وہ جوتی بیزار ہوتی ہے کہ گھر امن و آسودگی کا ٹھکانا نہیں رہتا بلکہ دوزخ سے بدتر ہو جاتا ہے۔ ایسی حالتوں میں انفرادی اور اجتماعی قوتیں منتشر ہو جاتی ہیں اور کل افراد کی کارکردگی کم ہو جاتی ہے۔

۲۹۹۔ طبیعی ماحول کے اثرات

افلاس کے بہت سے اسباب ناموافق طبیعی یا قدرتی ماحول سے وابستہ ہیں۔ ان میں سے قدرتی وسائل کا ناکافی ہونا مثلاً زمین کی خرابی، پالی یا اور اسباب زندگی کی کمی بہت اہم عنصر ہے۔ ایسی صورت میں لوگوں کو عالم فطرت سے شدید جنگ کرنا پڑتی ہے اور وہ اس میں ناکامیاب ہوتے ہیں۔ پھر آب وہوا کی خرابی ہے جو لوگوں کی صحت، طاقت اور خوش حالی پر اثر ڈالتی ہے۔ بعض اوقات یہ مضر اثرات اس قدر قوی ہوتے ہیں کہ ان کا مقابلہ کرنا ناممکن ہے۔ ان کے بعد طفیلی کیڑے اور طفیلی پودے ہیں جو اکثر اسباب پیدائش دولت کو برباد کر کے لوگوں کو افلاس میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ ان کے علاوہ بعض اوقات طبیعی حوادث مثلاً سیلاب، زلزلہ، طوفان، خشک سالی سے لوگوں کو ایسی زک پہنچتی ہے کہ ان کا پنپنا مشکل ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات پانی کی بدررو کا ناقص انتظام بھی، جس کے سبب سے رطوبت اور کیچڑ باقی رہ جاتی ہے، امراض پھیلتے ہیں، بیماری اور ہلاکت کے ذریعے پوری قوم کو مفلس کر دیتا ہے۔ ان میں سے بہت سے اسباب ایسے ہیں جن کی ذمہ داری کم وبیش افراد کی قوت انتخاب پر عائد ہوتی ہے کہ انھوں نے

رہنے کے لئے ایسی جگہ پسند کی جہاں فطرت ان کی کفالت نہیں کرتی یا ان کے نقص برباد کرنے کے درپے ہے۔

۳۰۰۔ معاشرتی ماحول کے اثرات

برے مکانات اور بری حالت میں رہنا بھی افلاس کا ایک سبب ہے غریبوں کا کرائے کے مکانات میں جہاں ہوا اور روشنی ناکافی ہوتی ہے، بھیچ کر رہنا افلاس پیدا کرتا ہے اور اسے بڑھاتا ہے۔ برے مکانوں میں رہنے سے جو خراب اثر پڑتا ہے وہ خیرات کے معمولی طریقۂ امداد سے دور نہیں ہو سکتا۔ جن لوگوں نے ان معاملات کی تحقیق کی ہے ان کا تجربہ ہے کہ جب تک مکانات کی حالت نہ بدلی جائے مکینوں کی مستقل اصلاح کی امید محض ایک خیال خام ہے۔ برے گردوپیش سے عموماً کاہلی، میٹھاپن اور بری عادتیں پیدا ہوتی ہیں اور افلاس کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ پھر ان محلوں میں، جہاں آبادی بہت گنجان ہوتی ہے، حفظانِ صحت کا معقول انتظام نہ ہونے سے خراب اثرات اور بڑھ جاتے ہیں۔ ان دنوں بڑی سرگرمی سے یہ کوشش ہو رہی ہے کہ غریبوں کے لئے اچھے مکانات بنائے جائیں جن میں ہوا، روشنی اور حفظانِ صحت کا معقول انتظام ہو۔

۳۰۱۔ ناقص حکومت

ایسے قوانین بنانا جن سے کسی ایک فرد یا طبقے کو فائدہ اور دوسروں کو نقصان پہنچے بالواسطہ افلاس کا سبب ہوتا ہے۔ نظام عدالت میں بہت سی ایسی خرابیاں نظر آتی ہیں جن کی بدولت بہت سے لوگ انصاف سے محروم رہتے ہیں اور صنعتی اور معاشرتی دنیا میں اپنی حیثیت کھو بیٹھتے ہیں۔ اس کے علاوہ بعض اوقات نامناسب اور غیر منصفانہ سزائیں دی جاتی ہیں جو بجائے خود فرد کی ترقی میں مزاحم ہوتی ہیں۔ اگر عمدہ قوانین بنائے جائیں تو ان حالات کی جن سے افلاس پیدا ہوتا ہے اصلاح کی جا سکتی ہے اور محنت اور کفایت شعاری کو ترقی دی جا سکتی ہے۔ ان کے ذریعہ سے قوم کی معاشی نشوونما پر اور افراد اور جماعتوں کی حصول دولت کی جدوجہد پر اچھا اثر

ڈالا جاسکتا ہے۔

۳۰۲۔ غلط یا ناکافی تعلیم

تعلیم وہی مفید ہوسکتی ہے جو متعلموں کی موجودہ اور آیندہ زندگی کو مدنظر رکھ کر دی جائے۔ اگر کوئی بچہ ایسے خاندان کا ہے کہ غالباً اسے صنعتی زندگی بسر کرنا پڑے گی تو اس کے دماغ میں علم ٹھونس دینا جو عملی طور پر مفید نہ ہو محض بیکار ہے۔ تعلیم کا منجملہ اور مقاصد کے ایک اہم مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ وہ انسان کو کسب معاش کے قابل بنا دے یعنی ایسی تعلیم دی جائے کہ انسان روٹی کما سکے۔ ہم یہ نہیں چاہتے کہ تعلیم محض تجارت و صنعت کی عملی تربیت تک محدود کردی جائے۔ بلکہ ہماری غرض یہ ہے کہ ہر طبقے کی تعلیم میں صنعتی عنصر موجود ہو اس لیئے کہ معاشی زندگی ہر چیز کی بنیاد ہے۔ دوسرا نقص جو اکثر پایا جاتا ہے تعلیم کا ناکافی ہونا ہے۔ بچے اس عمر میں مدرسے سے اٹھا کر کاروبار میں لگا دیئے جاتے ہیں یا بیکار چھوڑ دئے جاتے ہیں جو زندگی کے لیئے اچھی طرح تیار ہونے کا زمانہ ہے۔ ان میں بہت سے ایسے ہیں کہ اگر انھیں بہتر عام اور صنعتی تعلیم دی جاتی تو وہ بہت کچھ کر سکتے اور فارغ البالی کی زندگی بسر کرتے۔

۳۰۳۔ خراب صنعتی اور معاشی حالات

قوموں کے صنعتی حالات عموماً اس قدر ناقص ہوتے ہیں کہ معدودے چند افراد دولتمند ہو جاتے ہیں اور بہت سے مفلس رہ جاتے ہیں۔ جب وسائل دولت کا نظم و ضبط چند اشخاص کے ہاتھ میں ہو تو سمجھ لینا چاہیئے کہ بہت سے لوگ اس موقعہ سے محروم رہ جائیں گے کہ اپنی گذراوقات کے لائق کما سکیں۔ قدرتی یا اتفاقی معاشرتی اسباب سے معاشی زندگی میں بہت سے ایسے اسباب پیدا ہوتے ہیں جو افلاس کو بڑھاتے ہیں۔ مثلاً روپے کی قیمت کا گھٹنا بڑھنا، تجارت کی کساد بازاری، اور ناگہانی مشکلات، صنعتی تبدیلیاں جو نئی مشینوں اور نئے انکشافات کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں، محصول کی زیادتی یا بد انتظامی، ایک طبقے کا دوسرے طبقے پر

بیجا اقتدار اور مزدوروں کی نقل و حرکت بند ہو جانا مختلف اوقات میں اور مختلف حد تک۔ ان سب چیزوں سے معاشرے کی حالت میں تنزل پیدا ہوتا ہے۔ مزدوروں کی بے روزگاری افلاس کا ایک قوی سبب ہے اور اس کو دور کرنا سب سے زیادہ مشکل ہے۔ ہنٹر[1] اور ڈیوین[2] دونوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ افلاس معاشرتی حالات کی خرابی سے پیدا ہوتا ہے۔

۳۰۴۔ بیجا خیرات۔

بیجا خیرات بھی افلاس کا اور گداگری کا ایک بہت بڑا سبب ثابت ہوئی ہے کیونکہ یہ غریبوں کو دوسروں کے سہارے زندگی بسر کرنے پر مجبور کرتی ہے جیسا ہم پچھلے باب میں کہہ چکے ہیں دانشمندانہ خیرات لوگوں کو اپنی مدد آپ کرنا سکھاتی ہے اور مادی اور روحانی امداد سے ان میں معاشی آزادی اور کفایت شعاری کو نشو و نما دیتی ہے جسے خیرات کہتے ہیں وہ عموماً محض بھیک دینے تک محدود ہوتی ہے اور اس کا محرک بیجا رقت قلب کا جذبہ ہے جو انسانی زندگی کو بے حرمت کر دیتا ہے۔ علمی اصول پر مبنی خیرات مصیبت زدوں کی سچی دست گیری کرتی ہے اور انھیں اپنی مدد آپ کرنے کی تعلیم دیتی ہے۔

۳۰۵۔ افلاس کا انسداد اور علاج

افلاس کو دور کرنے کی بہت سی تدابیر بتائی جا سکتی ہیں۔ چونکہ اس کے اسباب متعدد اور مختلف ہیں اس لئے اس کے انسداد کے لئے بہت سے مختلف ذرائع اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ ان میں سے چند کی طرف ہم اشارہ کرتے ہیں۔

(۱) معاشرتی ارتقا اور حکومت کے اثرات کے ذریعے سے صنعتی حالات کی اصلاح مثلاً مزدوروں کو معقول اجرت پر مستقل روزگار ملنے کا انتظام، مالی حالات

---

[1] Hunter.

[2] Devine.

کا استقلال، محصول بندی، حکومت اور وضع قوانین کا انصاف پر مبنی ہونا۔

(۲) طرزِ معاشرت کی اصلاح مثلاً اچھے مکانات اور اچھا خانگی ماحول مہیا ہونا، حفظانِ صحت کا بہتر بندوبست، افراد کا اپنی صحت کا خیال رکھنا، اور مفید سیر و تفریح کا انتظام۔

(۳) تعلیم کے ذریعے انفرادی خصوصیات کی اصلاح یعنی ان میں کفایت شعاری، مستعدی، عاقبت اندیشی، اصابت رائے اور محنت کی قوت کا نشو و نما پانا۔ اسی طرح عادتوں کے بدلنے سے، شراب، تمباکو وغیرہ کا استعمال ترک ہونے سے گھر کی زندگی میں خود غرضی کی جگہ محبت کا راج ہوتے سے، عصمت اور عفت کی زندگی سے انسان کی سیرت کی تہذیب ہوتی ہے۔ اور وہ دوسروں کا دست نگر ہونے کی بجائے فارغ البالی حاصل کرتا ہے۔ بیماری افلاس کے سب سے بڑے اسباب میں سے ہے اس لئے قوانین اور سائنس کی مدد سے بیماری کا دور کرنا افلاس کے انسداد کی بہت موثر تدبیر ہے۔ اگر ان سب چیزوں کے ساتھ علمی اصول پر مبنی خیرات بھی شامل ہو یعنی لوگوں کو مناسب وقت پر اور مناسب طریقے سے امداد دی جائے تو افلاس سال بہ سال کم ہوتا جائے گا۔

باب چہارم

جرم کی ماہیت اس کے اسباب اور انسداد کی تدابیر

۳۰۶۔ جرم کی ماہیت

جرم ملک کے مروجہ قانون کی خلاف ورزی کو کہتے ہیں۔ فعل کی اور قانون کی نوعیت کے اعتبار سے اس کے مختلف درجے ہوتے ہیں۔ معمولی سی حرکت جس میں قانون سے انحراف کیا جائے خلاف ورزی کہلاتی ہے اور اس قسم کے شدید فعل کو جرم کہتے ہیں۔ خلاف ورزی اور جرم میں صرف درجے کا فرق ہے اس لئے مختلف قوموں میں ان کی حد فاصل مختلف ہے۔ ابتدائی یا غیر متمدن معاشرے میں تنازع للبقا کے قانون کے ماتحت لوگ اپنے آپس کے جھگڑے خود ہی نپٹا لیا کرتے تھے، اس لئے وہ چیز جو قانونی اصطلاح میں جرم کہلاتی ہے موجود نہیں تھی۔ آگے چل کر بعض افعال جرم قرار دیئے گئے مگر مجرم معاشرے کا قصوروار نہیں بلکہ کسی خاص شخص کا قصوروار ٹھہرایا جاتا تھا۔ اب ہر جرم معاشرے کا جرم سمجھا جاتا ہے۔ عمرانیات کی اصطلاح میں وہ فعل جس سے معاشرے کو شدید نقصان پہنچے جرم کہلائے گا خواہ اس وقت تک قانون نے اسے جرم نہ قرار دیا ہو۔

۳۰۷ ۔ جرم کے اسباب

جرم کے نمایاں اسباب میں فرد کی ارثی خصوصیات کا شمار کیا جاسکتا ہے ممکن ہے کہ کسی شخص کے سر، دماغ اور اعضاء رئیسہ کی ساخت، اس کی حسیات، غرض کل جسمانی خصوصیات ایسی ہوں کہ اسے جرم پر آمادہ کریں۔ مجرم کی ترکیب نفسی میں عموماً فہم اور احساس میں عدم تناسب پایا جاتا ہے۔ اخلاقی احساس عموماً کند ہوتا ہے۔ بعض اوقات وہ اخلاقی خلل دماغ، تک نوبت پہنچتی ہے یعنی اخلاقی احساس بالکل مفقود ہوتا ہے۔ یہ لازمی نہیں کہ اس قسم کے نقائص انسان کو جرم پر مجبور کردیں مگر وہ اس کی طبیعت میں اس کا رجحان ضرور پیدا کر دیتے ہیں۔ موروثی مجرمیت کمزوری اور بدی کا مجموعہ ہے۔ جس کی بنا ناقص جسمانی، نفسی یا اخلاقی خصوصیات پر ہے۔ پیدائشی یا خلقی مجرم کی طبیعت پر عموماً ان ناقص خصوصیات کا غلبہ ہوتا ہے۔ بری عادتیں بھی انسان کو طبعی افعال سے ہٹا کر مجرمانہ افعال کی طرف لاتی ہیں۔ اعصاب کو بے حس کرنے والی چیزوں یا نشوں کا استعمال بھی قوت ارادی کو کمزور اور اخلاقی احساس کو برباد کرکے جرم کا محرک ہوتا ہے۔ گالیاں بکنا یا غصے سے بے قابو ہو جانا بھی ضبط نفس کو گھٹاتا ہے اور اگر مناسب موافق اسباب جمع ہو جائیں تو مجرمانہ فعل کا باعث ہوتا ہے۔

۳۰۸ ۔ طبیعی ماحول کا اثر

جرم کے ان اسباب کے علاوہ جو انفرادی خصوصیات پر مبنی ہیں اس کے بہت سے موثرات طبیعی ماحول سے بھی پیدا ہوتے ہیں منجملہ ان کے آب وہوا کا اثر بھی ہے۔ کیونکہ یہ دیکھا گیا ہے کہ جرائم کی تعداد میں موسم کی تبدیلیوں سے یا باری باری سے شدید گرمی اور شدید سردی پڑنے سے کمی بیشی ہوتی ہے۔ ذات سے متعلق جرائم دن اور رات کے طول کی نسبت کا بھی ایک حد تک جرم کی نوعیت پر اثر پڑتا ہے۔ ابروباد، طوفان یا فوری موسمی تغیرات جن کا اثر انسانوں کی اعصابی اور نفسی کیفیت پر پڑتا ہے، جرم کے محرک ہوتے ہیں۔ بجلی کا جو اثر جرم پر پڑتا ہے اس کی ابھی تک

علمی تحقیقات نہیں کی گئی لیکن اس بات کی علامتیں پائی جاتی ہیں کہ ان دونوں میں کچھ نہ کچھ تعلق ضرور ہے۔ بعض اوقات جرم کے اسباب بہت بعید القیاس ہوتے ہیں اور ان کی تحقیق میں بڑی مشکلیں پڑتی ہیں۔ بہت سی صورتوں میں جو چیز بظاہر جرم کا سبب معلوم ہوتی ہے۔ وہ صرف اس کا بہانہ ہوا کرتی ہے اور اصلی سبب بہت گہرا اور اس کا معلوم کرنا بہت دشوار ہوتا ہے۔ وراثت کے اثرات طبیعی اور معاشرتی دباؤ سے زیادہ قوی نہیں ہوتے۔

معاشرتی حالات کو جرائم کی کثرت میں بہت کچھ دخل ہے۔ اگر ایک شخص کی طبیعت کسی قدر کمزور ہو اور اسے اچھا ماحول میسر آئے تو وہ ممکن ہے کہ وہ کبھی مجرمانہ افعال کا مرتکب نہ ہو۔ بہ خلاف اس کے قوی اور طبیعی سیرت رکھنے والے لوگوں میں اکثر مزاحمت کی قوت اتنی ہوتی ہے کہ وہ معاشرتی اور طبیعی ماحول سے متاثر نہیں ہوتے۔ بڑے شہروں میں آبادی کے گنجان ہونے سے خراب معاشرتی حالات موجود ہوتے ہیں اور جرائم کی راہ میں آسانیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ الگ الگ بستیوں کے ہونے سے جرائم کم ہو جاتے ہیں۔ طبعی معاشرے کی آبادی نہ اتنی چھدری ہونا چاہیے کہ معاشرتی آسانیاں اور نظم و ضبط کے ساماں مہیا نہ ہو سکیں اور نہ اتنی گنجان کہ کثرت اجتماع سے خرابیاں پیدا ہوں۔ معاشرے کی عام اخلاقی حالت کو جرائم کی تعداد سے بہت گہرا تعلق ہے۔ جہاں اخلاقی معیار بلند اور رائے عامہ سختی سے جرم کی مخالف ہو وہاں جرائم کم ہوتے ہیں۔ بعض اوقات قانون کی بدولت بظاہر جرائم کی تعداد بڑھ جاتی ہے حالانکہ مجرمانہ افعال میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ یعنی اگر قانون کسی ایسے فعل کو جو پہلے جرم نہیں سمجھا جاتا تھا جرم قرار دیدے تو اعداد و شمار کی رو سے جرائم کی تعداد زیادہ ہو جائے گی۔ اسی طرح جہاں پولس مجرموں کی گرفتاری میں مستعدی سے کام لیتی ہے اور عدالتیں سزا دینے میں بے لاگ ہوتی ہیں وہاں پہلے جرائم کا شمار بڑھ جاتا ہے لیکن آخر میں ان کی تعداد بہت کم ہو جاتی ہے۔

معاشرے کے مذہب، رسم و رواج، صنعتی مشاغل کی نوعیت اور معاشی حالات کا بھی جرائم کی کمی بیشی پر اثر پڑتا ہے۔ مجلس وضع قوانین کی خرابی اور عدالتی اور تعزیری نظام کے نقائص سے جرائم کی تعداد بڑھ جاتی ہے۔

۳۰۹ - جرائم کی قسمیں

اسٹیفن نے اپنی "انگلستان کے قانونِ فوجداری کی تاریخ"[۱] میں جرائم کی حسب ذیل قسمیں قرار دی ہیں:-

(۱) وہ افعال جو امنِ عامہ میں خلل انداز ہوں۔

(۲) وہ افعال جن کے ذریعے سے سرکاری ملازم اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کریں یا عام لوگ۔ کارِ سرکار میں مزاحم ہوں۔

(۳) وہ افعال جن سے مفادِ عامہ کو نقصان پہنچے۔

(۴) وہ افعال جن کے ذریعے سے افراد کی ذات کو نقصان پہنچے یا ذاتی حقوق میں دست اندازی ہو۔

(۵) وہ افعال جن کے ذریعے سے افراد کو مالی نقصان پہنچے یا ان کے حقوقِ ملکیت میں دست اندازی ہو۔

غالباً عملی نقطۂ نظر سے حسب ذیل تقسیم زیادہ مناسب ہوگی:-

سیاسی جرائم مثلاً بغاوت اور تلبیس، سیاسی عمومی جرائم مثلاً بمجمع عام کا لوگوں کو قتل کر دینا، یا بلوہ یا آتش زنی، جرائم متعلق ذاتِ افراد مثلاً، ضرب خفیف و شدید، زنا بالجبر، قتلِ عمد، قتلِ انسان، اور جرائم متعلق ملکیتِ افراد مثلاً چوری، ڈاکہ زنی، خیانت، جعل سازی۔

۳۱۰ - مجرموں کی قسمیں۔

علمِ جرائم کے ماہروں نے مدتوں تک بڑی سرگرمی سے یہ معلوم کرنے کی کوششیں کی ہیں کہ کس قسم کے انسان مجرم ہوا کرتے ہیں۔ انھیں کوئی عام مثال (ٹائپ) دریافت کرتے ہیں تو اب تک کامیابی نہیں ہوئی مگر ان کی تحقیق سے اتنا ضرور ثابت ہوگیا ہے کہ مجرموں میں چند خصوصیات یا نقائص اکٹھا ہوتے ہیں جن سے جرم کی صلاحیت

[۱] Stephen: History of Criminal Law in England.

پیدا ہوتی ہے۔ اس مسئلہ پر غور کرتے وقت ہمیں عادی جبلّی یا خلقی مجرموں میں اور ان لوگوں میں فرق کرنا چاہیئے جو اتفاقی وجوہ سے جرم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ریاستہائے متحدہ (امریکہ) میں قریب قریب سب مجرم دوسری قسم کے ہوتے ہیں اور یورپ وغیرہ میں زیادہ تر پہلی قسم کے ہوتے ہیں۔ جبلّی مجرم عمداً جرم کرتے ہیں اور ان میں سے بعض تو اسے اپنا پیشہ بنا لیتے ہیں مگر اتفاقی مجرم سے بغیر قصد کے مجرمانہ افعال سرزد ہو جاتے ہیں بعض اوقات ذاتی کمزوری یا معاشرے کے دباؤ یا خاص واقعات کی وجہ سے انسان دفعتہً ایسی حرکت کر بیٹھتا ہے جو قانون کے خلاف ہوتی ہے اس طبقے کے لوگ عموماً اصلاح پذیر ہوتے ہیں درآنحالیکہ خلقی یا جبلّی مجرم شاذ و نادر اپنے کام سے دست بردار ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر ڈگڈیل[1] نے اپنے مشاہدات کی بنا پر مجرموں کی حسب ذیل قسمیں قرار دی ہیں:-

(۱) وہ لوگ جو طبعاً مجرم نہیں بلکہ واقعات سے مجبور ہو کر یا اتفاق سے قانون شکنی کرتے ہیں۔

(۲) پہلی بار ارتکاب جرم کرنے والے جن کی گمراہی کا سبب عیش پسندی یا خود بینی یا بری عادتوں کا اثر ہوتا ہے۔

(۳) پہلی بار ارتکاب جرم کرنے والے جن کے بگڑنے کا سبب بری صحبت ہو۔

(۴) وہ لوگ جو جسمانی حیثیت سے کمزور ہیں، جنھوں نے برے ماحول میں پرورش پائی اور نگرانی اور تربیت نہ ہونے کے سبب سے جرم کی طرف مائل ہوئے۔

(۵) شراب خوار، بدچلن اور جرائم پیشہ لوگوں کی ناجائز اولاد جنھیں بچپن سے مجرمانہ افعال سکھائے گئے۔

(۶) مجرموں کی اعانت کرنے والے جو اس کا باقاعدہ کاروبار کرتے ہیں۔

(۷) وہ مجرم جو خود مجرمانہ افعال ترک کر کے اپنے سرمایہ سے یہ کاروبار کرنا چاہتے ہیں۔

(۸) وہ لوگ جو مجرموں کی خواہشاتِ نفسانی میں مدد دے کر فائدہ اٹھاتے ہیں اور اس طرح ان کے معین جرم ہیں۔

[1] Dr. Dugdale.

(۹) وہ لوگ جو مرگی، جنون اور نفسی انحراف کی وجہ سے مجرم بن جاتے ہیں۔
(۱۰) وہ لوگ جنھیں اعصابی امراض کی بدولت اپنے نفس پر قابو نہیں رہتا اور مجرمانہ فعل کر بیٹھتے ہیں۔

علم جرائم کے ماہروں نے اس مسئلے پر اور زیادہ غور و خوض کیا ہے اور مجرموں کے جسمانی، نفسی اور اخلاقی نقائص اور ذاتی خصوصیات مثلاً شیخی بازی، خود بینی اور خود نمائی، ظلم، انتقام پسندی، ناعاقبت اندیشی اور ضعیف الاعتقادی وغیرہ کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ لیکن یہاں اس کی تفصیل کی گنجایش نہیں۔

۳۱۱۔ جرائم کی سزا

اگلے زمانے میں جرم کی سزاؤں میں ہمیشہ انتقام کا جذبہ موجود ہوتا تھا اور مجرم قید خانے میں اس خیال سے ڈالے جاتے تھے کہ اپنی حرکتوں کا مزا چکھیں یا اس لئے کہ معاشرے کی نظر سے دور رہیں۔ جدید روشن خیال معاشرے میں سزا کے حسب ذیل مقاصد متعین کیئے گئے ہیں:- (۱) معاشرے کا تحفظ، (۲) جرائم کا انسداد (۳) جرم کی پاداش (۴) مجرموں کی اصلاح۔ غرض سزا کا منشا معاشرے کی حالت درست کرنا ہے۔

سزا دینے کے مختلف طریقے جاری کیئے گئے ہیں مثلاً پھانسی یا قصاص، جسمانی سزا، قید، جائداد کی ضبطی، اخراج یا جلاوطنی، اور سیاسی اور مدنی حقوق سے محروم کرنا۔ مجرموں کی تعذیر میں پاداش جرم بھی مد نظر رہنا چاہیئے لیکن تعزیرات کا سب سے اہم مقصد اصلاح افراد اور انسداد جرائم کو سمجھنا چاہیئے۔ جدید معاشرے کی رحمدلی اور اجتماعی ترقی کے نصب العین کا تقاضا ہے کہ مجرموں کے ساتھ جو برتاؤ کیا جائے اس میں اصلاح کو خاص طور پر اہمیت دی جائے۔

۳۱۲۔ اصلاح۔

مجرموں کی اصلاح کے لئے جیل خانوں کے انتظام کے مختلف طریقے اختیار کیئے جاتے ہیں۔ سب سے پہلے سب مجرموں کو اچھی طرح دیکھ بھال کے ان کے مختلف درجے

قرار دینا چاہیئے۔ جن لوگوں کا جرم خفیف ہو وہ صنعتی مدرسے میں داخل کئے جائیں نوعمر مجرم تربیت خانوں میں اور پرانے مجرم جیل میں رکھے جائیں۔ ہر قسم کی دستکاریاں سکھائی جائیں تاکہ قیدیوں کو مفید کاموں میں وقت صرف کرنے کی عادت بھی پڑے اور وہ آئندہ زندگی میں روزی کمانے کے قابل بھی ہو جائیں۔ ان سب کو روزانہ چند گھنٹے کتابی تعلیم بھی دی جائے اور اخلاقی اور مذہبی تعلیم کا بھی انتظام کیا جائے۔ قیدخانے کے اندر آپس میں ملنے کی اجازت صرف ان لوگوں کو دی جائے جو ایک دوسرے کی اصلاح میں مدد دے سکیں۔ ایسا اجتماع نہ ہونے دیا جائے جس کے برے نتائج نکلیں۔ بعض لوگوں کا قول ہے کہ ہر قیدی علیحدہ کوٹھری میں رکھا جائے یعنی ہر قید، قید تنہائی ہو۔ اس طریقے میں انضباط کی آسانی تو ضرور ہے لیکن اصلاح کا مقصد فوت ہوتا ہے کیونکہ صحبت کے فوائد حاصل نہیں ہو سکتے۔ جہاں یکجائی قید کا طریقہ رائج ہو وہاں گروہ بندی اور انتظام میں بڑی ہوشیاری اور احتیاط کی ضرورت ہے۔

اصلاح کا ایک بہت عمدہ طریقہ غیر معیّن سزا ہے جو اس اصول پر مبنی ہے کہ سزا کے دوران میں قیدیوں کا چال چلن سدھر سکتا ہے۔ قانون کی رو سے جرائم کی کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ سزا مقرر ہوتی ہے مثلاً دو سال سے چھ سال تک۔ فرض کیجئے ایک شخص پر جرم ثابت ہو گیا۔ اسے جج میعاد کا تعیّن کئے بغیر تربیت خانے یا تعزیر خانے میں بھیج دے گا اور جیل خانے کی کمیٹی یا جیلر کے اختیار تمیزی سے وہ صرف اتنی مدت تک قید میں رکھا جائے گا کہ اس کی اصلاح ہو جائے۔ اس کے بعد وہ نیک چلنی کا قول لے کر چھوڑ دیا جائے گا۔ عموماً غیر معیّن سزا کے ساتھ ساتھ قول لینے کا طریقہ بھی ہوتا ہے جس کی رو سے قیدی سے نیک چلنی کا قول لے کر اسے رہا کر دیتے ہیں اور وہ ہر مہینے جیلر کے پاس جا کر اپنے مقام سکونت اور عام حالت کی رپورٹ کرتا ہے۔ اگر وہ قول کی میعاد کے اندر رپورٹ کرنے نہ آئے یا کسی جرم یا خلاف قانون فعل کا مرتکب ہو تو پھر جیل بھیج دیا جاتا ہے کہ سزا کی بقیہ میعاد پوری کرے۔ یہ قول لینے کا طریقہ جیل کے تربیت خانوں، صنعتی مدرسوں اور تعزیر خانوں میں جہاں کہیں آزمایا گیا کامیاب ہوا۔

لیکن معاشرتی اصلاح کا بہترین ذریعہ انسدادِ جرم ہے۔ اس میں صنعتی تعلیم، شہر میں لڑکوں کی نگرانی اور خبرگیری اور جرم کے جراثیم کو پھیلنے نہ دینا بیحد مفید ہے۔ بچوں کی عدالتیں جو مسوری[1] کنساس[2] الینوائس[3] اور کولوراڈو[4] میں قائم کی گئی ہیں انسدادِ جرائم کا بہت بڑا ذریعہ ثابت ہو رہی ہیں۔ مدت سے ہمیں یہ محسوس ہو رہا ہے کہ ہمارے جیل جرم کو اور بڑھاتے ہیں۔ ہر قسم کے اور ہر عمر کے لوگوں کو یکجا رکھنے، اصلاح اور تربیت کی تدابیر اختیار نہ کرنے کے سبب سے آج کل کے جیل جرائم کی تعلیم کے مدرسے بن گئے ہیں۔ اس مصیبت سے بچوں کی عدالت نجات دیتی ہے۔ وہ اس لڑکے سے جس نے پہلی بار جرم کا ارتکاب کیا ہے کہتی ہے "تم مجرم ہو اور جیل خانہ تمہارا منتظر ہے مگر میں تمھیں گھر اور مدرسے کی طرف واپس کرتی ہوں۔ چھ مہینے یا سال بھر تک تم یہاں آکر باقاعدہ رپورٹ کیا کرو کہ تمہارا چال چلن کیسا رہا۔ اس رپورٹ پر تمہارے استاد کے یا تمہارے ماں باپ کے دستخط ہونا چاہیئے"۔ یا ممکن ہے کہ وہ یہ کہے "میں تمھیں کسی اچھے گھرانے میں یا صنعتی مدرسے میں بھیجوں گا مگر جیل سے محفوظ رکھونگا" اس طرح کی عدالت، جس کے سامنے ہر طبقے کے سولہ برس سے کم عمر کے لڑکوں کے مقدمے پیش ہوتے ہیں انسدادِ جرم میں بہت بڑی مدد دیتی ہے۔

۳۱۳۔ اصلاح کا لائحۂ عمل

اصلاح کا پہلا قدم یہ ہونا چاہیئے کہ غریبوں کے گھروں کی عدالت سدھاری جائے۔ بے فیس کے کنڈرگارٹن قائم کئے جائیں اور صنعتی تعلیم کو نشو و نما دی جائے۔ جیل کا انتظام از سر نو کیا جائے اور ان میں قیدیوں کی مناسب گروہ بندی اور تعلیم کے طریقے رائج ہوں تاکہ وہ اصلاحی اداروں کا کام دیں۔ اصلاح کا مقصد ہمیشہ پیش نظر

---

[1] Missouri.

[2] Kansas.

[3] Illinois.

[4] Colorado.

رکھا جائے اور اصلاحی مدرسے، تربیت اور تعزیر خانے قائم کئے جائیں۔ لیکن سب سے بہتر کام یہ ہے کہ لوگوں کو اپنی مدد آپ کرنے کی تعلیم دی جائے اور اداروں سے دور رکھا جائے۔ جرم کے اسباب کا انسداد اس کا بہترین علاج ہے۔

باب پنجم

معاشرتی تنزل

۱۳۱ - معاشرتی تنزل کی ماہیت

معاشرتی تنزل سے مراد معاشرے کا انحطاط ہے - یہ انسانی معاشرے کی ہلاکت کا پیام یا کم سے کم اس کی حالت مرض ہے - یہ عمل ارتقا کا جز نہیں ہے - بلکہ اس کا بالواسطہ نتیجہ ہے - ارتقا اپنے وسیع معنی کے لحاظ سے ترقی کی مترادف نہیں ہے بلکہ تنزل اور انحطاط میں بھی اسی کے قوانین کارفرما ہیں - اگر ہم معاشرے کو مجموعی حیثیت سے دیکھیں تو اس کی طبعی حالت یہ ہے کہ ہمیشہ ترقی کرتا رہتا ہے - گو افراد مرتے جاتے ہیں خاندان مٹتے جاتے ہیں قبیلے اور نسلیں معدوم ہوتی جاتی ہیں مگر انسانی معاشرہ ہمیشہ باقی رہتا ہے اور ترقی کرتا ہے اور اس کی قوتیں ہر دور میں بڑھتی جاتی ہیں - نوع انسانی کی تاریخ شاہد ہے کہ بہت سی قوموں نے نشو و نما پائی اوج کمال پر پہنچیں اور پھر رفتہ رفتہ صفحہ ہستی سے مٹ گئیں - اب ان کی جگہ دوسری قومیں منازل ارتقا کو طے کر رہی ہیں - یہاں بھی عالم حیوانات

کی طرح بقائے اصلح کا قانون جاری ہے اس کے مطابق اگر نوع انسانی وسائل بقا کو قابو میں نہ لائے اور ان سے کام نہ لے تو فنا ہو جائے گی۔ نسلوں کی طبعی نشو و نما میں یہی قانون کارفرما نظر آتا ہے۔ بہت سی قومیں ترقی کرتے کرتے ایک ایسے نقطے پر پہنچ جاتی ہیں جس سے آگے بڑھنا ان کے لئے ناممکن ہے۔ اس کے بعد ان کا انحطاط شروع ہوتا ہے اور ایک خاص مدت کے بعد وہ نیست و نابود ہو جاتی ہیں۔ جمود کی حالت میں قوم کو دو خطروں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے جن میں سے ایک اندرونی ہے اور ایک بیرونی۔ اندرونی خطرہ یہ ہے کہ قوم کی قوت حیات گھٹنے لگتی ہے اور اگر باہر سے حملہ نہ بھی ہو تب بھی اس کا دل و دماغ بیکار رہتے رہتے ماؤف ہو جاتا ہے۔ لیکن تنازع للبقا کا قانون ایک بیرونی خطرے کے ذریعے سے اس پر اور جلدی زوال لاتا ہے یعنی دوسری مضبوط قومیں اسے پیس ڈالتی ہیں۔

معاشرتی تنزل اصل میں ان افراد کے انحطاط سے شروع ہوتا ہے اجتماعی جد و جہد میں اپنے فرائض ادا کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اس کی وجہ سے نظم اجتماعی درہم برہم ہو جاتا ہے اور معاشرے کی زندگی پر زوال آجاتا ہے۔ جب تک یہ ہو کہ جو فرد انحطاط میں مبتلا ہو اور اپنا فرض ادا کرنے سے قاصر رہے اس کی جگہ کو دوسرا فرد پر کر دے تو معاشرہ باقی رہ سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ بیرونی حملوں سے محفوظ رہے۔ جس طرح ایک عضو جسے روگ لگ گیا ہو ایک دن سارے جسم کو بگاڑ دیتا ہے اور فرد کی ہلاکت کا باعث ہوتا ہے اسی طرح معاشرے کا ایک ناقص حصہ سارے جسم اجتماعی کو برباد کر دیتا ہے۔ مختصر یہ کہ معاشرتی تنزل معاشرے کی بیماری کی علامت ہے۔

۱۳۵۔ تنزل یعنی بے اعتدالی شراب نوشی وغیرہ کی کثرت سے پیدا ہوتا ہے

ہر قسم کی بے اعتدالی جب حد سے گذر جائے اور افراد کو ہلاک کر دے تو اس کا اثر نسل پر اور

معاشرے کی اجتماعی جد وجہد پر بھی پڑتا ہے۔ جو باپ شراب کثرت سے پیتا ہے چاہے اس کے بیٹے شرابی نہ ہوں مگر انہیں مرگی، ناقص العقل دق وغیرہ ہو جانے کا احتمال ہے۔ اس طرح سے انحطاط پذیر افراد پیدا ہوتے ہیں۔ اگر یہ سلسلہ عرصہ تک جاری رہے تو معاشرہ برباد ہو جائیگا۔ بہ خلاف اس کے محنتی اور اعتدال پسند لوگ نہ صرف ان تصورات اور خیالات کی تشکیل کرتے ہیں جو طبعی نشو ونما اور ترقی کے محرک ہیں بلکہ ایسی نسل پیدا کرتے ہیں جو روز افزوں طاقت رکھتی ہے اور ترقی کے موقعوں سے فائدہ اٹھاتی ہے۔ اسی اصول کے مطابق آخر میں اعتدال پسند اشخاص معاشرے کی دولت کے مالک ہوتے ہیں اجتماعی قوتوں کا نظم وضبط کرتے ہیں اور علمی حقایق دریافت کرتے ہیں جن کے افادی پہلو سے معاشرے کی ترقی میں مدو ملتی ہے اس لئے بے اعتدالی کا صرف ایک ہی مہلک اثر نہیں کہ وہ نسل کی جسمانی قوت کو گھن لگا دیتی ہے بلکہ اس کی بدولت طبعی معاشرتی جد وجہد میں خلل پڑتا ہے اور اتحاد عمل پر مبنی معاشرے کا وجود ہی ناممکن ہو جاتا ہے۔ یہ ہر طرح کی طبعی ترقی میں حائل ہوتی ہے اس لئے اسے تنزل کے اسباب میں شمار کرنا چاہیئے۔

۳۱۶۔ بدچلنی کے اثرات

بے اعتدالی کی طرح بدچلنی بھی طبعی معاشرتی زندگی کے انحطاط کا باعث ہوتی ہے۔ وہ معاشرے کی جسمانی نفسی اور حیاتی طاقت کو زائل کر دیتی ہے اور اس قوت عمل کو جو ترقی میں صرف ہونا چاہیئے تھی منتشر کر دیتی ہے۔ بے اعتدال لوگوں کی طرح بدچلن لوگ بھی صحیح ادراک سے قاصر ہوتے ہیں اور قطعی نتائج پر نہیں پہنچ سکتے۔ اس کی وجہ سے عمل اجتماعی میں صحت اور استواری باقی نہیں رہتی۔ چونکہ معاشرے کی ترقی کے لئے ایک طرف تو اس کے وظائف کی توسیع اور دوسری طرف اس کے اعضاء کی صحت عمل ضروری ہے۔ اس لئے بدچلنی کے اثرات

طبعی وظائف میں خلل ڈالتے ہیں اور تنزل کا باعث ہوتے ہیں۔

۳۱۷- وراثت کے اثرات

وراثت کے جو اثرات انفرادی زندگی پر پڑتے ہیں ان کا تعین ابھی پوری طرح نہیں ہوا۔ مگر اس میں شک نہیں کہ فرد اور معاشرے دونوں پر کسی نہ کسی صورت میں اس کا بہت قوی اثر پڑتا ہے۔ اگر بیماری باپ سے بیٹے کی طرف منتقل نہیں ہوتی تو کم سے کم بیٹے کے نظام جسمانی میں بیماری کو جلد قبول کرنے کا مادہ ضرور ہوتا ہے۔ لیکن اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ خون کی بیماریاں متوارث ہوتی ہیں۔ ان میں خاص طور پر نسل کو کمزور کرتے کرتے مٹا دینے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ "جوک خاندان[۱]" "سموکی[۲]" اور "قبیلہ اسمٰعیل[۳]" کی مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیماری، عیوب اور جرائم پشت در پشت منتقل ہوتے رہتے ہیں کیونکہ خانداں کے اندرن خصوصیتوں کا انتقال صرف خون ہی کے ذریعے سے نہیں ہوتا بلکہ بچپن کی صحبت تربیت، اور ماحول کے اثر سے بھی۔ اگر ایک خاندان جرائم پیشہ اور بدکار ہے تو اس کے بچے بھی کمسنی سے اس بری صحبت اور برے ماحول میں رہنے کے سبب سے ویسے ہی ہو جائیں گے چاہے یہ ثابت نہ بھی ہو سکے کہ بیماری یا جرم کے جراثیم خون کے ذریعے سے منتقل ہوتے ہیں بہر حال یہ یقینی ہے کہ کبھی کبھی خاندان کے خاندان بلکہ قوم کی قوم اس طرح سے انحطاط میں گرفتار ہوتی ہے کہ ہر پشت میں حالت ابتر ہوتی جاتی ہے۔ یہاں گویا ارتقائے معکوس کا عمل نظر آتا ہے۔ اسی طرح اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ بہت سے پرانے

---

[۱] Jukes family.

[۲] Smoky Pilgrims.

[۳] Tribe of Ishmael.

خاندانوں مثلاً ایڈورڈ خاندان یا ڈوائٹ[1] خاندان میں پُشت ہا پُشت میں اعلیٰ درجہ کی جسمانی اور نفسی قوتیں پائی جاتی ہیں اور ان کا معاشرتی اقتدار برابر بڑھتا جاتا ہے۔ بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک قوی خاندان یا نسل اپنے آباؤ اجداد کے ورثے سے فائدہ اٹھانے میں قاصر رہتی ہے اور رفتہ رفتہ تنزل کرتی ہے بلکہ مٹ جاتی ہے۔ ایسے ہی لوگوں کا ذکر لوویل[2] نے اپنی نظم "مائلس اسٹنڈش[3] سے ملاقات" میں کیا ہے:-

اُن کا دعویٰ ہے کہ ہماری رگوں میں زائرین کا خون ہے
ہمارا نسب بلند و برتر اور پاک ہے
ایک پہاڑی ندی جو جا کر دلدل میں گر جائے
میرے نزدیک تو قابل تاسف ہے

غرض جس حد تک ہم بیماریوں سے پاک رہیں اور اپنی جسمانی اور نفسی زندگی کو بہتر بنائیں اسی حد تک معاشرتی زندگی کو ترقی ہوگی کیونکہ اعلیٰ اجتماعی زندگی اعلیٰ افراد ہی پر مشتمل ہوتی ہے۔

۳۱۸۔ غیر معاشرت پسند فرد

تنازع للبقا کے دور دورے میں جب ہر فرد اپنی زندگی اور کامیابی کا خود ذمہ دار ہوتا ہے وہی لوگ باقی رہتے ہیں جن کی طبیعت میں خود غرضی اور خونخواری ہو۔ ان میں یہ بات اس حد تک نہیں ہوتی کہ سرے سے اجتماعی زندگی کو ناپسند کریں البتہ اجتماعی تعلقات کے تعین میں وہ نفسانیت سے کام لیتے ہیں انسان دوسروں کو لوٹ کر فائدہ

---

[1] Dwights

[2] Lowell

[3] Interview with Miles Standish

اٹھانے پر تیار ہو جاتا ہے مگر اسے اکیلا رہنا منظور نہیں، یہ غارت گری کی جبلت معاشرے کے بہت سے ارکان میں پائی جاتی ہے۔ مگر ایسا شائد ہی کوئی ہو جو معاشرے کا برباد ہو جانا اور اجتماعی تعلقات کا منقطع ہو جانا پسند کرے۔ حقیقی معنی میں غیر معاشرت پسند وہی کہلائے گا جو معاشرے کی تباہی کے درپے ہو۔ ایسا شخص اجتماعی اور انفرادی حیثیت سے بالکل غیر طبعی ہے البتہ ایسے لوگ بہت ہیں جو کمزوری یا بد طینتی کے سبب سے اپنے معاشرتی فرائض انجام نہیں دیتے۔ اگر سب یہی کرنے لگیں تو معاشرے میں عام انحطاط شروع ہو جاتا ہے۔ اس لئے جو معاشرہ تنزل پذیر ہو اس میں یقیناً ایسے افراد موجود ہوں گے جو انحطاط میں مبتلا ہیں، ان کے سبب سے معاشرتی وظائف میں خلل پڑ رہا ہوگا اور عام حالت روز بروز گر رہی ہوگی۔

۳۱۹ تنزل کے اجتماعی اسباب

ہر وہ چیز جو جسم اجتماعی کے وظائف میں خلل انداز ہو یا نظم اجتماعی کو بگاڑے بلاواسطہ تنزل کا سبب ہوتی ہے، طبعی معاشرتی عمل میں خرابی پیدا ہونے کے بہت سے اسباب ہیں۔ بظاہر ان کا اثر صرف اتنا ہوتا ہے کہ ترقی رک جاتی ہے مگر یہ بھی ممکن ہے کہ وہ جسم اجتماعی کے اعضاء کو ماؤف کر کے اس کی ہلاکت کا باعث ہوں۔ مثال کے طور پر ان حادثوں کو لیجئے جو صنعتی زندگی میں خطرناک مشاغل کی وجہ سے واقع ہوتے ہیں۔ فرض کیجئے ایک کان کے پھٹ جانے سے سو آدمی ہلاک ہو جاتے ہیں اور سو خاندانوں کی روزی بند ہو جاتی ہے۔ یہ خاندان چاہے جس حیلے سے پیٹ پالیں لیکن جس فارغ البالی کی طبعی زندگی یہ پہلے بسر کرتے تھے وہ اب میسر نہیں آسکتی۔ ان خاندانوں میں انتشار پیدا ہو جائے گا بعض افراد بھوک سے یا بیحد محنت کرنے سے ہلاک ہو جائیں گے بعض بیماری اور مایوسی کا شکار ہوں گے اور بعض بدکاری یا جرائم پر

اُتر آئیں گے۔ ممکن ہے کہ معاشرے پر ان حادثوں کا اثر نہ پڑے اور اس کی طبعی زندگی بدستور جاری رہے لیکن جو کمزوری پیدا ہو گئی ہے اسے دور کر دینا چاہیئے ورنہ ایک دن سب پر تباہی آ جائے گی۔ اگر اس قسم کے بہت سے حادثے ہوتے رہیں مثلاً آبادی کی غلط تقسیم، یا خفظان صحت کی خرابی یا مردوں عورتوں و بچوں سے نامناسب کام لینے سے بیماریاں پیدا ہوں یا صنعتی تغیرات سے بے روزگاری پھیلے یا کسی وجہ سے شرح اموات بڑھ جائے تو معاشرہ یقیناً کمزور اور تنزل پذیر ہو جائے گا۔ اگر یہ سب خرابیاں ایک ہی وقت میں پیدا ہوں اور غذا کی رسد بھی کم ہو جائے تو معاشرے کی قوت روز بروز گھٹتی جائے گی یہاں تک کہ اجتماعی احساس خیال اور ارادہ مفقود ہو جائے گا اور معاشرتی اتحاد عمل کا نام بھی نہ رہے گا۔

۳۲۰۔ معاشروں کی قسمیں یا طرز

ہر معاشرہ ایک خاص طرز کا ہوتا ہے اور اس کی ترقی کی ایک خاص رفتار ہوتی ہے۔ اس کا نصب العین اس کی عملی زندگی سے بالاتر ہوتا ہے۔ ہر معاشرے کے سامنے ایک نصب العین یا معیار ہوتا ہے اور وہ اسے حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ معاشرتی قوتوں کی حرکت تیز ہو جانے سے رفتہ رفتہ یہ نصب العین بدل جاتا ہے اور اس کے ساتھ معاشرے کے طرز زندگی میں بھی تبدیلی ہو جاتی ہے۔ اگر وہ قوتیں جو معاشرے کے نصب العین کو قائم رکھتی ہیں اور اس کے ماحول کی اصلاح کرتی ہیں معطل ہو جائیں تو معاشرتی زندگی سابقہ طرز کی طرف رجوع کرتی ہے اور پشتہا پشت کے حاصل کئے ہوئے فضائل ضائع ہو جاتے ہیں۔ اس کی صورت یا تو یہ ہوتی ہے کہ معاشرہ اپنا نصب العین کھو بیٹھتا ہے یا یہ کہ اس میں اس کے حصول کے لئے کافی قوت ارادی صرف کرنے کی صلاحیت نہیں رہتی۔ عیش و عشرت، کاہلی یا میٹھے پن

سے معاشرے کی فکر و عمل کی قوتیں برباد جاتی ہیں اور وہ اپنے آبائی فضائل سے محروم ہو جاتا ہے۔

معاشرے کے مجموعی اصول کچھ اور ہوتے ہیں اور اس کے علیحدہ علیحدہ گروہوں کا معیار اخلاق اور عمل کچھ اور ہوتا ہے۔ بانٹو کے حبشی[1] تھلنکلیٹ[2]، آئینو[3] اور سیوکس[4] قبیلے علیحدہ علیحدہ نصب العین اور طرز زندگی رکھتے ہیں مگر ان میں اور مہذب امریکیوں کے اصول و عمل میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

۳۲۱-معاشرے کی بقا

معاشرے کی امیدوں کا دار و مدار اس پر ہے کہ قوی افراد کو قوی تر بنا دے لیکن یہ جبھی ہو سکتا ہے کہ ہر آنے والی نسل کے لئے بہتر ماحول مہیا کیا جائے تاکہ وہ تہذیب و تمدن کے ذخیروں سے فائدہ اٹھا سکے۔ معاشرتی ارتقا کا تقاضا ہے کہ قوی افراد کو اپنی قوت کے استعمال کرنے کا موقع ملے اور ضعیف افراد آہستہ آہستہ معدوم ہو جائیں لیکن عمرانی حیثیت سے کمزوروں کے معدوم ہونے سے مراد ہے ان کی کمزوریوں کا مٹ جانا۔ مہذب معاشرے میں قوی لوگوں کا یہ فرض ہے کہ ضعیفوں کی حفاظت کریں اور انھیں اپنا ضعف دور کرنے کا موقع دیں ورنہ آہستہ آہستہ یہ ضعف سارے معاشرے کو کمزور کر دے گا اور قوی افراد کو بھی لے ڈوبے گا۔ اس لئے سارے معاشرے کو صنعت و حرفت، حفظان صحت، تدبیر منزل اور عمرانی زندگی کی تربیت دینا چاہئے تاکہ اس کی

---

[1] Bantu Negroes

[2] The Thlinklets

[3] The Ainu

[4] The Sioux

طبعی نشو و نما جاری رہے۔ عیوب و جرائم کا انسداد غریبوں کی امداد اور گداگری کا سد باب بھی ضروری ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان سب کو ایسی تعلیم ملنا چاہیئے کہ فارغ البالی کی زندگی بسر کرنے اور معاشرتی فرائض انجام دینے کے قابل ہو جائیں۔ معاشرہ اپنے نصب العین اور طرز زندگی کے انتخاب اور اپنے عمل کی تنظیم سے اپنی بقا کا سامان کر سکتا ہے۔ قوی افراد کو چاہیئے کہ کمزوروں کو ترقی کے موقعے دیں اور انھیں ان موقعوں سے فائدہ اٹھانا سکھائیں، یہ عمل ہمیشہ جاری رہنا چاہیئے کیونکہ معاشرتی زندگی کوئی خود حرکی چیز نہیں۔ ترقی کی کوشش کو معاشرے سے وہی نسبت ہے جو غذا کو جسم سے ہے۔ اس کی ضرورت ہر وقت رہتی ہے۔ معاشرے کا کام کبھی ختم نہیں ہوتا کیونکہ وہ خود بھی مکمل نہیں ہوتا۔ اس کا انتہائی مقصد جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں یہی ہے کہ طبعی نشو و نما جاری رہے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ اکتسابی خصلتوں یا تمدنی ذخیروں سے فائدہ اٹھانے کا وسیع تر اور بہتر موقع حاصل ہو۔

باب ششم

خیراتی اور اصلاحی کاموں کا انتظام

۳۲۲ - غریبوں اور ضعیفوں کی خبرگیری کی ضرورت

پچھلے باب میں یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ قوی اور طبعی افراد پر کمزور اور غیر طبعی افراد کی خبرگیری لازم ہے، لیکن اس فرض کو اس طرح ادا کرنے کے لئے کہ معاشرے کی قوت اور صحت میں اضافہ ہو بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ اگر افراد کی کمزوری کا اثر انھیں تک محدود ہوتا تو وہ اپنے حال پر چھوڑ دئے جاتے اور طبعی انتخاب کا قانون انھیں خود بخود معدوم کر دیتا۔ لیکن معاشرہ نہ یہ کر سکتا ہے اور نہ یہ کہ جو لوگ معاشرتی اتحاد عمل کے قابل نہ ہوں انھیں قتل کرا دے۔ اسے لامحالہ یہ کوشش کرنا پڑتی ہے کہ انھیں معاشرتی زندگی کے قابل بنائے یا ان کی ناقابلیت کو بڑھنے نہ دے۔ اس میں اس بات کی احتیاط مدنظر رہنا چاہئے کہ کمزور اور بیکار افراد کی تعداد نہ بڑھنے پائے اور وہ دوسروں پر بار ہو کر ان کی

قوت حیات کو کم نہ کر دیں۔

خود طبعی افراد کو صحیح معاشرتی زندگی کی تربیت دینا مشکل ہے چہ جائیکہ غیر طبعی افراد کی تربیت اس لئے جو لوگ ریاست کی نگرانی میں ہوں۔ انکی حفاظت اور تربیت میں معمولی لڑکوں کی تعلیم سے کہیں زیادہ اہتمام ہونا چاہئے۔ لیکن یہ اہتمام عموماً نہیں کیا جاتا اس لئے جرائم مرگی اور جنون کی بیماریوں اور گداگری کو روز بروز ترقی ہو رہی ہے۔

۳۲۳- انتظام کے طریقے

خیراتی اور اصلاحی کاموں کی دو قسمیں ہیں سرکاری اور غیر سرکاری۔ پہلے زمانے میں غریبوں کی امداد غیر سرکاری انجمنوں پر چھوڑ دی جاتی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ کام ریاست کے فرایض میں شامل ہو گیا یعنی معاشرے کو یہ احساس پیدا ہوا کہ کمزوروں کی خبر گیری کی ذمہ داری اس کے کل ارکان پر عائد ہوتی ہے معاشرے کے ابتدائی دور میں جرم کا اثر افراد تک محدود سمجھا جاتا تھا۔ ہر شخص کو اجازت تھی کہ جو اس پر زیادتی کرے اسے اپنے طور پر سزا دے۔ قتل کی صورت میں مقتول کے عزیزوں کا فرض سمجھا جاتا تھا کہ قاتل سے قصاص لیں۔ مگر آہستہ آہستہ یہ کام ریاست کا قرار پایا کہ معاشرے کے افراد کی حفاظت کرے اور مجرموں کو سزا دے۔ اب حکومت اور قانون فرد کو مجبور کرتے ہیں کہ اگر کوئی اس پر زیادتی کرے تو اسے خود سزا نہ دے۔ البتہ اُسے یہ حق ہے کہ ریاست سے اپنی جان و مال کی حفاظت اور مجرموں کی سیاست کا مطالبہ کرے۔ اب رہی خیرات تو اس کے غیر سرکاری انتظام میں ہمدردی، جوش اور آزادی عمل کے فوائد ضرور ہیں لیکن جامعیت اور ہم آہنگی نہیں ہوتی۔ سرکاری انتظام میں یہ خوبی ہے کہ باقاعدہ حلقے ہوتے ہیں اور انکی کامل نگرانی کیجاتی ہے پھر یہ بھی ہے کہ ہر شخص جب چاہے کام کا معائنہ کر سکتا ہے مگر اس میں دو خطرے ہیں ایک یہ کہ جو روپیہ خرچ ہوتا ہے اس سے

پورا فائدہ نہیں اٹھایا دوسرے یہ کہ سیاسی فرقہ بندی کا اثر خیراتی کاموں پر بھی پڑتا ہے، سرکاری خیراتی اداروں کی آمدنی منتقل ہوتی ہے کیونکہ ان کے لئے خاص محصول لگایا جاتا ہے۔ غیر سرکاری ادارے چندوں سے کام چلاتے ہیں اس لئے ان کی مالی حالت قابل اطمینان نہیں ہوتی۔ تاہم غیر سرکاری یا ذاتی خیرات میں محبت اور خداترسی زیادہ ہوتی ہے سرکاری ادارے انتظامی مشینیں ہیں، جوش سے خالی، احساس سے بیگانہ۔

۳۲۴۔ سرکاری انتظام کے طریقے

سرکاری خیراتی اور اصلاحی اداروں کے انتظام کے مختلف طریقے ہیں جو طریق حکومت کے اختلاف پر مبنی ہیں۔ ہر ریاست کا قانون اور طرز عمل جداگانہ ہے۔ عام طریقہ یہ ہے کہ ریاست خیراتی کاموں کی نگرانی کے لئے ایک مجلس منتظمہ مقرر کرتی ہے اور اس کے ماتحت مقامی کمیٹیاں ہوتی ہیں۔ امریکہ کی دو ایک ریاستوں مثلاً آئی اووا[1] اور منیسوٹا[2] میں ایک ہی مجلس ساری ریاست کے خیراتی کاموں اور اصلاح مجرمین کے اداروں کی نگرانی کرتی ہے۔ کنساس میں خیراتی اداروں کی نگرانی کرنے والی مجلس الگ ہے اور اصلاحی صنعتی مدرسوں اور تعزیرخانوں کی نگرانی کے لئے علٰحدہ مجلسیں قائم ہیں۔ ریاست کی مجلس منتظمہ نگرانی کے لئے تو بہت اچھی ہے لیکن اس میں یہ خطرہ ہے کہ ضابطے کی مشین بن کر رہ جاتی ہے۔ بہ خلاف اس کے ایسی مجلس جو ریاست کی طرف سے غیر سرکاری اداروں کا معائنہ کرتی ہے اور انھیں مشورہ دیتی ہے اس حیثیت سے زیادہ مفید ہے کہ یہ بہترین انتظامی تدابیر اور

---

[1] Iowa

[2] Minnesota

غریبوں کی امداد کے علمی اصول پر مبنی طریقے دریافت کر سکتی ہے۔

جہاں یہ مجلس ہوتی ہے وہاں عام طور پر اصلاح مجرمین کے اداروں کی نگرانی کا محکمہ الگ ہوتا ہے تاہم لوگ مجلس منتظمہ کو جو آئی اووا، مینسوٹا اور کنساس میں قایم کی گئی ہیں بہت پسند کرتے ہیں اور غالباً امریکہ کی کل مغربی ریاستوں میں یہی طریقہ رائج ہو جائے گا۔

مساچیسٹس[1] میں ایک سرکاری مجلس مجنونوں کی نگرانی کے لئے ہے جو مخبوط الحواس اور ضعیف العقل لوگوں کی خبر گیری کرتی ہے۔ ہر کام کے لئے ایک علیحدہ مجلس مقرر کرنے میں یہ فائدہ ہے کہ مجلس کے ارکان کو اپنے کام میں مہارت حاصل ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اگر کوئی شخص مجنونوں کے متعلق پوری واقفیت حاصل کرنا اور ان کی کما حقہٗ نگرانی کرنا چاہے تو یہی عمر بھر کا کام ہے۔ اسے جرائم پیشہ لوگوں کی طرف توجہ کرنے کا موقع نہیں مل سکتا۔ اسی طرح جیل خانوں اور اصلاح مجرمین کی نگرانی کا میدان اس قدر وسیع ہے کہ جو شخص یہ کام کرے اسے کسی اور انتظامی کام کی طرف توجہ نہیں کرنا چاہئے لیکن جب ایک ہی مجلس ایک بڑی ریاست کے خیراتی اور تعزیری و اصلاحی اداروں کا انتظام کرتی ہے تو خواہ اس کا نظم و نسق کتنا ہی اچھا ہو وہ ان کل اداروں کو جو اس کے ماتحت ہیں پوری طرح نہیں سمجھ سکتی اور قابل نگرانی افراد کی خبر گیری کے بہترین طریقے عمل میں نہیں آ سکتے۔ ہر ریاست میں تعزیری اور اصلاحی اداروں کا محکمہ علیحدہ ہونا چاہیئے اور خیراتی اداروں یعنی یتیم خانوں پاگل خانوں وغیرہ کا علیحدہ۔ اندھوں، گونگوں اور بہروں کے مدرسوں کو سررشتہ تعلیمات کے ماتحت رکھنا مناسب ہے۔ اس طرح بہت زیادہ مجلسیں بھی نہیں ہونے پائیں گی اور کام بھی اس طرح تقسیم ہو جائیگا کہ بہترین نتائج حاصل ہوں۔

---

[1] Mossachusetts

۳۲۵ - قابل نگرانی افراد کی تقسیم اداروں میں

محتاجوں اور جرائم پیشہ لوگوں کی خبر گیری میں سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ سب مصلحتوں کا لحاظ کر کے یہ الگ الگ اداروں میں رکھے جائیں۔ مجرموں میں سے عادی مجرموں کے لئے تعزیر خانے ہونا چاہئیں۔ اصلاح پذیر کمسن مجرموں کے لئے تادیب خانے یا اصلاحی مدرسے اور غیر اصلاح پذیر لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے صنعتی مدرسے۔ ہر شخص کو مناسب ادارے میں بھیجنے کا خاص اہتمام ہونا چاہئے۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں یہ نظام جاری ہے لیکن تقسیم اور جماعت بندی بڑی بے پروائی سے کیجاتی ہے۔

ضعیف العقلوں، مجنونوں اور مرگی کے بیماروں کا علاج علیحدہ علیحدہ شفا خانوں میں کرنا مناسب ہے۔ آج کل عام محتاج خانوں اور دیہاتی خیرات خانوں میں تفریق اور تقسیم کا نام بھی نہیں ہوتا۔ وہاں بھک منگے فلاکت زدہ، ضعیف العقل، مجنون، مرگی کے بیمار، مجرم اور بعض وقت کہنہ امراض کے مریض جنھیں شفا خانوں میں ہونا چاہئے تھا، سب ساتھ ہی رکھے جاتے ہیں۔ اگر ان کی تقسیم باقاعدہ کیجائے تو ہر شخص کو اس کی مخصوص ضرورتوں کے مطابق امداد دی جاسکتی ہے اور وقت اور روپیہ بہتر طریقے سے صرف کیا جاسکتا ہے۔ سب سے بُرا دستور آج کل یہ ہے کہ کمسن مجرم جیلخانہ یا تعزیر خانے میں پرانے مجرموں کے ساتھ رکھے جاتے ہیں۔ اس کے بعد ہر طرح کے مصیبت زدہ لوگوں کو ایک جگہ جمع کرنے کا طریقہ ہے جو بعض دیہاتی خیرات خانوں میں نظر آتا ہے۔ مجنونوں اور مرگی کے بیماروں کو اکٹھا رکھنا صریح غلطی ہے۔ اصلاح کا سب سے پہلا اصول تقسیم اور ترتیب ہے۔

۳۲۶ - ایک ہی ادارے کے اندر رہنے والوں کی درجہ وار تقسیم

ان اداروں کے منتظم مجالس اور ان کے مہتمموں کو اس بات پر

زور دینا چاہیئے کہ ہر ادارہ کے رہنے والے احتیاط کے ساتھ مختلف درجوں میں تقسیم کیئے جائیں۔ مختلف افراد کا آپس میں ملنا مضر بھی ہو سکتا ہے اور مفید بھی ہو سکتا ہے۔ صرف ان لوگوں کو ملنے دینا چاہیئے جو ایک دوسرے کو فائدہ پہنچا سکیں یا کم سے کم نقصان نہ پہنچائیں۔ انسان بالطبع معاشرت پسند ہے اس لئے مناسب صحبت ہمیشہ مفید ہوتی ہے۔ مصیبت زدہ یا بدکردار لوگ خود ایک دوسرے کی مدد کر سکتے ہیں بشرطیکہ مناسب تقسیم اور صحیح طریقے سے کام لیا جائے۔

۳۴۷۔ ملازموں اور عہدہ داروں کا تقرر قابلیت کے لحاظ سے

ان اداروں کے بڑے اور چھوٹے عہدہ داروں کا تقرر بہت اچھی طرح قابلیت کی جانچ کرنے کے بعد ہونا چاہیئے۔ بعض ریاستوں میں یہ صورت ہے کہ جو سیاسی فرقہ برسر حکومت ہو وہ اپنے طرفداروں کو خیراتی اور تعزیری اداروں میں بھر دیتا ہے۔ یہ طریقہ نہایت ہی مضر ہے۔ جن لوگوں نے اپنی پارٹی کی خدمت کی ہے وہ اپنے لئے اور اپنے دوستوں کے لئے عہدوں کا مطالبہ کرتے ہیں۔ جدھر دیکھیئے "عہدوں کے بھوکے نااہل بھرے ہوئے ہیں اور بہت سے سرکاری ملازم "محض کاٹھ کے گھوڑے ہیں جنھیں عہدے کی جھولیں اڑھا دی گئی ہیں"۔ اس قسم کے لوگ تقرری کمیٹیوں کے ارکان کو گھیرے رہتے ہیں اور کسی عہدے پر مناسب شخص کو مقرر کرنے کے لئے بڑے سلیقے، صبر و تحمل اور ہمت کی ضرورت ہے۔

سول سروس کا نظام ایک حد تک اچھے عہدہ داروں کے انتخاب میں مدد دیتا ہے۔ لیکن یہ کوئی خود حرکی مشین نہیں جو آپ ہی آپ چلتی رہے۔ یہ محض ایک ذریعہ ہے جو اسی وقت مفید ہو سکتا ہے جب اس سے بہت احتیاط کے ساتھ کام لیا جائے۔ قابلیت کے لحاظ سے تقرر کرنے میں سب پہلوؤں پر نظر رکھ کر کام کیا جا سکتا ہے اور اگر تقرر کرنے والے سمجھدار اور ایماندار ہیں اور ان میں اتنی ہمت ہے کہ سیاسی دباؤ کا مقابلہ

کرسکیں تو یہ طریقہ سول سروس کے ضابطوں کی جکڑ بند سے اچھا ہے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہر تیسرے سال جب حکومت کرنے والی پارٹی بدلتی ہے تو اس کے ساتھ ان اداروں کے چھوٹے بڑے ملازم سب بدل جاتے ہیں۔ یہ نہایت ہی مہمل دستور ہے بہترین تدبیر یہ ہے کہ ہر عہدے پر سب سے موزوں شخص کا تقرر کیا جائے اور جب تک اس سے اچھا آدمی نہ ملے اس کو رہنے دیا جائے۔

اگر عہدہ دار قابل اور متدین ہوں تو انتظام کا ہر طریقہ کامیاب ہوسکتا ہے بشرطیکہ اس کے ذریعہ سے انھیں عمدگی سے کام کرنے کا موقع ملے۔ اصل میں کامیابی کا دارو مدار کام کرنے والوں کی سیرت پر ہے۔

خیراتی اداروں کا سرکاری انتظام عام معاشرے کی فلاح و بہبود کے لئے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اگر محتاج مجرم اور ناقص الخلقت طبقوں کی خبر گیری اداروں کے اندر یا باہر نہ کی جائے تو ان کی تعداد رفتہ رفتہ بڑھ جائے گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ معاشرہ اور بھی غیر طبعی ہو جائے گا۔ اور اس پر اور زیادہ بوجھ پڑھ جائے گا۔ کمزور اور بد اطوار لوگوں کی مدد کے لئے جو بیشمار رقمیں صرف کی جاتی ہیں اور ان کا مصرف تبھی صحیح ثابت ہوسکتا ہے جب ان سے دنیا کی ترقی میں مدد ملے۔ کل خیراتی اور تعزیری اداروں میں اصلاح کا عنصر شامل ہونا چاہیئے ورنہ مصیبت زدوں کی خبر گیری کی کوشش ہے ہماری مصیبتیں اور بڑھ جائیں گی۔ ان کاموں میں لاکھوں کروروں ڈالر ناقص طریقے سے صرف کرکے تنزل پذیر نسل کو باقی رکھنے سے تو یہی اچھا ہے کہ ہم اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں تاکہ فطرت کا عمل انتخاب سے معدوم کردے۔

حصۂ ششم

عمرانی تحقیقات کے منہاج

حصۂ ششتم

عمرانی تحقیقات کے منہاج

باب اوّل

تحقیق کا میدان

۳۲۸ - انسانی معاشرہ

عمرانیات کی تحقیق کا میدان بہت وسیع ہے اور اِنسانی معاشرے اکثر مظاہر پر حاوی ہیں۔ یہاں "معمل کے منہاج" سے یعنی علوم طبیعی کے اصولوں سے کام چلانا مشکل ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ اگر ہم عمرانیات کو محض ذہنی علم قرار دیں اور معاشرتی واقعات کے مشاہدے اور بیان سے سروکار نہ رکھیں تو یہ علم محض فلسفۂ معاشرت بن کر رہ جائے گا، اِس لئے اِس کے محقق کو ابتدا ہی سے معاشرے کی ساخت اور اس کے اعمال کا مشاہدہ شروع کر دینا چاہئے۔ جہاں کہیں لوگ مل جل کر رہتے ہیں وہاں غور سے دیکھنے والے کو بہت سے قابل مشاہدہ اور قابل ذکر معاشرتی تعلقات نظر آئیں گے۔

لیکن مشاہدہ صرف خاص خاص واقعات کا کرنا چاہئے اور ایک خاص مقصد کو مدنظر رکھ کر، یہ مانا کہ تحقیق کا میدان بہت وسیع ہے لیکن اس کے دائرہ بحث میں بلا تفریق ہر قسم کے مظاہر کو شامل کرلینا جائز نہیں، عمرانیات کی تحت میں ساری معاشرتی زندگی آجاتی ہے لیکن وہ صرف ان واقعات کو تلاش کرتی ہے جن سے اُسے بہ حیثیت سائنس کے سروکار ہے، اس کے مفید مطلب ایک خاص قسم کے واقعات ہیں۔ اخلاقیات سیاسیات، اور معاشیات کے بہت سے مسائل باوجودیکہ معاشرتی زندگی کے مسائل ہیں، مگر عمرانی تحقیق کے دائرے میں شامل نہیں کئے جاسکتے، بلکہ اس علم اجتماعی کے موضوع ہوتے ہیں جس سے انہیں خاص طور پر تعلق ہے بعض صورتوں میں عمرانیات

اُن مسائل سے بھی بحث کرتی ہے۔ جنھیں دوسرے علوم اجتماعی سے علاقہ ہے لیکن اس کی بحث کا طریقہ اور مقصد دوسرا ہوتا ہے۔

۳۲۹- کتابوں کا استعمال

معقول علمی تحقیق کے لئے عمدہ اور منتخب کتابوں کا مجموعہ ناگزیر ہے، کیونکہ جو شخص تحقیق کرنا چاہتا ہے اُسے یہ جاننا ضروری ہے کہ اُس سے پہلے دوسروں نے علمی تحقیق کے میدان میں کیا کیا کام کر لیا ہے، اِس میں شک نہیں کہ انسان کو ذاتی طور پہ معاشرتی امور کا مشاہدہ کرنا چاہئے، مگر دوسروں کے تجربے سے فائدہ نہ اٹھانا حماقت ہے۔ کتابوں میں جو واقعات جمع کرکے ترتیب کے ساتھ درج کیے گئے ہیں اور ان واقعات سے جو اصول اخذ کئے گئے ہیں وہ ادبی تحقیق کے لئے بڑا وسیع میدان پیش کرتے ہیں حکومت کے محکموں اور کمیشنوں مثلاً امریکی ریاستوں کے تجارتی کمیشن، مردم شماری کے دفتر، ریاستہائے متحدہ کی لیبر بیورو اور محکمہ تجارت کی رپورٹوں تک اس تحقیق کے لئے بہت کچھ مواد مل سکتا ہے، اِس کے علاوہ اسپنسر، ڈارون، ہکسلے وغیرہ کی تحقیق کے نتائج بھی محقق کے لئے بہت اہم ہیں، اسی طرح عمرانیات کے مستند مصنفوں مثلاً ووگریف وارڈ، کمپلووِتس، اسمال، راس، گڈنگز، ٹامس[۱]، زیمیل[۲]، راٹزن ہوفر[۳]، ٹونیس[۴] وغیرہ کی کتابیں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔

عمرانیات کے طالب علم کے لئے یہ بہت ضروری ہے کہ معاشرتی واقعات اور معاشرے سے متعلق واقعات کے فرق کو، نظر رکھے اور ماخذوں اور سند کی کتابوں کو دو قسموں میں تقسیم کرے، اصلی اور ضمنی اس علم کا پہلا اصول یہ ہے کہ انسان اشیاء کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنا سیکھے۔ جیسے ہی طالب علم کتابوں کا مطالعہ کرنا اور کچھ سننا شروع کرے اسے کوئی خاص مضمون بنانا چاہیے کہ اس پر جتنی کتابیں مل سکیں سب کو پڑھے اور ان کا خلاصہ لکھے۔ ان مضامین کا انتخاب ابتدا میں اس نقطۂ نظر سے نہیں ہونا چاہیے کہ علم انسانی کے سرمایہ میں اضافہ کیا جائے بلکہ اس خیال سے کہ طالب علم کو تحقیق کا منہاج برتنے کی مشق

(۱) Thomas (۲) Siminel (۳) Ratzenhofer (۴) Tonnies

ہو جائے۔ ہزاروں مسائل ایسے ہیں جن کی طرف مصنفوں اور محققوں نے اشارہ کیا ہے مگر ابھی تک ان کی مفصل اور مکمل تحقیق نہیں کی گئی ہے۔ انھیں طالبِ علم اپنے مطالعہ کا موضوع قرار دے سکتا ہے۔

۲۳۰۔ تحقیق کا میدان

لیکن سچے محقق کی تحقیق کا میدان کتب خانہ کے اندر نہیں بلکہ اس کے باہر ہے جس طرح کیمیا دان معمل میں جاکر تجربے کرتا ہے، ارضیات کا ماہر زمین کا اور حیاتیات کا ماہر حیوانوں کا مشاہدہ کرتا ہے اسی طرح عمرانی کو براہِ راست معاشرے کا مطالعہ کرنا چاہیئے، اس کا کام تجربہ نہیں بلکہ مشاہدہ ہے۔ اس لحاظ سے علومِ اجتماعی میں علوم فطرت سے زیادہ دقت پیش آتی ہے علوم فطرت کا موضوع مادہ ہے جس سے کام لینا آسان ہے جسے معمل میں بیٹھ کر چیر پھاڑ سکتے ہیں۔ خردبین سے دیکھ سکتے ہیں، کیمیاوی طریقے سے تحلیل کر سکتے ہیں۔ مگر معاشرے کے مظاہر کے ساتھ اس قسم کا عمل نہیں کیا جا سکتا۔ معاشرے کے اعضا اور حصے اس قدر پیچ در پیچ ہیں کہ کل معاشرے کا ایک نظر میں مشاہدہ کرنا ناممکن ہے اس لئے عموماً طالب علم کو یہ ضرورت پیش آتی ہے کہ کسی ایک شعبہ کو مطالعے کے لئے منتخب کر لے۔

عمرانیات کے موضوع تحقیق کے دو بڑے حصے کئے جا سکتے ہیں، ایک وہ جس میں معاشرے کی طبیعی نشو و نما سے بحث ہو، دوسرا وہ جس میں غیر طبیعی صورتوں کا مطالعہ کیا جائے۔ پہلے میں اتحادِ عمل پر مبنی معاشرتی زندگی کے مختلف مظاہر صنعت و تجارت، کلیسا، تعلیم، خاندانی زندگی وغیرہ کے متعلق تحقیق کی جاتی ہے مثلاً کسی دیہاتی حلقے یا کان کنی کے مرکز، یا کسی بڑے کارخانہ کا مطالعہ جس میں لوگوں کی صنعتی زندگی، اور عام زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بہ حیثیت عمل معاشرتی کے طبیعی مظاہر کے نظر ڈالی جائے۔ دوسرے میں معاشرے کے عیوب کی جستجو کر کے اُن کی اصلاح کی کوشش کی جاتی ہے اور یہ بھی بڑا اہم کام ہے۔ اجیروں کے مختلف طبقوں مثلاً کان کنوں، کارخانے اور کھیت کے مزدوروں، گودام کے محرروں، خانگی ملازموں اور ماماؤں کے معاشرتی نقائص کا کھوج لگانا چاہیئے۔ اور ان مسائل پر غور کرنا چاہیئے کہ غریبوں کے مکانات کی کیا حالت ہے۔ مزدوروں سے کس طرح کام لیا جاتا ہے، بے قید

شراب خانوں سے اور عام طور پر شراب کی فروخت سے کیا کیا مضر اثرات پڑتے ہیں۔ اسی طرح تادیب خانوں وغیرہ میں لڑکوں کو بغیر پولیس کی نگرانی کے اکٹھا رکھنے کے بُرے نتائج، جیلوں اور حوالاتوں کی حالت، مدارسِ عامہ کی معاشرتی زندگی، بچوں کے مدرسہ سے بھاگنے کے اسباب؛ یہ سب چیزیں عمرانی تحقیق کی موضوع قرار دی جاسکتی ہیں۔

عمرانی تحقیق کا پہلا مقصد تو یہ ہے کہ معاشرے کے صحیح حالات معلوم ہوں اور دوسرا یہ ہے کہ اس میں جو خرابیاں ہوں ان کی اصلاح کی جائے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ طالب علم اصلاحی بستیوں، بچوں کی خبرگیری کرنے والی انجمنوں، مقامی خیراتی اداروں، صنعتی مدرسوں، بے فیس کے کنڈر گارٹن مکتبوں اور رفاہِ عام کی دوسری تحریکوں سے واقفیت حاصل کرے۔ عمرانیات کا مطالعہ کرنے والے نوجوان کا پہلا فرض یہ ہے کہ اپنے کام میں زندگی کی گرمی پیدا کرے۔ اس کا معمل انسانی معاشرہ ہے۔ کتابوں سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ اسے اس بات میں مدد دیتا ہے کہ زندگی کا ایک طبعی معیار اور معاشرتی اداروں کی طبعی مثالیں نظر میں رکھے۔ لیکن محض کتابی علم بغیر عمل تحقیق اور مشاہدہ کے اُسے تخیل پرست بنا دیتا ہے اور اُس کے ذہن میں زندگی کے غلط تصورات قائم کرتا ہے۔ اِس لئے اسے حقیقی معاشرتی حالات کا تھوڑا بہت مشاہدہ کرنا چاہیئے تاکہ علم کے پتلے بے جان میں جان پڑ جائے۔

لیکن جو شخص عمرانیات کا مطالعہ محقق کی حیثیت سے کرنا چاہے اس کا دائرہ عمل اُس سے کہیں زیادہ وسیع ہونا چاہیئے اور اسے ایک معین اور واضح مقصد پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ اسے اپنے مفروضات کی تصدیق کے لئے واقعات کا کافی مواد فراہم کرلینا چاہیئے۔ اس کے بعد اس کی تقسیم اور ترتیب کرسکتا ہے اور اس سے عام نتائج اخذ کرکے عمرانیات کے کلیے قائم کرسکتا ہے۔ بغیر اس کے عمرانیات ایک علم صحیح کی حیثیت نہیں حاصل کرسکتی۔

۳۳۱۔ دوسرے علوم کے معطیات[1]

عمرانی محقق معاشرے کے متعلق ہر قسم کے معطیات جو اس کی تحقیق کے لئے مفید ہوں

[1] Data

بے تکلف استعمال کرتا ہے۔ گو عمرانیات ایک مستقل علم ہے اور اپنا مخصوص دائرۂ نظر رکھتی ہے مگر اکثر دوسرے علوم کے معطیات سے اسے اپنے اصولوں کو جانچنے میں بہت مدد ملتی ہے، عمرانی کو اپنی تحقیق کے قطعی نتائج پر پہنچنے کے لئے حیاتیات، علم الانسان، معاشیات اخلاقیات، تاریخ اور نفسیات کے بہت سے معطیات سے کام لینا پڑتا ہے، اِس طرح اس کا دائرۂ تحقیق بہت وسیع ہو جاتا ہے، اور وہ گویا سارے علم انسانی سے عام نتائج اخذ کرتا ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ عمرانیات میں کل علومِ اجتماعی شامل ہیں یا وہ ان سب کا مرکب یا ان کے نتائج کا مجموعہ ہے بلکہ صرف یہ کہنا مقصود ہے کہ عمرانی دوسرے علوم کے معطیات سے ایک مخصوص اور جداگانہ مقصد کے لئے کام لے سکتا ہے۔

۳۳۲۔ عمرانیات کا دائرۂ تحقیق

وہ ساری چیزیں جنھیں معاشرے کی ابتدائی نشو و نما، ساخت، اور وظائف سے تعلق ہے عمرانیات کے دائرۂ تحقیق میں داخل ہیں۔ اس میں حیوانوں کی زندگی اور انسانوں کی ابتدائی معاشرتی زندگی کا مطالعہ بھی آگیا۔ اِس کا ایک پہلو یہ ہے کہ معاشرتی ارتقاء پر نظر ڈالی جائے اور اجتماع و تفریق کے مختلف طریقے غور سے دیکھے جائیں۔ دوسرا یہ ہے کہ معاشرے کی موجودہ حالت کا یعنی اُس کے مختلف حصّوں شعبوں اور ان کے باہمی تعلقات کا، معاشرتی اعمال اور ان کے باہمی رابطوں کا، معاشرے کے نصب العین اور نفسِ اجتماعی کی جد و جہد کا مطالعہ کیا جائے۔ اِن کے علاوہ اور پہلو بھی ہیں جن کی پوری طرح سے چھان بین کرنا ضروری ہے، آئندہ کا حال بتانا عمرانیات کا کام نہیں ہے لیکن پھر بھی معاشرتی قوتوں کے عمل کو دیکھ کر اور ان قوانین کو معلوم کر کے جو اِس میں کارفرما ہیں یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ موجودہ حالات کا کیا نتیجہ ہونے والا ہے۔

باب دُوم

تحقیق کے طریقے یا منہاج

۳۳۴۔ عمرانیاتی مقصد

عمرانیات کی تحقیق میں چاہے جو منہاج استعمال کیا جائے جب تک کوئی خاص مقصد پیش نظر نہ ہو اطمینان بخش نتائج حاصل نہیں ہو سکتے نہ علوم فطرت کی حالت اس سے کسی قدر مختلف ہے۔ ان کے مطالعے میں مبتدی کی قوت مشاہدہ کی تربیت کے لئے اس سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ کھیت میں یا معمل میں چلے جاؤ اور جو کچھ نظر آئے اسے غور سے دیکھو گو اس کا یہ مشاہدہ اس وقت تک کوئی مستقل قدر و قیمت نہیں رکھتا جب تک اس کے مد نظر کسی خاص بات کا دریافت کرنا یا کسی خاص مفروضے کو ثابت کرنا نہ ہو، مگر عمرانیات کے مشاہدے کا میدان اس قدر وسیع ہے اور معاشرتی مظاہر جو اس کے موضوع ہیں اس قدر پیچیدہ ہیں کہ یہاں بغیر کسی خاص مقصد کے واقعات پر نظر ڈالنا محض تضییع اوقات ہے کبھی یہ مقصد بہت عام ہوتا ہے، مثلاً نفس انسانی کا اتحاد ثابت کرنا جس کے لئے مختلف نسلوں اور قبیلوں کی مثالوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص اس نقطۂ نظر کے بغیر یوں ہی نسلوں اور قبیلوں کی نفسیاتی خصوصیات پر غور کرے تو وہ عمر بھر کسی معیّن نتیجہ پر نہیں پہنچ سکے گا، کبھی تحقیق کا مقصد مقابلتاً محدود ہوتا ہے۔ مثلاً امریکا کے مزدوروں کا مسئلہ۔ یہاں مفید نتائج حاصل کرنے کے لئے مطالعے کا دائرہ تنگ کر کے صرف ان مسائل پر غور کرنا چاہیئے کہ دکانیں کیوں بند کی جاتی ہیں، ہڑتال کے غیر طبعی عناصر کیا ہیں اور اس پر یونین[۱] کی رکنیت کا کیا اثر پڑتا ہے۔ غرض جب تحقیق کا مقصد معیّن ہو جائے تو دوسری چیزوں سے قطع نظر کر کے صرف ان واقعات سے

۱۔ مزدوروں کی انجمن۔

سروکار رکھنا چاہئے جو اس سے متعلق ہیں۔

۳۳۴۔ مظاہر کے مطالعے کو محدود کرنا

عمرانیاتی تحقیق میں کامیاب ہونے کے لئے یہ بہت ضروری ہے کہ صرف اُن واقعات پر غور کیا جائے جو مقصدِ تحقیق کے لئے مفید ہیں۔ مثال کے طور پر اس مسئلے کو لیجئے کہ مشترکہ مدارس میں کالی اور گوری نسل کے لڑکوں کی حالت میں کیا فرق ہے۔ دونوں قسم کے لڑکوں کے متعلق بہت سی معلومات جمع کی جا سکتی ہے۔ لیکن زیادہ مناسب یہ ہے کہ ہم اپنے مطالعے کو دونوں کی رفتارِ ترقی کے مقابلے تک محدود رکھیں اس کے لئے بھی وسیع تحقیق کی ضرورت ہے سب سے اہم بات یہ ہے کہ دونوں نسلوں کی ذہنی قابلیت کا انصاف کی نظر سے موازنہ کیا جائے۔ جب تحقیق کا عمرانیاتی مقصد معیّن ہو گیا۔ یعنی دونوں نسلوں کی ذہنی صلاحیت کا مقابلہ کرنا تو اب اس کی ضرورت ہے کہ ہر ایک کے معاشرتی ماحول بلکہ ساری معاشرتی زندگی کو غور سے دیکھا جائے۔ پہلے کنڈر گارٹن کی منزل کو لیجئے۔ یہاں یہ نظر آتا ہے کہ کالی نسل کے لڑکے ذہانت میں اور پڑھنے لکھنے میں گوری نسل کے لڑکوں سے کم نہیں ہوتے۔ لیکن آگے کے درجوں میں سابق الذکر کی قابلیت اور رفتارِ ترقی کم ہوتی جاتی ہے اس بات کا اندازہ کرنے کے لئے کہ یہ نسلی خصوصیات کا اثر ہے یا ماحول کا ہمیں دونوں کی گھریلو زندگی اور گرد و پیش کے حالات معلوم کرنے پڑیں گے، ان سب چیزوں کا غور سے مطالعہ کرنے کے بعد اس کا صحیح اندازہ ہو جائے گا کہ دونوں کی ذہنی قابلیت میں باہم کیا نسبت ہے، یہاں ذہنی قوتوں کو کیف و کم دونوں کے لحاظ سے جانچنا چاہئے۔ اس تحقیق میں موضوع کے متعلق ہزار ہا واقعات سامنے آتے ہیں لیکن ضرورت اس کی ہے کہ ہم سوائے ان چیزوں کے جن سے مطلوبہ نتائج حاصل کرنے میں مدد ملے اور سب سے قطع نظر کر لیں۔

تحقیق و تفتیش کے عمل میں رد و قبول دونوں سے کام لیا جاتا ہے۔ ہر قدم پر مناسب معطیات کا انتخاب کرنا پڑتا ہے، ورنہ آگے بڑھنا مشکل ہو جائے۔ بعض واقعات بالکل نظر انداز کر دئے جاتے ہیں اور بقیہ میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ قدر و قیمت کے لحاظ سے کون مقدم ہیں اور کون موخر۔ اگر کوئی شخص سیبوں کے متعلق کوئی بات

دریافت کرنا چاہتا ہے تو اُس کی یہ حرکت بالکل فضول ہوگی کہ اپنی ٹوکری میں سیبوں کے ساتھ گلاس[1] ناشپاتیاں، انگور اور شفتالو بھی اِس خیال سے بھرے کہ یہ بھی پھلوں میں شامل ہیں۔ اسی طرح اعداد و شمار کے معاملے میں ہر موضوع کے معطیات مختلف ہوتے ہیں۔ اگر کسی شخص کو مزدوروں کے موضوع پر بہ ہیئت مجموعی غور کرنا ہے تو اُسے اِس تحریک کی تاریخ اور نشو و نما کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ لیکن اگر اسے صرف ایک مسئلہ کی تحقیق کرنا ہے مثلاً دو قوموں یا پیشوں یا جماعتوں کی اجرت کی باہمی نسبت معلوم کرنا ہے تو اُسے کوئی ضرورت نہیں کہ ہڑتالوں، مقاطعوں، وغیرہ کے متعلق بے شمار واقعات پر غور کرنے میں سر کھپائے۔ وہ ان سب کو چھوڑ کر محض اِس چیز کو لے گا کہ جن جماعتوں کا مقابلہ کرنا ہے ان کی وضعی اور اصلی اجرت کیا ہے اِس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیئے کیونکہ لوگ واقعات کو بے پروائی سے جمع کرنے اور بلا امتیاز استعمال کرنے کی وجہ سے اکثر غلط نتائج پر پہنچتے ہیں۔

۲۳۵۔ عمومی تحقیق

تحقیق کا سب سے سادہ طریقہ عمومی موضوع کے مطالعے میں استعمال ہوتا ہے۔ طالب علم کو کسی خاص معاشرے یا جماعت کے متعلق جتنے واقعات مل سکتے ہیں سب کو جمع کر کے ان کی تقسیم اور ترتیب کرنا ہے۔ یہ محض بیانی چیز ہے اور اس کا مقصد معاشرے کی زندگی کے اصول دریافت کرنا نہیں بلکہ حقیقت حال کو ظاہر کرنا ہے، کوئی گاؤں، قصبہ، شہر کوئی اشتراکی جماعت یا مزدوروں کی خاص جماعت۔ موضوع تحقیق بنائی جاسکتی ہے۔ اُس جماعت کی کل معاشرتی خصوصیات قلم بند کر لی جائیں۔ لوگوں کے پیشے، آمدنی، مذہب، تعلیم، تفریح، طرز معاشرت، سیاسی تنظیم اور حکومت کا تفصیل سے ذکر کیا جائے۔ کولرو وٹو یا یلو اڈا کی کسی کان کنوں کی چھاونی کا اِس طرح مطالعہ کیا جائے تو دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، یہ کام بھی بجائے خود مشکل ہے مگر عمرانیاتی تحقیق میں اِس سے سہل اور کوئی چیز نہیں ہے۔ مبتدیوں کے لئے یہ خاص طور پر مفید ہے کیونکہ اس کے ذریعے سے وہ معاشرے کی ماہیت اور ساخت سے واقف ہو جاتے ہیں۔

[1] Cherries

۳۳۶۔ خصوصی تحقیق

اس کے بعد اسی طریقہ تحقیق کے مطابق کسی محدود موضوع کا مطالعہ کرنا چاہیئے جو بہت سے واقعات پر حاوی ہو مثلاً ریاست ہائے متحدہ میں افلاس کے اسباب یا زر کی مقدار گردش کا تعلق اشیاء کی قیمتوں سے زیادہ مشکل موضوع ہوگا جس کا میدان اور بھی محدود ہو مثلاً گائے کے گوشت کی شرکت تجارہ قائم ہونے کا اثر اس کی قیمت پر یا کنساس کے جیل خانوں کی حالت یا کریپل کریک میں کان کنوں کی ہڑتال۔ اس قسم کے موضوع پر کوئی مفید تحقیق کرنے کے لئے اس کی ضرورت ہے کہ خاص اس کے متعلق جتنے واقعات ہوں نہایت صحت کے ساتھ جمع کئے جائیں، ان میں کا ایک دوسرے سے مقابلہ کیا جائے اور منطقی اعمال کے ذریعے سے نتیجے نکالے جائیں۔

۳۳۷۔ خصوصی منہاج

معاشرتی مسائل کی تحقیق میں استقرائی منہاج اور استخراجی منہاج دونوں سے کام لینا پڑتا ہے۔ عمرانیاتی منہاج کی بنیاد یہ ہے کہ ایک خاص مقصد کو مدنظر رکھ کر واقعات جمع کئے جائیں۔ لیکن یہ علم اس وقت تک بیکار ہے جب تک اس کی تقسیم و ترتیب نہ ہو اور اس سے عام اصول اور کلیے اخذ نہ کئے جائیں اور علوم کی طرح یہاں بھی استدلال کے سلسلے میں استقراء اور استخراج دونوں آجاتے ہیں۔

ان کے علاوہ تحقیق کے بعض خصوصی منہاج ہیں جن کا انتخاب محقق کے نقطۂ نظر پر موقوف ہے۔ ان میں سب سے اہم سکونی، حرکی اور شماری[1] منہاج ہیں پہلے میں معاشرے یا اس کے کسی حصے کے اجزاء اور ان کے تعلقات پر ایک ہی وقت میں نظر ڈالی جاتی ہے اور تغیر یا ترقی سے بحث نہیں ہوتی۔ چونکہ معاشرے میں ہمیشہ تغیر ہوتا رہتا ہے، اس لئے یہ منہاج گویا ایک مفروضے پر مبنی ہے۔ سکونی منہاج

[1] Statistical

کے استعمال کی ایک عمدہ مثال ریاست ہائے متحدہ کی مردم شماری ہے صرف آبادی کی صحیح تفصیلات مُہیا کرنے میں اُس محکمے کے ناظم کو باوجود انتہائی عجلت سے کام کرنے کے کئی مہینے لگ جاتے ہیں۔ اس عرصے میں ورود اور خروج ولادت اور موت کے ذریعے سے آبادی میں تغیر واقع ہوتا ہے اور مردم شماری سے لوگوں کی موجودہ تعداد نہیں بلکہ سابق تعداد معلوم ہوتی ہے، یہی صورت ہر قسم کے اعداد وشمار کی ہے۔ معاشرے کی دائمی حرکت، اس کے پیہم تغیر، ترقی اور تنزل کے سبب سے کسی خاص لمحہ میں معاشرے کی صحیح حالت معلوم کرنا ناممکن ہے، ہاں اگر کوئی معاشرتی بائسکوپ ایجاد کیا جائے تو شاید معاشرے کی سچی تصویر نظر آسکے۔

حرکی منہاج میں معاشرے کی دائمی حرکت کا لحاظ رکھا جاتا ہے اور اس کی غرض یہ ہے کہ معاشرتی قوتوں کی رفتار اور ان کے نتائج کو دکھائے، یہ اصل میں بہت سی سکونی تصویروں کے سلسلے کو قدرتی ترتیب کے ساتھ پیش کرتا ہے، اس میں اِس قسم کے مسائل کی تحقیق ہوتی ہے، جیسے مزدوری کا گھٹنا، بڑھنا قیمتوں کا اتار چڑھاؤ، جرایم یا خودکشی کی کمی بیشی، اخلاق کی نشو ونما، جنگجوئی کے جذبے کا انحطاط یعنی ہر چیز کی حرکت اور تغیر ایک مقررہ وقت کے اندر۔ اس کی کامیابی بڑی حد تک موضوع بحث کی منفرد ساکن تصویروں کی صحت پر موقوف ہے۔ معاشرے کا صحیح تصوّر یہی حرکی تصور ہے، اس لئے بغیر حرکی منہاج سے کام لئے معاشرے کو پوری طرح سمجھنا ناممکن ہے۔

شماری منہاج مذکورہ بالا طریقوں میں سے ہر ایک کے ساتھ استعمال ہو سکتا ہے۔ اِس میں یہ کوشش کی جاتی ہے کہ معاشرے کی قوتوں اور اقدار کی پیمایش اعداد کی شکل میں کی جائے۔ اس کا بنیادی اصول شمار کی صحت ہے پہلا کام ایک واحدے کا معیّن کرنا ہے۔ اور دوسرا اس کو ایک خاص وقت اور خاص مقام کے اندر شمار کرنا، اس کی سیدھی سی مثال یہ ہے کہ اگر ہم ایک چاک کی بتّی کو ہتھوڑے سے پاش پاش کر دیں اور پھر پوچھیں کہ اب اس کے کتنے ٹکڑے ہوگئے تو پہلی چیز یہ ہے کہ ٹکڑے کا مفہوم معیّن کر لیا جائے کیونکہ ٹکڑے میں خفیف ذرے سے لے کر

گولی کے برابر پارے تک سبھی شامل ہیں۔
معاشرتی مظاہر کے شمار میں سب سے مشکل شمار کے واحدے کا تعیّن کرنا ہے۔ مثلاً اگر ہم ریاست ہائے متحدہ کے دیسیوں یا حبشیوں کو شمار کرنا چاہیں تو یہ نہایت اہم چیز ہے کہ حبشی یا دیسی امریکی کی خصوصیات معین کر لی جائیں۔ مثلاً اگر کسی شخص کے خون میں بتیسواں حصّہ حبشی یا دیسی امریکی کے خون کا ہے تو اس کا شمار کس نسل میں ہوگا؟ اگر اجرت کے مسئلہ کی تحقیق کرنا ہو تو اس کا تعین ضروری ہے کہ اجیر کس کو کہیں گے آیا روزانہ یا ہفتہ وار یا ماہوار یا سالانہ اجرت پانے والوں میں سے کسی ایک کو یا ان سب کو جب واحدے کا تعین ہو جائے تو پھر یہ دیکھنا چاہیے کہ یہ ایک خاص وقت یا خاص رقبے کے اندر کس تعداد میں پایا جاتا ہے۔
شماری منہاج کے ذریعے سے معاشرتی قوتوں کی پیمائش کر کے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مقررہ وقت اور مقررہ رقبہ کے اندر فلاں کام کس حد تک ہو سکتا ہے۔ مثلاً یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ مزدوروں کی جماعت کی کارکردگی میں فلاں نئی ایجاد کے استعمال سے کتنا اضافہ ہو جائے گا۔ اسی اصول کے مطابق تجارتی بازار کی رپورٹوں سے قیمتوں کی اور فصل کی کمی بیشی کا اندازہ کیا جاتا ہے۔

۲۲۸۔ تحلیل

واقعات اور معلومات کا اگر معقول استعمال نہ کیا جائے تو وہ محض بیکار ہیں، ان سے معاشرتی تعلقات یا معاشرتی ترقی کے متعلق نتائج نکالنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ان کی اچھی طرح تحلیل کی جائے۔ پھر بھی جو نتائج حاصل ہوتے ہیں وہ بالکل یقینی نہیں کہے جا سکتے۔ تو صحیح معلومات اور مکمل اعداد و شمار حاصل کرنے میں اور پھر انھیں عملی طریقوں سے استعمال کرنے میں اس قدر دشواریاں ہیں کہ اُن سے جو آخری نتیجہ نکلے اس کی صحت محدود ہوتی ہے، مثلاً ریاست ہائے متحدہ کی مردم شماری کے اعداد بہت مفید اور قابل قدر

ہیں مگر پھر بھی بالکل صحیح نہیں بلکہ تخمینی ہیں۔

تاہم طالب علم معاشرے کی واقعی حالت کا اندازہ کرنے کی جتنی زیادہ کوشش کرے اسی نسبت سے اس کی واقفیت معاشرے کی عملی قوتوں سے بڑھتی جاتی ہے۔ اور اس کا مطالعہ مفید اور کارآمد ہوتا جاتا ہے۔

حصۂ ہفتم

تاریخ عمرانیات

حصۂ ہفتم
تاریخ عمرانیات
باب اوّل
فلسفۂ اجتماع
۳۳۹- عمرانیات کی تاریخی نشوونما

عمرانیات کو پوری طرح سمجھنے کے لئے اس کی نشوونما سے واقف ہونا ضروری ہے یعنی ان خیالات کی تاریخ سے جو معاشرے کی متعلق قائم کئے گئے اور جن سے علم عمرانیات کی تدوین میں محسوس یا غیر محسوس طور پر مدد ملی۔ اس کتاب میں اتنی گنجائش نہیں کہ ان سب تاریخی اسباب و موثرات کا ذکر کیا جائے جن کی بدولت عمرانیات وجود میں آئی یا اس کے کل نظریوں اور مذہبوں پر تفصیلی نظر ڈالی جائے، البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ جن لوگوں نے اس کی تدوین میں حصہ لیا ہے، ان میں سے چند منتخب اشخاص کے خیالات کا خلاصہ بیان کر دیا جائے۔ اس موضوع پر پوری طرح عبور حاصل کرنے کے لئے فلسفیوں اور سائنس دانوں کی تصانیف کا مطالعہ کرنا چاہئے تاکہ ہر ایک کا نقطۂ نظر معلوم ہو اور اس کے خیالات کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو سکے

اس مسئلہ پر تاریخی نقطۂ نظر سے غور کرتے وقت یہ ملحوظ رہنا چاہئے کہ معاشرے کی نشوونما انسانی زندگی کے ابتدائی زمانے سے جاری ہے۔ مگر علم عمرانیات کی بنا تھوڑے ہی دن پہلے قائم ہوئی ہے، البتہ فلسفیانہ حیثیت سے معاشرتی زندگی پر غور کرنے والے شعور اجتماعی کے آغاز کے بعد ہر زمانے میں پیدا ہوتے رہے، معاشرتی ارتقا کے دوران میں ارباب فکر نے حکومت، قانون، مذہب اور عام نظم اجتماعی کے بہت سے اصول ترتیب دیے، ابتدا میں ان لوگوں کا موضوع قلم زیادہ تر کسی خاص جماعت یا قوم کا عملی نظم یا حکومت ہوتی تھی،

عام نظریے قایم کرنے کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ تاہم انھیں عملی تجربوں کی بدولت معاشرتی لائحۂ عمل نے نشو و نما پائی اور عام نظریوں اور نظاموں کی داغ بیل پڑی۔

عمرانیات کی ارتقاء میں جن خیالات نے مدد دی ان کی تین قسمیں ہیں

(۱) معاشرتی نظم کی عملی تجویزیں۔

(۲) فلسفیوں کے نظری نظام۔

(۳) سائنس دانوں کی تحقیق اور منطقی تدوین جس سے علم عمرانیات کی مستقل بنا قایم ہوئی۔

یہ اصناف خیال زمانی ترتیب سے یکے بعد دیگرے ظاہر نہیں ہوئیں بلکہ تینوں کم و بیش ہر زمانے میں دوش بدوش موجود رہیں ہم اُن میں سے ہر ایک کی چند اہم ترین مثالوں پر اکتفا کریں گے، کیونکہ ہمیں یہاں نظریۂ معاشرت کی مفصل اور مکمل تاریخ بیان کرنا مد نظر نہیں۔

۳۴۰۔ نظم اجتماعی کا عملی تجربہ کرنے والے ارباب فکر

حکومت کے نظری نظام مرتب کرنے والے تو بہت ہوئے ہیں لیکن ایسے لوگ بہت کم گزرے ہیں جنھوں نے نظم اجتماعی کی اصلاح و ترقی کے عملی تجربے کئے۔ اِن میں سب سے ممتاز حضرت موسیٰ۔ لکرگس۔ سولن۔ سرویس ٹیولیس، شارل اعظم امریکا اور فرانس کے انقلاب پسند اور رابرٹ اوون، لوئی بلان اور اسٹین کا یلے ہیں، عہد قدیم کے واضعان قوانین گو ان کے ضابطے مروجہ قانون اور رسم و دستور پر مبنی تھے، اعلیٰ درجے کی تنظیمی قوت رکھتے تھے اور نظم معاشرت کے نئے اصول وضع کرکے لوگوں سے ان پر عمل کراتے تھے۔ چنانچہ عبرانی سلطنت اس ضابطۂ اجتماعی پر قایم تھی جو یہودیوں کے شارع اور پیشوا حضرت موسیٰ نے ترتیب دیا تھا، اس کا مقصد سیاسی معاشرتی، اور صنعتی انصاف تھا اور چونکہ اِس کا تعلق ایک نیم مہذب قوم سے تھا اِس لئے اخلاق و ادب کی جزویات تک پر حاوی تھا۔ یہ ضابطہ اُس زمانے میں بنا جب نسلی معاشرہ قومی معاشرے

کی شکل اختیار کر رہا تھا، گو اس میں مختلف طبقوں کا وجود تسلیم کیا گیا ہے مگر ہر طبقے کے حقوق کا یکساں لحاظ رکھا گیا ہے اور ہر فرد کو نظامِ اجتماعی میں مناسب جگہ دی گئی ہے۔ عبرانی سلطنت کے ضابطۂ قانون میں عمرانیاتی اصول حکومت کا جتنا رنگ پایا جاتا ہے کسی اور قانون میں نظر نہیں آتا، یہاں قانون نے تمام معاشرتی تعلقات وضاحت کے ساتھ معین کر دئے ہیں۔ فرد کو حقوق ضرور دئے گئے ہیں۔ مگر یہ بات ہر جگہ مدنظر رکھی گئی ہے کہ وہ ہیئتِ اجتماعی کے ماتحت ہے۔ وہ ایک محدود دائرے کے اندر آزاد ہے، لیکن اس سے باہر قدم رکھتے ہی دوسروں کے حقوق میں مداخلت ہو جاتی ہے۔ غرض موسوی ضابطہ محض عبرانیوں کے قوانین کا مجموعہ ہی نہیں، بلکہ معاشرتی زندگی کا ایک ایسا تجربہ ہے جو جس میں جسم اجتماعی کا وجود تسلیم کیا گیا ہے، اس کا آیندہ زمانے کے طرز ہائے حکومت خصوصاً فلسفۂ سیاست و معاشرت پر بہت کچھ اثر پڑا۔

لکرگس کے قوانین میں جو اہل اسپارٹا کے رسم و دستور پر مبنی تھے، یہ مقصد مدِ نظر رکھا گیا تھا کہ ایک نیا نظمِ حکومت قایم کیا جائے جس میں فرد بڑی حد تک ہیئتِ اجتماعی کے ماتحت ہو۔ اسی طرح سولن کے قوانین نے قدیم نسلی معاشرے کو بدل کر جمہوری معاشرہ قایم کیا، اس لئے یہ بھی ایک حد تک نئے تجربے کی حیثیت رکھتے تھے۔ لیکن یہ بات نہ بھولنا چاہئے کہ سب قدیم واضعانِ قوانین نے اپنے ضابطوں کی بنا اپنے عہد کے مروجہ رسم و دستور کے بہترین اصولوں پر رکھی ہے۔ تاہم ان میں سے بعض نے موجودہ قوانین کو بنیاد قرار دے کر ایسی عملی اصلاحیں کیں کہ نظامِ معاشرت میں کایا پلٹ ہو گئی، اس کی مثال سروِیس ٹیولیس کے قوانین ہیں جس نے شہر روما کی تنظیم فوجی اصول پر کر کے پہلے پہل قدیم نسلی جماعت بندی کو توڑا۔ اس کے بعد روما میں جو ملکی قوانین بنائے گئے وہ حکومت کے عملی تجربے کہے جا سکتے ہیں۔ اسطرح کے جتنے تجربے معاشرے کی اصلاح کے لئے کئے گئے ان سب کا حکومت کے نظریے اور عمل پر بہت اثر پڑا، جب شارلِ اعظم نے مغربی یورپ کو فتح کیا تو اس نے ملازمانی تعلیمی صیغوں میں اصلاح کی کوشش کی۔ اگرچہ اس کی اصلاحیں زیادہ دن

جاری نہیں رہیں اور آگے چل کر ان کی مسلسل نشو و نما نہ ہوسکی پھر بھی وہ بڑی تاریخی اہمیت رکھتی ہیں اور ان سے اِس کا اندازہ ہوتا ہے کہ حکومت معاشرے کی اصلاح کے لئے کیا کچھ کرسکتی ہے۔

رابرٹ اوون یہ چاہتا تھا کہ صنعتی اصول پر معاشرے کی ازسرِ نو تنظیم کرے اور اُس نے نیو لانارک میں اپنی تجویز کا عملی تجربہ کیا۔ گویہ تجربہ آخر میں ناکامیاب ثابت ہوا مگر اس سے امدادِ باہمی کی تحریک پر جو اثر پڑا اور اس سے جو تقویت پہنچی وہ مستقل اہمیت رکھتی ہے۔ زمانۂ حال کے تجربہ کرنے والے جیسے کابے اور لوئی بلان اور مختلف اشتمالی جماعتوں کے لوگ معاشرے کی تنظیم جدید کی ناقص کوششوں کا نمونہ پیش کرتے ہیں اور ہمیں اُن کی کامیابی سے نہیں بلکہ ان کی ناکامی سے بھی سبق حاصل ہوتا ہے، اِن سب لوگوں سے یہ فائدہ پہنچا کہ انسانی معاشرے کی ماہیت اور اس کی ترقی اور اصلاح کے حدود ظاہر ہوگئیں۔ اِس طرح کے تجربے یہ ثابت کرتے ہیں کہ لوگوں کو قوم کی معاشرتی وحدت کا احساس ہے اور ان میں شعور اجتماعی موجود ہے۔ ان سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ معاشرے میں ایک بامقصد قوت کارفرما ہے۔ جس کی بنا پر اس کا نظم و ضبط معینہ اصول و تجاویز کے مطابق ہوتا ہے اس کے علاوہ ان سے عمرانیات کے مطالعے کی تحریک پیدا ہوئی اور معاشرے کی نامیاتی وحدت کے دریافت ہونے سے نظمِ اجتماعی کے اصول مرتب کرنے میں مدد ملی۔

۳۴۱-عہدِ قدیم کے فلسفی

بعض قدیم فلسفیوں نے نظمِ حکومت اور تنظیم معاشرت کے مہتم بالشان نظریے قایم کیے جن کا لوگوں کے خیالات پر بڑا زبردست اثر پڑا اور انھیں معاشرے کی حقیقت اور نظمِ اجتماعی کے طریقوں پر غور و فکر کا شوق پیدا ہوا۔ اِس خاص معاملہ میں افلاطون کے فلسفہ کا دائرۂ اثر اور سب عینی نظاموں سے بڑھا ہوا تھا۔ یہ توقع تو بہ ظاہر اسے بھی نہ تھی کہ جو اصول اس کی "ریاست" میں بیان کیے گئے ہیں وہ عمل میں لائے جائیں گے۔ البتہ انھوں نے جدید زمانے میں

میں لوگوں کے خیالات پر بہت کچھ اثر ڈالا۔

ارسطو کی "سیاسیات" کا اثر نظریۂ اجتماعی پر اس سے بالکل مختلف تھا۔ یہ کتاب نظم معاشرت کا کوئی عینی نظام پیش نہیں کرتی بلکہ سیاست مدن کے موضوع پر لکھی گئی ہے۔ اِس حیثیت سے یہ قرونِ وسطیٰ میں مغربی یورپ کے سیاسی خیالات پر حاوی رہی۔ اس میں سیاست کا حقیقی فلسفہ بیان کیا گیا تھا جو بہترین تاریخی مثالوں پر مبنی تھا، جہاں کہیں لوگ اسے پڑھتے تھے انھیں معاشرے کی حقیقت اور حکومت کے حقوق و فرائض پر غور و فکر کرنے کا شوق پیدا ہوتا تھا۔

اِسی طرح سسرو نے اپنے فلسفۂ ریاست سے اور جسٹینین نے اپنی کوڈیکس (بیاض) سے علمی دنیا کو رومی نقطۂ نظر سے نظام اجتماعی کے مسائل کی طرف متوجہ کیا۔ اہل روما حکومت کے معاملات میں عملی پہلو پر زور دیتے تھے اور انھوں نے قوانین کے وضع کرنے میں اور نظم حکومت قائم کرنے میں اس قدر کامیابی حاصل کی کہ آئندہ زمانے کے فلسفے پر ان کا رنگ چھا گیا۔ یہی نہیں کہ بعد کی اکثر حکومتوں نے ان کے قوانین اور اصولِ حکومت اختیار کئے بلکہ قرونِ وسطیٰ اور عہد جدید کے مقننوں، مؤرخوں اور فلسفیوں کی تصانیف بھی رومیوں کے معاشرتی اور سیاسی تصورات سے بھری پڑی ہیں۔ خصوصاً ابتدائی ٹیوٹانی (جرمانی) ریاستوں میں ہر جگہ حقوق ملکیت کے تعین اور نظمِ حکومت میں رومیوں کی تقلید نظر آتی ہے۔

ٹیوٹانی قوموں نے رومی قانون اختیار کرنے سے پہلے اصولِ حکومت کے انضباط میں بہت کم ترقی کی تھی۔ ان کی معاشرتی زندگی پر عملی رنگ غالب تھا اور ان کا ضابطۂ قانون بالکل سیدھا سادا تھا شاید الفریڈ اعظم نے ایک عینی نظام حکومت مرتب کرنے کی تھوڑی بہت کوشش کی تھی۔ تاہم ٹیوٹانی قوموں کی عملیت پسند زندگی نے فلسفۂ معاشرت پر بہت اہم اثر ڈالا ہے۔

۲۴۳۔ قرونِ وسطیٰ کے فلسفی

عہدِ قدیم کے فلسفیوں کا مقصد نسلی معاشرے کو قومی یا عمومی معاشرے کی صورت میں تبدیل کرنا تھا۔ قرونِ وسطیٰ کے فلسفی شاہی نظامِ حکومت کی خرابیوں کے خلاف احتجاج کرتے تھے جو جاگیرداری نظام کے درہم برہم ہونے کے بعد قایم ہوا تھا۔ ٹیوٹانی قوموں میں رومی شہنشاہیت کا اصول اُس وقت پہنچا جب وہ خانہ بدوشانہ قبائلی زندگی کو چھوڑ کر حضری زندگی اختیار کر رہے تھے۔ رومیوں اور ٹیوٹانیوں کے اصولِ حکومت کے ملنے سے جاگیرداری نظام پیدا ہوا۔ اِس کے انحطاط کے بعد خالص رومی اصولِ حکومت رائج ہوا لیکن حالاتِ زمانہ کے اقتضا سے اِس میں بعض اساسی تبدیلیاں کرنا پڑیں۔ چوتھی صدی میں عیسوی کلیسا کا اصولِ اخوت اِس قدر مستحکم ہو چکا تھا کہ وہ قدیم شہنشاہی نظام کا جو بادشاہوں کی خود غرضی اور مسلمہ عدمِ مساوات پر مبنی تھا زبردست حریف بن گیا۔ اِس نے قدیم طرزِ حکومت کی مخالفت شروع کی اور موجودہ ناقص زندگی کے مقابلے میں مکمل کلیسائی معاشرے کی خیالی تصویر پیش کی۔ اغسطین مقدس نے "مدینۃ اللہ" کے نام سے ایک کتاب لکھی اس میں برادرانہ محبت اور کامل مساوات پر مبنی مسیحی ریاست کا خاکہ تھا۔ آگے چل کر اس حکومتِ الٰہی کے خیال کو بہت سے لوگوں نے دہرایا۔ یہ ایک حد تک قدیم عبرانی حکومت کے اصول سے مشابہ تھا۔ جنیوا کی ریاست میں جہاں تک انسانی سعی سے ممکن تھا۔ اِس مدینۃ اللہ کا نمونہ دکھایا گیا۔ اغسطین مقدس کے قلم میں بڑا زور تھا اور اس کی تصانیف کا نہ صرف زمانۂ مابعد کی دینیات پر بلکہ بالواسطہ عہدِ جدید کے ابتدائی دور کی معاشرتی اصلاحوں پر بہت اثر پڑا۔ قرونِ وسطیٰ کے اکثر مصنفوں کا مقصد یہی تھا کہ حکومت میں مذہب عیسوی کے نقطۂ نظر سے اصلاح کی جائے۔

بعض مصنفین مثلاً سر ٹامس مور، کمپینیلا، ڈانٹے اور مکیاولی نے جن کی روش قرونِ وسطیٰ اور عہدِ جدید دونوں کے اربابِ فکر سے جدا تھی، حکومت کے عینی نظام مرتب کیے، اِن کا مقصد یہ تھا کہ قرونِ وسطیٰ کے ناقص

طرزِ حکومت کے مقابلہ میں، جو کبھی مفید ہو گا مگر اب ضرورتِ زمانہ کے مطابق نہیں رہا تھا، کامل ریاست کی خیالی تصویر پیش کریں۔ مکیاولی کی کتاب "بادشاہ" میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ فلسفۂ حکومت اور اصولِ حکومت کے منتشر خیالات کو جمع کرکے اُن کی بنا پر ایک نیا شہنشاہی نظام ترتیب دیا جائے۔ اِس تصنیف کی قدر اِس وجہ سے ہوئی کہ اس نے اصلاحِ حکومت کی ضرورت کا احساس پیدا کیا، نہ کہ ان عملی تجاویز کی بناء پر جو اُس میں پیش کی گئی ہیں۔ دانٹے کی "سلطنت" میں بھی کہیں کہیں شہنشاہی نظام کی جھلک نظر آتی ہے مگر اس کی خرابیاں دینِ عیسوی کے اصولوں کی برکت سے دور کر دی گئی ہیں یا ان دونوں (میکیاولی اور ڈانٹے) سے کہیں زیادہ ٹامس مور کے خیالات کا اثر فلسفۂ اجتماع پر پڑا۔ مور کی "یوٹوپیا" جو افلاطون کی "ریاست" کے بعد مکمل ریاست کی خیالی تصویروں میں سب سے ممتاز ہے عہدِ جدید کی ابتدا میں لکھی گئی۔ اس کے لکھنے کی اصل غرض قرونِ وسطیٰ کے بگڑے ہوئے طرزِ حکومت کی تنقید تھی، جو ان دنوں انگلستان میں رائج تھا۔ مور نے اپنے زمانے کی ناقص اور غیر متدین حکومت کا مقابلہ ایک خیالی حکومت سے کیا جو سیاسی، صنعتی اور معاشرتی مساوات پر مبنی تھی اور اس آڑ میں سیاست و معاشرت کی موجودہ خرابیوں پر بڑی سختی سے حملے کئے۔ اِس کا لازمی اثر یہ تھا کہ لوگوں کے ذہن میں نظمِ اجتماعی اور حکومت اور معاشرت کے مقصد کا ایک نیا تصوّر پیدا ہو گیا۔

کمپنیلا کی "مدینۃ الشمس" میں جو سترھویں صدی کے شروع میں لکھی گئی تھی، پہلے پہل اشتراکی نظام کا ایک مکمل خاکہ پیش کیا گیا۔ اگرچہ یہ مور کی "یوٹوپیا" کے پائے کی کتاب نہیں ہے مگر اس میں یہ خصوصیت ہے کہ معاشرے کے اشتراکی یا اشتمالی تصوّر کی حامی ہے۔ اِس میں ایک شہر کی خیالی تصویر ہے جو تنظیم اور انضباط کا کامل نمونہ ہے۔ حکومت کی بنیاد مساوات پر اور جماعت کے مفاد کے لیے افراد کے حقوق قربان کر دینے پر رکھی گئی ہے۔ کمپنیلا، ارسطو کے فلسفے کا مخالف ہے اور اس کی کتاب افلاطون کی ریاست ہے

اس نے اشتراکیت کے نظریے کو علمی بنیاد پر قایم کر دیا۔

ریاست کے اُن عینی نظاموں نے جو اربابِ فکر نے مرتب کیے تھے حکومت کے علمی اصول واضح کر دئے اور دنیا کو یہ بتادیا کہ اس زمانہ کے حکمراں عدل و انصاف اور فلاح عامہ سے کس قدر دور تھے۔ انھوں نے اِس بات پر بھی توجہ دلائی کہ صنعتی اور معاشرتی زندگی کی تنظیم حکومت کے فرائض میں داخل ہے۔ اگرچہ مور اور کمپنیلا نے حکومت کا جو خاکہ کھینچا ہے وہ کبھی پوری طرح علمی جامہ نہیں پہن سکتا لیکن انھوں نے کامل انصاف کا جو خواب دیکھا ہے اس کا ایک نہ ایک دن پورا ہونا ریاستوں اور معاشروں کی بقا کے لیے ضروری ہے۔ اس کے علاوہ ان کی تصانیف نے یہ ثابت کر دیا کہ معاشرتی زندگی کے مسائل فلسفیوں کے غور و فکر کے لایق ہیں۔

۳۴۳۔ عہد جدید کے فلسفی

قرون وسطیٰ اور عہد جدید کے فلسفے میں جو فرق ہے وہ زمانہ کے لحاظ سے نہیں بلکہ خیالات کے لحاظ سے ہے۔ اِس لیے ایک کے ختم ہونے اور دوسرے کے شروع ہونے کا کوئی زمانہ معیّن نہیں کیا جاسکتا۔ بیکن کی "نئی اٹلانٹس" جو سترھویں صدی کے شروع میں تصنیف ہوئی خیالات کے لحاظ سے مور کی "یوٹوپیا" اور کمپنیلا کی "مدینۃ الشمس" کے زمرے میں داخل ہے۔ مگر چونکہ بیکن کا مجموعی فلسفہ جدید علمی دور کا دیباچہ سمجھا جاتا ہے اور یہ کتاب اس کا ایک جز ہے۔ اِس لیے اس کا شمار فلسفۂ جدید میں کیا جاتا ہے۔ اس کا اصل مقصد اشتراکیت کے تجربے کرنا نہیں بلکہ فلسفے کا ذوق پیدا کرنا اور ریاست کو ترقیِ علوم و فنون کے فرض کی طرف توجہ دلانا ہے۔ بیکن کا عقیدہ تھا کہ علمی ترقی سے معاشرتی زندگی بہتر ہو جائے گی اور وہ ان سب چیزوں پر توجہ کرتا جو انسان کی جسمانی فلاح اور معاشرے کی اصلاح میں مدد دیتی

ہیں حکومت کا فرض سمجھتا تھا۔
آگے چل کر اربابِ فکر نے معاشرتی مسائل کے فلسفیانہ بحث کی بجائے سیاسی نقطۂ نظر اختیار کر لیا۔ ہیرنگٹن کی "اوسیانا" میں جو ۱۶۵۶ء میں تصنیف ہوئی اور کرامویل کے نام پر معنون کی گئی، مشروطی شاہی حکومت کا ایک باضابطہ دستورِ اساسی پیش کیا گیا اس کے ایک صدی کے بعد "ہیوم" نے اپنے "اخلاقی اور سیاسی مقالات" میں ایک مکمل حکومت کا خاکہ کھینچا۔ اس وقت سے انگریزوں کے سیاسی خیالات میں حریت پسندی کی قوی تحریک پیدا ہو گئی۔
فرانس میں بھی سترھویں صدی میں حریت پسندی کا ہیجان اٹھ رہا تھا۔ ویراس والے نے مکمل شاہی حکومت کی ایک خیالی تصویر کھینچی جس میں کل زمین ریاست کی ملکیت ہے اور لوگ نیم اشتراکی جماعتوں میں منقسم ہیں۔ فینیلون کی ٹیلیماک بھی ایک مکمل شاہی حکومت کا خاکہ ہے جس پر ایک کامل الصفات بادشاہ حکمران ہے یہ دونوں کتابیں عینی ریاست کے ناتمام نقوش ہیں اور ان کا مقصد بھی یہی ہے کہ تقابل کے ذریعے سے اس زمانے کی حکومت کی خامیاں دکھائی جائیں۔
اٹھارھویں صدی میں فرانس کے اربابِ فکر کو "فطری حقوقِ انسانی" کی بحث میں اور مدنی حکومت اور قانونِ فطرت کا مقابلہ کرنے میں بہت انہماک تھا۔ مانٹیسکیو نے ایک فلسفیانہ مقالہ لکھا جس میں حکومت کی تین قسمیں قرار دیں۔ مطلق العنان شاہی، مشروط شاہی، اور جمہوریت اور ہر ایک پر بڑی دقتِ نظر سے بحث کی۔ یہ مقالہ فرانس میں سیاسیات کے مطالعے کا محرک ہوا۔ روسو کی کتاب "معاہدۂ اجتماعی" ۱۷۶۲ء میں شائع ہوئی جس میں یہ انوکھا نظریہ پیش کیا گیا کہ حکومت اختیاری معاہدے پر مبنی ہے اور لوگ جب چاہیں اسے توڑ سکتے ہیں۔ اس کتاب میں بڑی انتہا پسندی سے کام لیا گیا ہے اور یہ فرانس کی شاہی حکومت

اور "بادشاہوں کے خداداد حق" پر کھلا ہوا حملہ ہے۔ اس کے بعد بابلی نے رسالوں کا ایک سلسلہ لکھا جس میں اس نے شخصی ملکیت، حق وراثت مروجہ تجارتی اور مالی طریقوں اور تہذیب و تمدن کے اداروں کو مردود قرار دیا۔ وہ بڑا بت شکن تھا اور اس کے اقوال میں انقلاب پسندی کا رنگ پایا جاتا ہے۔ وہ افلاس کا اس بنا پر حامی تھا کہ یہ سب نیکیوں کی جڑ ہے اور ریاست کی بنیاد مساوات اور اشتراکی ملکیت پر رکھنا چاہتا تھا۔ یہی مصنف انقلاب فرانس کے ہراول اور اشتراکی فلسفیوں کے پیشرو تھے۔

بیبوف، سین سیمون، فوریئے، کابے، لوئی بلان اور پرودون یعنی اجتماعی نظاموں کے علمبردار تھے جن میں ریاستی اشتراکیت سے لے کر نراج تک مختلف طرزہائے حکومت پر مبنی تھے۔ ان تخیل پرستوں کی یہ کوشش تھی کہ یورپ کے جابرانہ اور غیر منصفانہ سیاسی اور معاشرتی نظاموں کو برباد کر کے ان کی جگہ ایک مکمل معاشرہ قائم کریں۔ گو ان کے منصوبوں کی تفصیلات عملی نقطۂ نظر سے ناقص تھیں مگر یہ اس لحاظ سے بہت مفید ثابت ہوئے کہ انھوں نے موجودہ حالات کی خرابیوں کی طرف توجہ دلائی اور اصلاح کی تدبیریں سجھائیں جن پر آگے چل کر معقول طریقوں سے عمل کیا گیا۔

آیڈم اسمتھ کی "دولت اقوام" نے لوگوں کو اصول حکومت پر غور و فکر کرنے کا شوق دلایا اور جان اسٹوارٹ مل کی "معاشیات" اور اس کے عام فلسفے نے علم سیاسیات کی بڑی اہم خدمت انجام دی۔ مل نے اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ انسانی معاشرے کے زیادہ مکمل مطالعہ کے لیے ایک مخصوص علم معاشرت یعنی عمرانیات کی ضرورت ہے۔

مالتھیس نے غذا کے ذخیرے اور آبادی کی باہمی نسبت کا مسئلہ چھیڑا۔ اس نے اپنی تحقیق کے جو نتائج پیش کیے ان سے علمی دنیا میں ہل چل پڑ گئی اور بڑے زور شور سے معاشرے کے حالات کے متعلق اعداد و شمار جمع کیے

جانے لگے۔ ان سب مصنفوں نے اور دوسرے ارباب فکر نے لوگوں کو اس طرف متوجہ کیا کہ معاشرتی مسائل پر غور کریں لیکن انھوں نے نہ تو عمرانیات کو باضابطہ علم کی حیثیت سے مدون کیا اور نہ اس کے مطالعہ کا کوئی منظم طریقہ بتایا۔

۳۴۴۔ موجودہ زمانے کا فلسفہ

موجودہ زمانے کے فلسفی بھی مذکورۂ بالا مصنفوں کے نقش قدم پر چل کر معاشرے کی ابتدا، نشوونما اور ساخت پر غور کرنے لگے۔ ان کا اندازِ بیان کسی قدر اذعانی سہی مگر حق پسندی پر مبنی تھا۔ انھوں نے عموماً معاشرتی مسائل پر اصلاحی پہلو سے نظر ڈالی اور معاشرے کی حقیقت اور اس کی آیندہ حالت کے متعلق بڑے بلند آہنگ نتائج پیش کیے۔ انگلستان کے مذہبی اشتراکیوں نے چارلس کنگسلے اور جے، ایف، ڈی موریس کی قیادت میں مذہبِ عیسوی کے معاشرتی پہلو کو نشوونما دینے کی کوشش کی۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ ریاست کی تشکیل عیسائیت کے معاشرتی پہلو کے مطابق ہو، سیاسی اور معاشی مسائل اور غریبوں اور امیروں کے تعلقات مذہبِ عیسوی کے فلسفے کی بنیاد پر طے کیے جائیں۔ کارلائل، رسکن اور ولیم مارس کے حق اور حسن پر مبنی زندگی کی تلقین نے معاشرتی نصبُ العین کو بہت بلند کر دیا۔ گو ان کے اجتماعی نقطۂ نظر میں بعض خامیاں تھیں مگر ان کے جذبات قابل تعریف تھے اور انھوں نے لوگوں کے دل میں بہتر زندگی کی آرزو پیدا کر دی۔ تاہم ان کی حیثیت محض عمرانی فلسفیوں کی تھی اور ان کا کام بس اتنا ہی تھا کہ معاشرے کی خرابیوں کی قلعی کھولیں، اچھوتے معاشرتی مطامح نظر کی تنقید کریں اور دنیا کو بلند تر اور برتر حکمت کی راہ دکھائیں۔ وہ کوئی عملی تجویز کوئی لائحۂ عمل پیش نہیں کر سکے۔ حال میں جے، ایس مینگنزی نے "مقدمۂ فلسفۂ اجتماع" میں عام

اور وسیع نقطۂ نظر سے اِس پر بحث کی ہے کہ معاشرتی مسائل کے حل کرنے میں فلسفیانہ اصول سے کس حد تک کام لیا جا سکتا ہے۔ اُن کی کتاب نے علمی دنیا کو علم عمرانیات کی تدوین سے قریب تر کر دیا ہے۔ انھوں نے بڑی دقتِ نظر سے نظمِ اجتماعی کی بنیادی اصول قائم کیئے ہیں اور نہایت قابلیت سے معاشرتی زندگی کا تجربہ کرکے یہ دکھایا ہے کہ معاشرے کی تنظیم اس کی ضروریات کے مطابق کی جاسکتی ہے۔ مگر ان کے خیالات ایک تنقیدی فلسفے کی حیثیت رکھتے ہیں نہ کہ علمِ صحیح کی۔ پھر بھی انھوں نے معاشرتی مسائل کو کمال وضاحت سے بیان کرکے بہت بڑی علمی خدمت انجام دی ہے اور اس کی جتنی قدر کی جائے کم ہے۔ بنجامن کڈ نے اپنی "معاشرتی ارتقاء" میں اِس بات پر زور دیا ہے کہ انسانی ترقی میں مذہب اور جذبات کو بہت دخل ہے۔ لیکن ان کی تصنیف اصل میں معاشرے کی ارتقاء کی تاریخ نہیں بلکہ تمدن و ترقی کا فلسفہ ہے۔ اس کے دعاوی، اس کی تحلیل اور اس کے نتائج میں سائنس کی سی حجت نہیں پائی جاتی۔ تاہم اس میں معاشرتی ارتقاء کے ایک پہلو پر بہت قابل قدر فلسفیانہ بحث کی گئی ہے۔ لوتسے کی "کائناتِ اصغر" میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ تاریخ کو لوگوں کی معاشرتی زندگی کا مطالعہ کرنا چاہیئے اور تہذیب و تمدن کی ترقی کے چند علمی اصول بیان کیئے گئے ہیں۔ کروزیر کی "تمدن اور ترقی" اور نیش کی "آغازِ شعورِ اجتماعی" میں معاشرے کا نامیاتی تصوّر پیش کیا گیا ہے۔

اِن سب تصانیف کا شمار فلسفۂ اجتماع میں ہے جو کم و بیش عام واقعات پر مبنی ہے۔ عموماً ان میں معاشرے اور اس کے وظائف کے متعلق فلسفیانہ کلیے بیان کیے گئے ہیں۔ اگرچہ مجموعی حیثیت سے ان سے معاشرتی زندگی کے بہت سے حقایق معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اِن میں سے کوئی بھی عمرانیات کی شان نہیں رکھتی۔ تاہم اِس کا اعتراف کرنا چاہیئے کہ ان کا اجتماعی خیالات کی تشکیل پر بہت کچھ اثر پڑا ہے اور

انھوں نے عمرانیات کی تدوین میں فلسفے سے مدد لینے کی طرف توجہ دلائی ہے۔

باب دوم

علم عمرانیات

۳۴۵۔ عمرانیات کی بنیاد

پچھلے باب میں ہم نے بہت سے فلسفیانہ نظریوں کا ذکر کیا ہے جن میں معاشرے کے ایک مخصوص جامع اور مانع علم کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے لیکن ان میں سے کوئی بلکہ یہ سب مل کر بھی عمرانیات کی بنیاد نہیں کہے جا سکتے اس سے ان خیالات کی تنقیص کرنا مقصود نہیں۔ ہم پہلے ہی اعتراف کر چکے ہیں کہ فلسفۂ اجتماع کے مختلف نظریئے معاشرتی مسائل پر غور و فکر کے محرک ہوئے اور انھیں کی بدولت عمرانیات کی تدوین کا خیال پیدا ہوا۔

اس باب میں ہم عمرانیات کے مختلف بنیادی عناصر اور اس کی ارتقائی مدارج دکھانا چاہتے ہیں۔ اس کی بنیاد تین باتیں کہی جا سکتی ہیں (۱) یہ تصور کہ معاشرہ ایک جسم نامی ہے۔ (۲) یہ احساس کہ اس کے ارکان سے بعض شعوری اجتماعی اعمال ظاہر ہوتے ہیں۔ (۳) معاشرے کی ساخت اور اس کے اعمال کی علمی تحلیل۔ معاشرے کا ہر منظم مطالعہ جس میں ان تین پہلوؤں میں سے کوئی پہلو مدِ نظر رکھا جائے خواہ وہ کتنا ہی محدود کیوں نہ ہو عمرانیات کی تدوین میں مدد دیتا ہے۔

۳۴۶۔ عمرانیوں کے پیشرو

بہت سے مصنفوں نے مذہبی، سیاسی، معاشی، اخلاقی یا نفسیاتی مباحث

کے سلسلے میں معاشرے کے متعلق جزوی خیالات ظاہر کیے ہیں۔ ان میں سے جو خیالات علمی معطیات پر مبنی تھے ان سے عمرانیات کی تدوین میں مدد ملی ایسے مصنف عمرانیوں کے پیشرو کہے جا سکتے ہیں کیونکہ ان کے افکار کا رجحان معاشرے کے علمی مطالعے کی طرف تھا۔

غالباً علمی تحقیقات کے پانچ سلسلوں سے جو کبھی الگ الگ رہتے تھے اور کبھی خلط ملط ہو جاتے تھے، عمرانیات کے مخصوص علم کی داغ بیل پڑی حیاتیات، تاریخ بہ حیثیت علم صحیح کے معاشیات، فلسفہ، اور اخلاقیات جن مصنفوں نے ان مباحث کے ضمن میں معاشرے پر مجموعی حیثیت سے نظر ڈالی انھوں نے اس کی جد و جہد کے مطالعے کا ایک نیم علمی انداز پیدا کر دیا۔ ان میں سب سے ممتاز حسب ذیل اشخاص تھے:۔

ویکو، جس نے تاریخ کا وسیع نظر سے مطالعہ کر کے یہ دعوی کیا کہ اس میں بھی ویسے ہی معین اور باضابطہ قوانین کارفرما ہیں جیسے عالم مادی میں پائے جاتے ہیں؛ مانٹسکیو جس نے سیاسیات کا منظم مطالعہ کیا۔ ٹرگو، جس نے مالیات، معاشیات، اور سیاسیات کے پیچیدہ مسائل حل کیے؛ کنڈورسے، جس نے نفس انسانی کی ارتقاء دکھائی اور معاشرتی اداروں کی اصلاح کی تدابیر بتائیں؛ ایڈم اسمتھ، جس کی فلسفے اور معاشیات کی تصانیف میں معاشرے کے افراد اور جماعتوں کی باہمی وابستگی پر زور دیا گیا؛ فرگوسن، جس نے مدنی معاشرے اور تاریخ کے متعلق اپنے زمانے کے لحاظ سے اعلیٰ درجہ کی کتابیں لکھیں اور رسل جس نے عمرانیات کے ایک مستقل علم کی ضرورت کا احساس پیدا کیا۔ ان ارباب کا یہ تسلیم کرنا کہ معاشرہ ایک مستقل وجود رکھتا ہے، جو علمی مطالعے کے قابل ہے اور نظم اجتماعی ایک اہم شعبۂ زندگی ہے جو تہذیب و اصلاح کا محتاج ہے، عمرانیات کی تدوین کا محرک ہوا۔

۳۴۷۔ عمرانیات کے بانی

کونت نے عمرانیات کی عمارت کا موقع تلاش کر کے اس کا سنگ بنیاد

نصب کیا مگر اس کے بنانے کا کام دوسروں کے لیے چھوڑ دیا۔ اس سے پہلے لوگوں نے بہت سا ان گھڑ مسالہ مہیا کر دیا تھا جو گھڑ کر تعمیر کے کام میں لایا جا سکتا۔ کونت نے خود اس سے کام نہیں لیا مگر اوروں سے کہا دیکھو یہ عمارت کی جگہ ہے اور یہ اس کا سنگ بنیاد ہے، اب تم تعمیر کا کام شروع کر سکتے ہو اپنی کتاب "ثبوتی فلسفہ" میں جہاں اس نے علوم کے مراتب قایم کیے ہیں، عمرانیات کو بہت اہم رتبہ دیا ہے کیونکہ اس کے بغیر علم کائنات کی تقسیم نامکمل رہتی ہے۔ طبیعیات اجتماعی یعنی عمرانیات کو اس نے پانچ بنیادی علوم فطرت میں شمار کیا ہے۔ اس نے علم کا سنگ بنیاد معاشرے کے نامیاتی تصوّر کو قرار دیتا ہے۔

کونت کو لوگ عمرانیات کا نقیب کہتے ہیں اور واقعی اس کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں کیونکہ اس نے خود اس کی تدوین نہیں کی۔ تاہم علوم کی تقسیم کا اصول قائم کرکے اس نے اپنے بعد آنے والوں کے لیے ایک ایسا خاکہ چھوڑا جس نے تدوین کے کام میں بہت مدد دی۔ اس کے کلیے مکمل، جامع اور قابل قدر ہیں۔ البتہ اس کے نظریے کی تفصیلات میں بعض کمزوریاں بلکہ غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ وارڈ نے اس کے متعلق خوب کہا ہے "اس میں یہ عجیب بات ہے جو اس کی تصانیف میں ہر جگہ پائی جاتی ہے کہ حقیقت کے ساتھ غلطیاں دست و گریباں ہیں۔ وہ ارباب فکر کی فوج میں ایک بڑے سپہ سالار کا رتبہ رکھتا ہے، مگر جہاں اس نے اپنی عادت کے مطابق پلٹنوں اور جمنٹوں کے اندر دخل دینا شروع کیا تو ایسی سخت اور مہمل کمان دیتا ہے کہ ساری فوج میں گڑبڑ مچ جاتی ہے۔"

لیکن بقول اسپنسر کے، جس کے عمرانیات کونت کے نصب کیے ہوئے سنگ بنیاد پر قایم ہے، "ہمیں موسیو کانت کی علمی خدمت کی اہمیت نظر انداز نہ کرنا چاہیئے۔ وہ واقعات کا حقیقی فلسفیانہ نظر سے مطالعہ کرتے تھے۔ قطع نظر ان کے عمرانیاتی نظریوں کے ان کا معاشرتی مظاہر کے مشاہدے کا انداز تمام متقدمین سے بہتر تھا۔"

کونت کا نقطۂ نظر بہت وسیع تھا۔ اس کا بڑا کام یہ ہے کہ اس نے حیاتیات اور عمرانیات کے تعلق کو واضح کیا اور عمرانیات کی تدوین کا خاکہ مرتب کرکے اپنے بعد آنے والوں کی رہنمائی کی۔ معاشرتی نظریوں کے مختلف العناصر انبار ہیں، جو تقسیم اور تفریق سے خالی اور مقصد کلی سے بیگانہ تھا اس نے ایک ایسا مرکز قایم کر دیا جس کے گرد علم عمرانیات کا مکمل دائرہ کھینچا جا سکتا تھا۔ اس لحاظ سے اسے عمرانیات کا بانی کہنا بیجا نہ ہوگا۔

لیکن جس طرح ایک ریاست کا بانی عموماً کوئی ایک شخص نہیں بلکہ متعدد اشخاص ہوتے ہیں اسی طرح ایک علم کے بھی کئی بانی ہوا کرتے ہیں۔ عمرانیات کا سنگ بنیاد کونت نے رکھا اور اس کی تعمیر ہربرٹ اسپنسر نے کی۔ اس کا نظریہ کونت سے مختلف تھا مگر اس نے کونت کے بنیادی اصولوں کو تسلیم کیا اور ان پر مفصل بحث کرکے ایک نئے علم کا پورا ڈھانچا کھڑا کر دیا۔ اس میں ترقی کی حرکت پیدا کرنا اور استقرا کے ذریعے سے اس کی تدوین کا امکان ثابت کرنا اسی کا کام تھا۔ اگرچہ وہ لوگ جنھوں نے اسپنسر کے بنائے ہوئے ڈھانچے کو مکمل کیا ہے، اس پر بہت کچھ تنقید کرتے ہیں مگر اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ موجودہ نقطۂ نظر سے عمرانیات پر جتنا احسان اس کا ہے اور کسی کا نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس نے معاشرے کے حیاتیاتی تصور میں بہت کھینچ تان سے کام لیا اور جسم حیوانی اور جسم اجتماعی کے مقابلے کو حد سے بڑھا دیا۔ مگر پھر بھی اس کا اصلی دعویٰ کہ جسم اجتماعی مثل جسم حیوانی کے تفریق کے ذریعے سے نشو و نما پاتا ہے، اب تک اپنی جگہ پر قایم ہے اور کوئی شخص اس کی تردید میں کامیاب نہیں ہوا۔ اس پر جو اعتراض ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس نے تفریق پر ضرورت سے زیادہ زور دیا اور اجتماع کی اہمیت نظر انداز کر دی۔ اس کمی کو اس کے بعد کے عمرانیوں نے پورا کیا۔ اسپنسر کا اصول یہ تھا کہ معاشرے کے متعلق معلومات اور معطیات جمع کرکے استقرا کے ذریعے سے عمرانیات کی تدوین کرے۔ ابتدا میں یہ اصول مفید ثابت ہوا لیکن مشاہدے کے نامکمل رہ جانے سے معاشرے کے نفسیاتی عنصر پر

کافی زور نہیں دیا جاسکا۔ یہ بات یاد رکھنا چاہیئے کہ عمرانیات کی تحقیقات میں معاشرے کے متعلق طبعی اور نفسیاتی دونوں طرح کے واقعات اور معطیات باقاعدہ طور پر رجوع کرنا بہت ضروری ہے ورنہ یہ علم محض خیالی فلسفہ یا مجرّد نفسیات بن کر رہ جائے گا۔

اسپنسر کی "بیانی عمرانیات" محض ان واقعات کا مجموعہ ہے جو معاشرے کی ابتدائی جد و جہد سے متعلق ہیں اسی کی بنیاد پر آگے چل کر اس نے "اصول عمرانیات" لکھی۔ عمرانیات کی باضابطہ بحث اُس نے ان دو کتابوں میں اور ایک تشریحی رسالے "مطالعۂ عمرانیات" میں کی ہے مگر "مبادئ فلسفہ" اور "عمرانی سکونیات" میں بھی بعض عمرانیاتی مسائل ملتے ہیں۔ اسپنسر کے بعد سے اب تک عمرانیات اتنی ترقی کر گئی ہے کہ اس کی کتابیں ہماری نظر میں محض معاشرے کے آئین و رسوم اور قبائلی زندگی کے مطالعے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مگر پھر بھی طالب علم کے لیے اُن کا مطالعہ بیحد مفید ہے۔

۳۴۸۔ عمرانیات کا نشو و نما

کونت اور اسپنسر کے زمانے سے اب تک عمرانیات کی نشو و نما اس ذریعے سے ہوئی ہے کہ معاشرے کے مطالعے میں علم صحیح کے منہاج سے کام لیا گیا۔ اس کی ترقی کی رفتار مسلسل نہیں رہی کیونکہ ہر محقق اس کا مطالعہ ایک خاص نقطۂ نظر سے کرتا تھا اور اپنے ذاتی نظریوں اور مفروضوں کی بناء پر نتائج نکالتا تھا۔ بہت سے مخلص اور سنجیدہ لوگوں نے جن میں سے بعض نہایت اعلیٰ درجے کی قابلیت رکھتے تھے عمرانیات کو صحیح بنیاد پر قایم کرنے کی کوشش کی لیکن ان کے نقطہ ہائے نظر میں اختلاف ہونے کی وجہ سے اس کی ترکیبی نشو و نما بہت کم ہوئی۔ اب بھی عمرانی اس معاملہ میں متفق الرائے نہیں ہیں کہ عمرانیات کا موضوع، اس کی حدود اور اس کے بنیادی اصول کیا ہیں۔ کسی شخص نے کوئی ایسا نظام پیش نہیں کیا جسے سب قبول کرلیں۔ تاہم اس سلسلے میں اتنے علمی طریقوں سے کام لیا گیا ہے، اتنی معلومات

جمع ہو گئی ہے، اتنے اصول اور منطقی نتائج مترتب ہو چکے ہیں کہ اگر سب مصنف اس موضوع پر ایک ہی نقطۂ نظر سے غور کریں تو ایک مکمل علم صحیح مدوّن ہو جائے۔ اب کچھ دنوں سے مختلف ارباب فکر کے نقطہ ہائے نظر قریب تر ہوتے جاتے ہیں اور ان کے خیالات آہستہ آہستہ ایک مرکز کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

۳۴۹۔ معاشرے کے نامیاتی تصوّر

کونت معاشرے کی وحدت کا اور ایک لحاظ سے اس کے جسم نامی ہونے کا قائل تھا۔ لیکن اس کے ذہن میں جسم اجتماعی کا جو تصور تھا اس میں نفسیاتی رنگ حیاتیاتی رنگ پر غالب تھا۔ اسپنسر نے اپنی عمرانیات کی بناء سراسر حیاتیات پر رکھی اور معاشرے کو ایک جسم طبعی قرار دیا۔ مگر اس کی نشو و نما کے دوران میں اس کے خیالات وقتاً فوقتاً بدلتے رہے۔ کبھی وہ معاشرے کو قیاساً بمنزلۂ جسم حیوانی کے سمجھتا ہے اور کبھی قیاس سے آگے بڑھ کر اسے واقعی جسم قرار دیتا ہے۔ بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ وظائف ریاست کے نقطۂ نظر سے عمرانیات پر بحث کرتے ہوئے وہ انفرادیت کے رنگ میں لکھنے لگتا ہے۔ بہر حال مجموعی حیثیت سے اس کے خیالات سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اس کے نزدیک معاشرے کی ساخت جسم طبیعی کے مانند ہے۔

معاشرے کے نامیاتی تصوّر کو پاؤل فان لیلین فیلڈ نے مزید ترقی دی۔ ۱۸۷۳ء میں اپنی کتاب "زمانۂ آیندہ کے علوم اجتماعی کے متعلق بعض خیالات" کی پہلی جلد اور ۱۸۹۶ء میں ایک رسالہ "عمرانیات کے نامیاتی منہاج کی تائید" کے نام سے شائع کیا۔ اس رسالے میں عمرانیات کی بنا معاشرے کی نامیاتی ترکیب کے مطالعے پر رکھی گئی ہے۔ معاشرے کو جسم نامی مان کر اس کی ساخت بیان کی گئی ہے اور نفسیاتی طبعیات اور معاشرتی عضویات کی تفصیلی بحث چھیڑ دی گئی ہے۔

۱۸۷۵ء میں آسٹریا کے معاشی، آوگسٹ شیفلے نے عمرانیات ترکیبی یا ماہیاتی پر اپنی معرکہ کی کتاب "جسم اجتماعی کی ساخت اور زندگی" شائع کرنا شروع کی۔ اس کتاب میں، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، جسم اجتماعی کے اعضاء کی تشریح اور اس کے وظائف اور اعمال کی تحلیل ہے۔ اس میں عمرانیات کا حیاتیاتی تصور اس سے بھی زیادہ قوی ہے جتنا اسپنسر کے یہاں تھا۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ شیفلے معاشرے کی وضع کا تعین اس کے وظائف کے لحاظ سے کرتا ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ اس کے نزدیک معاشرے کی ساخت نفسیاتی اصول پر مبنی ہے۔

اس سے کچھ مختلف انداز میں ژاک نودیکو "انسانی معاشروں کی کشمکش" (۱۸۹۳ء) میں حیاتیاتی عمرانیات کی حمایت کرتا ہے۔ وہ معاشرے کی نشوونما کا مطالعہ مختلف گروہوں کے تنازع للبقاء کے نقطۂ نظر سے کرتا ہے۔ موسیو رینے اور موسیو دوراپرتی بھی اسپنسر کے مقلد تھے خصوصاً اس لحاظ سے کہ انھوں نے عمرانیات بیانی کی اہمیت تسلیم کرکے اسے اپنا موضوعِ تصنیف بنایا۔

۳۵۰۔ معاشیات کا اثر

معاشیات اور عمرانیات کی حدود الگ الگ ہیں لیکن معاشیوں کے منہاج بحث اور ان کے تحقیقات کا اثر عمرانیات کی نشوونما پر بہت نظر آتا ہے۔ یہ بات خصوصیت کے ساتھ تاریخی اور شماری منہاج میں نمایاں ہے۔ معاشیوں کے نام نہاد "تاریخی فرقے" نے معاشی خیالات کی ارتقا اور مختلف معاشروں کی صنعتی نشوونما کے مطالعے پر زور دیا۔ گو ان کے کلی استخراجات ناکمل ہیں پھر بھی معاشرے کی نشوونما کا مطالعہ معاشی زندگی کی تفسیر کے لیے بہت مفید ثابت ہوا۔ اس کے علاوہ بعض معاشیوں نے مختلف طبقوں اور جماعتوں کے باہمی تعلقات اور جسم اجتماعی کے معاشی اعضا اور ان کے اعمال سے بھی بحث کی ہے۔

جرمنی میں روشر، ہلڈیبرانڈ، کیس اور اشمولر فرانس میں ڈولوسکی اور انگلستان میں کلف لیسلی اور پوسنیٹ ان کے سب سے بڑے نمایندے ہیں۔

لوپلے نے اپنی کتاب "فرانس میں معاشرتی اصلاح" میں شماری منہاج سے بڑی قابلیت سے کام لیا ہے۔ اس کی تصانیف سے فرانس اور دوسرے ممالک میں عمرانیات اور معاشیات کے مطالعے کو بڑی مدد پہنچی۔

دُرکہائم نے "معاشرتی اعمال کی تقسیم" میں معاشیات کے نظریۂ تقسیم عمل کو بہت وسعت دی اور اسی پر عمرانیات کی بنا رکھی۔ اس نے مسئلے کے کل پہلوؤں پر بحث کی یہاں تک کہ عضویاتی پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ وسعت نظر کے لحاظ سے اس کی کتاب عمرانیات میں شمار ہوسکتی ہے مگر اس کی بنیاد معاشیاتی ہے۔

صنعتی نشو و نما کا جو مطالعہ پچھلے چند سال میں کیا گیا وہ ایک حد تک عمرانیات کا ممنونِ احسان ہے مگر عمرانیات کو بھی اس سے فائدہ پہنچا۔ ایلی کی کتاب "صنعتی معاشرے کی ارتقاء" معاشیات کی کتاب ہے جو عمرانیات کے نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے۔ اس نے معاشرے کا گہری نظر سے مطالعہ کیا اور معاشیات کی تاریخ اور معروضات کی تحقیق سے عمرانیات کی نشو و نما میں مدد دی۔ اسی طرح بیوشر کی "صنعتی ارتقاء" میں اس موضوع پر بڑی خوبی سے بحث کی گئی ہے۔ اور ٹینلے کی انگلستان کی معاشی تاریخ معاشرے کی نشو و نما کی قابلِ قدر تحقیق ہے۔ غرض معاشیات میں جہاں کہیں شماری منہاج سے کام لیا گیا اس سے معاشرتی مسائل پر روشنی پڑی اور عمرانیات کو بڑا فائدہ پہنچا۔

۳۵۱۔ عمرانیات کی نشو و نما موجودہ زمانے میں

عمرانیات کی تدوین کی ابتدائی کوششیں بھی تعریف کی مستحق ہیں مگر یہ واقعہ ہے کہ علمی حیثیت سے اس کی حقیقی نشو و نما پچھلے پچیس برس کے اندر ہوئی۔ بہت سے مصنفوں نے اپنے اپنے نقطۂ نظر سے اس موضوع

پر داد تحقیق دی ہے۔ ہم یہاں خاص خاص طرز ہائے خیال کا اور خاص خاص مصنفوں کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں۔

ریاستہائے متحدہ (امریکہ) میں عمرانیات کی باضابطہ ابتدا لیسٹر ایف وارڈ کی یادگار تصنیف "حرکی عمرانیات" کی اشاعت (۱۸۸۳ء) سے ہوئی۔ اس سے پہلے عمرانی مسائل پر متفرق کتابیں لکھی جا چکی تھیں اور تاریخ، سیاسیات اور معاشیات کی تحقیق نے معاشرے کے وسیع تر مطالعہ کا شوق پیدا کر دیا تھا۔ کیری کی کتاب "علم معاشرت" بھی، جس میں مخصوص معاشی اور عام معاشرتی مسائل کی بحث تھی، شائع ہو چکی تھی مگر اس سے عمرانیات کی تدوین پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔ وارڈ کی کتاب کی اشاعت سے پہلے اہل علم عمرانیات کو اصلاح معاشرت کے خیالات کا مجموعہ یعنی مصلحوں کی تبلیغ سمجھا کرتے تھے۔ علمی دنیا اس نئے علم کے لیے طیار نہیں تھی چنانچہ "حرکی عمرانیات" پر بہت کم توجہ کی گئی اور جو معدودے چند متوجہ ہوئے انھوں نے بھی اسے شک و شبہ کی نظروں سے دیکھا۔ لیکن آگے چل کر رفتہ رفتہ اس کے اثر کا دائرہ بڑھتا گیا۔ اس میں معاشرے کا مطالعہ حرکی نقطۂ نظر سے کیا گیا ہے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ یہ عمرانیات کے صرف ایک حصہ کی بحث ہے۔ وارڈ نے انسانی زندگی کی بنیاد تو مادّی قرار دی ہے مگر اس پر بہت زور دیا ہے کہ معاشرتی جد و جہد اصل میں نفسیاتی نوعیت رکھتی ہے اور معاشرے کی حقیقی قوتیں نفسی قوتیں ہیں۔ دس سال کے بعد وارڈ نے "تمدن کی نفسیاتی بنیاد" شائع کی جس میں انھوں نے اپنی نفسیات اجتماعی کی تفصیل اور تکمیل کی۔ اس کے دس سال کے بعد انھوں نے "عمرانیات محض" لکھی اور اب دوسری جلد "عمرانیات علمی" کے نام سے لکھنے کا مقصد رکھتے ہیں۔ "عمرانیات محض" میں انھوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ اس علم کی بنیاد سراسر نفسیاتی ہے۔ ان کی کتاب میں زیادہ تر غیر شعوری اجتماعی عمل کی بحث ہے۔ اس بنیاد پر انھوں نے معاشرے کی "غایت" یعنی بامقصد عمل کا نظریہ قایم کیا ہے۔ وارڈ صریحی طور پر واحدی (صرف ایک جوہر کے

قائل) ہیں۔ ان کے نزدیک نفسِ انسانی عضویاتی زندگی کی ایک لطیف شکل یا زیادہ سے زیادہ ایک قوت ہے جو مادے کے نمو سے پیدا ہوگئی ہے۔ مگر یہ مافوق الطبیعی تصور ان کی علمی ثنویت میں مزاحم نہیں ہوتا جس کا اظہار وہ اپنی عمرانیات میں آگے چل کر کرتے ہیں۔ "عمرانیاتِ محض" میں وارڈ نے "محض" کے لفظ سے خود رو نشو و نما مراد لی ہے بلکہ اس کتاب کا دوسرا نام اسنے "معاشرہ کا آغاز اور اس کی خود رو نشو و نما" رکھا ہے۔ اس کی دوسری جلد وہ عملی عمرانیات پر لکھنے کا قصد رکھتا ہے۔ "عملی عمرانیات" میں اس کے نزدیک وہ سب مسائل داخل ہیں جو "عمرانیاتِ محض" کی تحت میں نہیں آتے۔ وہ "عمرانیاتِ محض" کو قریب قریب معاشرے کی غیر شعوری نشو و نما اور "عمرانیاتِ عملی" کو شعوری نشو و نما کے معنی میں استعمال کرتا ہے۔ لیکن دونوں میں وہ ایک با مقصد قوت کے کارفرما ہونے کا قائل ہے۔ "عمرانیاتِ محض" اور "عمرانیاتِ عملی" میں فرق کرنے کا یہ اصول سمجھ میں نہیں آتا۔

۱۸۸۶ء میں بلجیم کے عمرانی گیام دگریف کے "مقدمۂ عمرانیات" کا پہلا حصہ شائع ہوا جس میں اس علم کے بنیادی اصولوں کی بحث تھی۔ ۱۸۸۹ء میں اس کا دوسرا حصہ "اعضا اور وظائف" اور آگے چل کر تیسرا حصہ "جسم اجتماعی کی عام ساخت" شائع ہوا۔ اس کے بعض اجزا "امریکی رسالۂ عمرانیات" میں باقساط شائع ہو چکے ہیں اور ایمن جمفورڈ نے ان کا ترجمہ انگریزی میں کر دیا ہے۔ یہ عمرانیات کی بڑی قابلِ قدر کتاب ہے۔ اس میں معاشرے کے نظام اور اس کے اعضاء اور وظایف کا ایک مکمل خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں شماری منہاج سے کام لیا گیا ہے۔ گریف کے نظامِ عمرانیات کا مرکزی تصور "معاشرتی معاہدہ" یا بقولِ اسمال کے "معاشرتی معاملہ" ہے۔

گِڈنگز کی "اصولِ عمرانیات" ۱۸۹۶ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔ ان کے نزدیک عمرانیات کی بنیاد انسانوں کے فطری تعلقات ہیں۔ انھوں نے معاشرے کا آغاز، اس کی نشو و نما اور اس کی تنظیم فطری معاشرتی قوتیں

کے ماتحت دکھائی ہے۔ وہ "شعورِ نوعی" کو بنیادی معاشرتی قوت اور انسانوں کے باہمی تعلقات کا سبب قرار دیتے ہیں۔ بقول اُن کے شعور نوعی یا کشش باہمی کی بدولت تفریق اور اجتماع کے عمل سے اور بعض دوامی قوتوں کی کارفرمائی سے جو معینہ قوانین کے پابند ہیں معاشرہ وجود میں آیا۔ ان کے نقاد کہتے ہیں کہ انھوں نے شعور نوعی کو حد سے زیادہ اہمیت دے دی ہے "استقراری عمرانیات" میں جو ۱۹۱۰ء میں شائع ہوئی گڈنگز نے شعور نوعی پر اتنا زیادہ زور نہیں دیا۔ انھوں نے اپنے خاص نقطۂ نظر سے عمرانیات کی بہت بڑی خدمت انجام دی اور ان کا شمار امریکہ کے چند چوٹی کے عمرانیوں میں ہے۔

راس کی "نظمِ اجتماعی" (۱۹۰۱) بڑی قابلیت اور بدیع الخیالی سے لکھی گئی ہے۔ اس کا بنیادی تصور معاشرے کا شعوری نظم و ضبط ہے۔

معاشرتی مرضیات کا مطالعہ اور "محتاجوں، ناقص الخلقت لوگوں اور مجرموں" کے متعلق تحقیقات معاشرے کے حقیقی علم کی نشو ونما میں بہت مفید ثابت ہوئی۔ ایمنگ ہاؤس، وارنر، ہینڈرسن، ڈیوین، بوتھ ہیونسٹر برگ اور یورپ اور امریکہ کے اور بہت سے علماء نے افراد کی غیر طبعی خصوصیات اور معاشرتی تنظیم کی خرابیاں معلوم کرکے معاشرے کی حقیقت پر روشنی ڈالی اور ان لوگوں کے کام میں بہت مدد دی جو معاشرتی زندگی کی طبعی نشو ونما کے مطالعے میں مصروف ہیں۔

ان کے علاوہ اور بہت سے علماء ہیں جنھوں نے علم عمرانیات کی اہم خدمت انجام دی ہے۔ گمپلووِتش نے یہ نظریہ پیش کیا کہ معاشرے کی نشو ونما نسلوں کی تنازع للبقا پر مبنی ہے؛ تارڈ نے یہ حقیقت دریافت کی کہ معاشرے کا اصل اصول تقلید ہے؛ لیبان نے نفسیاتِ اجتماعی کی اہمیت دکھائی؛ لیتور نو نے علم الاقوام پر عمرانیات کی بنیاد رکھی۔ برنٹن نے نسلی نفسیات کی بحث چھیڑی۔ زیمل نے فرد کا جماعت کے ماتحت ہونا

مرکزی تصور قرار دیا۔ راتسن ہوفر نے بہت سے عمرانی مسائل خصوصاً نسلوں کی تنازع للبقا پر تفصیل سے نظر ڈالی۔ اُن کی اور ان جیسے اور بزرگوں کی کوششوں سے عمرانیات کا علم وجود میں آیا۔

عمرانیاتی رسالوں کی اہمیت بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ امریکی رسالۂ عمرانیات" جو پروفیسر اسمال کی ادارت میں نکلتا ہے، ریاستہائے متحدہ کے لوگوں کو عمرانی مسائل کی تعلیم دینے کا سب سے بڑا ذریعہ ثابت ہوا ہے۔ یہی خدمت یورپ کے بھی بعض رسائل انجام دے رہے ہیں جن میں "بین الاقوامی رسالۂ عمرانیات"، "عمرانیاتی سالنامہ" اور "اطالوی عمرانیاتی ریویو" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان رسائل سے عمرانیات کی نشو و نما کا اندازہ ہوتا رہتا ہے۔

عمرانیات بحیثیت ایک علم صحیح کے بہت تیزی سے ترقی کر رہی ہے خصوصاً اس اعتبار سے کہ مختلف مصنفوں کے نقطۂ نظر میں اتحاد پیدا ہوتا جاتا ہے اور مصطلحات کے اختلاف کو مٹا کر ان کا ایک نظام ترتیب دیا جا رہا ہے جو سب کے لیئے قابل فہم ہو۔ عمرانیات کے آغاز اور نشو و نما کے اس مختصر خاکہ کو ہم ونسنٹ کے مضمون کے ایک ٹکڑے پر ختم کرتے ہیں جس میں عمرانیاتی تحقیق کے اتحاد کا جائزہ لیا گیا ہے: "عمرانیون میں اس حد تک اتحادِ خیال ابھی نہیں پیدا ہوا جیسا اور علوم کے ماہروں مثلاً معاشیوں میں ہے، پھر بھی اگر مصطلحات کا اختلاف دور کر دیا جائے تو اس انبار میں سے جو بظاہر بے ترتیب معلوم ہوتا ہے متفق علیہ خیالات کا ایک سلسلہ ہاتھ آ سکتا ہے، اور یہ سلسلہ روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔ چنانچہ معاشرے کے متعلق حسب ذیل امور میں سب کو اتفاق ہے کہ وہ:-

(۱) طبیعی اور نفسی قوتوں کے عمل کا نتیجہ ہے (۲) جو قانونِ ارتقا کے مطابق نشو و نما پاتا ہے۔ (۳) اس کے ابتدائی مدارج میں جبلی افعال کا رنگ غالب ہوتا ہے اور (۴) آگے چل کر سوچے سمجھے اور با مقصد اعمال ظاہر ہوتے ہیں۔ یعنی (۵) اس میں اجسامِ

نامیہ کی عام صفات پائی جاتی ہیں۔

معاشرے کی نفسی اجتماعی زندگی کے متعلق سب کا خیال ہو کہ۔ (۱) افراد پہلے تو اپنی شخصی نشو و نما ہی میں غیر شعوری طور پر اپنی جماعت کا معیار اختیار کر لیتے ہیں اور (۲) پھر وہ شعوری طور پر اس کی پابندی پر مجبور کیے جاتے ہیں۔ تقلید اور جماعت کے اثر سے جو یکرنگی پیدا ہوتی ہے اس کو دُور کرنے والے (۳) قائد یا مجدد ہوتے ہیں جو فکر و عمل کی نئی راہیں کھولتے ہیں اور دوسرے ان پر چلتے ہیں۔ ان قائدوں اور ان کے پیروؤں میں، (۴) تنازع للتفوق شروع ہو جاتا ہے اور آخر میں (۵) مقابلۃً مستقل آئین و رسوم کا ایک نظام قائم ہو جاتا ہے جو لوگوں کے احساسات کا یعنی ان کی روایات اور سیرت کا جزو بن جاتا ہے۔ جب اس جماعت کے ارکان یہ سمجھنے لگیں کہ ہمارا نصب العین اور مقاصد مشترک ہیں تو (۶) شعور اجتماعی پیدا ہو جاتا ہے۔

تمت

حوالے

حصہ اوّل

باب اوّل

Ely, R. T. *The Evolution of Industrial Society*. pp. 3-119.
Giddings, F. H., *Principles of Sociology*. pp. 3-20.
Small and Vincent, *Introduction to the study of Society*. pp. 15-20.
Ward, Lester F., *Dynamic Sociology—Introduction*.

باب دوم

Giddings, F. H., *The principles of Sociology ; Inductive Sociology*.
Small, A. W., *Methodology of Sociology*.
Small and Vincent, *Introduction to the Study of Sociology*.
Ward, Lester F., *Pure Sociology*, Vol. I ; *Contemporary Sociology*.

باب سوم

Giddings, F. H., *Inductive Sociology*.
Ratzenhofer, Gustav, *The Problems of Sociology*.
Small, A. W., *Methodology of Sociology*.
Ward, Lester, F., *Pure Sociology*.

حصۂ دوم

باب اوّل

Brinton, Daniel G., *The Basis of Social Relations*, pp. 163-201.
Darwin, Charles, *The Descent of Man*, Chapter IV.
Ely, R. T., *Evolution of Industrial Society*, Chaps. I, II.
Giddings, F. H., *Principles of Sociology*, pp. 199-856.
Ross, E. A., *Social Control*, Chapter I.
Topinard, Paul, *Science and Faith*, pp. 60-173.
Ward, Lester, F., *Dynamic Sociology*, Vol. I., Chap. VII.

باب دوم

De-Greef, Guillaume, *Introduction á la Sociologie*, Part I., Chapter III.
Laveleye, Emile de, *Primitive Property*.
Thackery, S. W., *The Land and the Community*, Chaps. I, II, and III.
Walker, Francis A., *The Land Question*.

باب سوم

Giddings, F. H., pp. 299-362.
Small and Vincent, *Introduction to the Study of Society*, pp. 237-266.
Spencer, Herbert, *Principles of Sociology*, pp. 473-478.
Ward, Lester F., *Dynamic Sociology*, I, pp. 468-502; 524-565; 581-706; *Pure Sociology*, pp. 169-216; 544-572.

باب چہارم

Spencer, Herbert, *Principles of Sociology*, pp. 485-519.
De Greef Guillaume, *Introduction a la Sociologie*, Part II.
Giddings, F. H, *Principles of Sociology*, pp. 171-199.
Small and Vincent, *Introduction to the Study of Sociology*, pp. 169-214.

باب پنجم

Fustel de Coulanges, *The Ancient City*, pp. 49-153.
Hearn, W. E., *The Aryan Household*, pp 1-111.
Howard, Geo. E., *The History of Matrimonial Institutions*, pp. 3-223.
Small and Vincent, pp. 183-196.
Spencer, Herbert, *Principles of Sociology*, I, pp. 667-712.
Thwing, Charles, *The Family*, pp. 9-44.

باب ششم

Bluntschli, J. K., *The Modern State*.
Fustel de Coulanges, *The Ancient City*, pp. 154-238.
Freeman, E. A., *Comparative Politics*, pp. 76-136.
Fowler, W. W., *The City-State of the Greeks and Romans*, 1-183.
Giddings, F. H., *Principles of Sociology*, pp. 299-360.
Hearn, W. E., *The Aryan Household*, pp. 143-166; 317-341.
Morgan, Lewis H., *Ancient Society*, pp. 215-276.
Schoemann, G. F., *Antiquities of Greece: The State*, pp. 81-114; 311-347.
Wilson, Woodrow, *The State*, pp. 1-10.

باب ہفتم

Bluntschli, J. K., *The Theory of the State*, pp. 15-75.
Leroy-Beaulieu, *The Modern State*, pp. 1-91.
Mulford, E., *The Nation*, pp. 37-61; 288-320.
Rousseau, Jean Jacques, *The Social Contract*, Introd. Bk. I, Chs. 1-8.
Welldon, J. E. C., *The Politics of Aristotle*, pp. 1-37.
Willoughby, W. W., *The Nature of the State*, pp. 1-141.
Wilson, Woodrow, *The State*, pp. 10-30.

باب ہشتم

Blackmar, F. W., *Economics*, pp. 61-130.
Bücher, Carl, *Industrial Evolution*, pp. 1-83.
De Greef, G., *Introduction a la Sociologie*, Part II, p. 96.
Ely, R. T., *Evolution of Industrial Society*, pp 1-84.
Ely, R. T., *Outlines of Economics*, pp. 219-246.
Fetter, Frank, *Principles of Economics*, pp. 49-65.
Spencer, Herbert, *Principles of Sociology*, Vol. II, pp. 327-377.
Ward, Lester, F., *Dynamic Sociology*, Vol. I, p. 561.

باب نہم

De Greef, G., *Introduetion á la Sociologie, Part* II, *p*. 39.
Jevons, Stanley, *Money and the Mechanism of Exchange*, pp. 1-40.
Schaeffle, August, *Bau und Leben des socialen Körpers*.
Spencer, *Herbert*, *Principles of Sociology*, Vol. II, pp. 387-403.
Walker, Francis A., *Political Economy*, pp. 120-148.
Ward, Lester F., Vol. I, p. 565.

باب دہم

Baldwin, James Mark, *Social and Ethical Interpretations in Mental Development*, pp. 449-542.
Huxley, Thos. H., *Evolution and Ethics*, pp. 46-146.
Lecky, W. E. H., *History of European Morals*, pp. 130-160.
Schurman, J. G., *The Ethical Import of Darwinism.*
Spencer, Herbert, *Social Statics*, pp. 1-32 , *Principles of Ethics*, pp. 1-63 ; 174-200 ; 263-276.
Taylor, Hugh, *The Morality of Nations*, pp. 151-294.
Ward, Lester F., *Dynamic Sociology*, pp. 320-376 ; I, 503-524.
Williams, C. M., *Evolutionary Ethics*, V, IX.

باب یازدہم

Blackmar, W. F., *Story of Human Progress*, pp. 200-211.
Dennis, James S., *Christian Missions and Social Progress*, I, pp. 1-60.
Guizot, F. P. G., *History of Civlization*, I, pp. 103-149.
Hearn, W. E., *Aryan Household*, pp. 1-38.
Kidd, Benj , *Social Evolution*, pp 1-117.
Letourneau, Charles, *Sociology*, pp. 217-248 ; 319-326.

Peschel, O., *The Races of Man*, pp. 245-318.
Ratzel Friedrich, *The History of Mankind*, I, pp. 38-65.
Ross, E. A., *Social Control*, pp. 126-145.

Spencer, Herbert, III, pp. 3-36.
Tarde, Gabriel, *Les lois de l'imitation*, pp. 291-314.
Tylor, E, B., *Primitive Culture*, I, pp . 417-502 ; *Anthropology*, pp. 342-372
Ward, Lester, F., I, pp. 686-706 ; Vol. II, p. 279.

حصۂ سوم

باب اوّل

De Greef, Guillaume, *Introduction á la Sociologie*, pp. 67-91.
Fairbanks, Arthur, *Introduction to Sociology*, pp. 189-221.
Giddings, F. H., *Principles of Sociology*, 299-360.
Letourneau, Charles, *Sociology*, pp. 514-560.
Small and Vincent, *Introduction to the Study of Society*, pp. 112-141 ; 251-266.
Spencer, Herbert, *Social Statics*, pp. 447-498 ; *Sociology, I*, pp. 537-563 ; 576-585.
Ward, Lester F., *Pure Sociology*, p. 112.

باب دوم

Giddings, F. H., *Principles of Sociology*, pp. 79-194 ; 263-375.
Ross, E. A , *Social Control*, pp. 1-40 ; 87-360.
Small and Vincent, *Introduction to the Study of Society*, pp. 173-177 ; 237-366.
Spencer, Herbert, *Principles of Sociology*, Vol. I, pp. 564-575.
Ward, Lester, F., *Dynamic Sociology*, Vol, I, pp. 468-482; *et seq. Psychic Factors of Civilization*, pp. 116-124.

باب سوم

Fairbanks, Arthur, *Introduction to Sociology*, pp. 108-118.
Giddings, F. H., *Principles of Sociology* ; *Inductive Sociology*, pp. 400-419.
Ross, E. A., *Social Control*, pp. 41-88.
Spencer, Herbert, *First Priciples*, pp. 381-396 ; *Sociology*, I, pp. 745-761 ; *Sociology*, II, pp. 568-667.
Tarde, Gabriel, *Les lois de l'Imitation*, pp. 158-212. *Social Laws*.
Ward, Lester F., *Psychic Factors of Civilization*, pp. 125-130.

باب چهارم

De Greef, Guillaume, *Introduction á la Sociologie*, Chapter XIII.
Durkheim, Emile, *Les régles de la méthode Sociologique*, pp 6-23.
Fairbanks, Arthur, *Introduction to Sociology*, pp. 76-91.
Giddings, F. H., *Principles of Sociology*. pp. 132-152.
Le Bon, Gustave. *The Crowd.*
Small and Vincent, *Introduction to the study of Society*, pp. 215-236 ; 305-331.
Tarde, Gabriel. *La logique Sociale*, pp. 92, 96, 101 ; 201-204.
Ward, Lester F., *Dynamic Sociology*, pp. 400-469 ; 305-331 . *Psychic Factors of Civilization*, pp. 291-312. *Pure Sociology*, pp. 150-159

باب پنجم

Baldwin, J. Mark, *Social and Ethical Interpretations in Mental Development*, pp. 185-358.
Giddings, F. H., *Principles of Sociology*, pp. 376-399.
Le Bon, Gustave, *The Crowd.*
Small and Vincent, *Introduction to the Study of Society*, pp. 331-365.
Spencer, Herbert, *Principles of Sociology*, I, pp. 483-485, 507-536.
Ward, Lester F., *Dynamic Sociology*, II, pp. 540-633 ; *Pure Sociology*, pp. 136-145.

باب ششم

Giddings, F. H., *Principles of Sociology*, pp. 420-422.
Kidd, Benj , *Social Evolution*, pp. 29-58.
Mallock, W. H., *Labor and Popular, Welfare*, pp. 17-53 ; 130-150.
Ross, E. A., *Social Control*, pp. 89-162.
Schaeffle, August, *Bau und Leben des socialen Körpers*, I, pp. 689-700.

حصۂ چہارم

باب اوّل

Fairbanks, Arthur, *Introduction to Sociology*, p. 174.
Kidd, Benj, *Western Civilization*
Mackenzie, John, S., *An Introduction to Social Philosophy*, pp. 238-295.
Small and Vincent. *Introduction to the Study of Society*, p. 72.

باب دوم

Addams, Jane, *Democracy and Social Ethics.*
Bellamy, Fdward, *Looking Backward.*
Blackmar F. W., *Economics*, p. 239.
Ely, R. T., *Socialism and Social Reforms ; French and German Socialism.*
Freeman, E. A., *Federal Government.*
More, Thomas, *Utopia.*
Plato's, *Republic.*
Ward, Lester, F., *Dynamic Sociology*, Vol. II, p. 158.

باب سوم

Ross, E. A., *Social Control*, pp. 376-432.
Spencer, Herbert, *Principles of Sociology*, Part V, Chaps. V-IX.
Ward, Lester, F., *Dynamic Sociology*, Introduction ; *Pure Sociology*, pp. 184-216 ; 544-572.

باب چہارم

Blackmar, F. W., *Federal and State Aid to Higher Education in the United States.*
Mackenzie, J. S., *Social Philosophy*, pp. 351-366.
Ross, E. A., *Social Control*, pp. 291-304.
Ward, Lester F., *Dynamic Sociology*, pp. 540-634.

باب پنجم

Giddings, F. H., *Inductive Sociology*, p. 238.
Kelley, Edmond, *Government or Human Evolution*, pp. 335-360.
Ward, Lester F., *Outlines of Sociology*, pp. 262-293.

باب ششم

Bluntschli, J. K., *The Theory of the State*, Bk. VII.
Kelley, Edmond, *Government or Human Evolution* pp. 211-354.
Mackenzie, John S., *Social Philosophy*, p. 290.
Spencer, Herbert, *Ethics, Justice ; Principles of Sociology*, Vol. III, *Political Insitutions*.
Ward, Lester F., *Dynamic Sociology*, Vol. I, p. 503.
Willoughby, W. W., *The Nature of the State*, pp. 181-231.
Wilson, Woodrow, *The State*, p. 623.

باب ہفتم

Blackmar, F. W., *The Story of Human Progress*.
Ely, R. T., *Studies in the Evolution of Iudustrial Society*, Chap. on Race Improvement.
Giddings, F. H., *Democracy and Empire*.
Kidd, Benj. F , *Western Civilization*.
Mackenzie, J. S., *Social Philosophy*.
Mallock, W. H., *Aristocracy and Evolution*. p. 351.
Schaeffle, August, *Bau und Leben des socialen Korpers*, Vol. IV, pp 152, 442.
Ward, Lester F., *Pshychic Factors in Civilization*, Chap. 34.

حصہ پنجم

باب اول

Devine, Edward T., *Principles of Relief.*
Ely, R. T., *Studies in the Evolution, of Industrial Society,* Chap. on "Race Improvement"
Hunter, Robert, *Problems of Poverty.*
Small and Vincent, *Introduction to the Study of Society.*
Warner, Amos G., *American Charities.*

باب دوم

Fowle, F. W., *The Poor Law.*
Henderson, C. R., *Modern Methods of Charity.*
Hunter, Robert, *Problems of Poverty.*
National Conference of Charities and Corrections, Vol. XVI, p. 24; Vol. XXI, p. 361; Vol. XXII, p. 28.
Richmond, M. E., *The Friendly Visitor.*
Warner, Amos G., *American Charities.*
Ulhorn, Gerhard, *Charity in the Christian Church.*

باب سوم

Charities Review, Vol. II, p. 279; Vol. IV, p. 142; Vol. VII, 922.
Devine, Ed. T., *Principles of Relief.*
Dugdale, R. L., *The Jukes.*
Henderson, C. R., *Modern Methods of Charity.*
Hunter, Robert, *The Problems of Poverty*
Richmond, M. E., *Friendly Visiting,* pp 140-165.
Riis Jacob, *The Children of the Poor; Battling with the Slums*
Report of the Committee of Fifty on Liquor Problems.
Warner, Amos G., *American Charities,* pp. 22-28; 139-161; 95-117.
Wright, Carroll D., *Practical Sociology,* pp. 324-343.

باب چہارم

Ellis, Havelock, *The Criminal*, pp. 124-200 ; 233-329.
Ferri, Enrico, *Criminal Sociology*, pp. 1-143 ; 200-265.
Folks, Homer, *The Care of Destitute, Neglected, and Delinquent Children*, pp. 198-239.
Henderson, C. R., *Dependents, Defectives and Delinquents*, pp. 102-232.
Lombroso, Caesar, *The Female Offender*, pp. 27-35 ; 147-191.
Tallack, William, *Penological and Preventive Principles*, pp. 1-100 , 194-260.
Wines, F. H., *Punishment and Reformation*, pp. 132-229 ; 292.
Macdonald, Arthur, *Criminology*.

باب پنجم

Booth, Charles, *Labor and Life of the People of London*.
Darwin, Charles, *Descent of Man*.
Ely, R T., *Social Progress and Race Improvement in Evolution of Industrial Society*.
Patten, Simon, N., *Heredity and Social Progress*.
Ward, Lester F.. *Pure Sociology*, p. 227.
Warner, Amos G., *American Charities*, pp. 59-117.
Weismann, A. Y. L., *Studies in the Theory of Descent*.

باب ششم

Devine, Ed. T., *Principles of Relief*.
Henderson, C. R., *Modern Methods of Charity*.
Warner, Amos G., *American Charities*.

حصۂ ششم

باب اول و دوم

Blackmar, F. W., *The Study of History, Sociology, and Economics.*
Kellor, Frances, *Experimental Sociology.*
Giddings, F. H., *Inductive Sociology.*
Mayo-Smith, Richmond, *Statistics and Sociology.*
Small, A. W., *Methodology in Sociology.*

حصۂ ہفتم

باب اول

Dunning, W. A., *Political Theories.*
Ely, R. T, *French and German Socialism.*
Small and Vincent, *Introduction to Society.*
Willoughby, W. W., *Ancient Political Theories.*

باب دوم

The American Journal of Sociology, especially articles by Small, Ward, Vincent, Ross, Branford and Ratzenhofer.

فرہنگ مصطلحات

اردو - انگریزی

ا

ابتدائی (غیرمتمدن)	Primitive.
اتحاد عمل، تعاون -	Co-operation.
اثبات خودی (فرد کا) اپنے آپ کو ایک مستقل ہستی سمجھنا اور ظاہر کرنا	Self-assertion.
اجتماع (۱) ایک جگہ جمع ہونا -	Aggregation.
(۲) مل کر معاشرتی زندگی بسر کرنا -	Association.
(۳) معاشرے کے اجزا میں باہم ربط پیدا ہونا -	Integration.
اجتماع للتحفظ - افراد کا اپنی حفاظت کے لئے مل کر زندگی بسر کرنا -	Association for Protection.
اجتماعی	General, social, Collective.
آجر	Employer.
اجیر	Employee.
ادارہ	Institution.
ارادہ (اجتماعی)	Will (geueral, social)
ارتقا - معاشرتی زندگی کا عمرانی قوانین کے ماتحت نشوونما پانا	Evolution.
استخراج - کلی اصولوں سے منفرد واقعات پر حکم لگانا -	Deduction.
استقرا - منفرد مثالوں کے مشاہدے سے کلی نتائج اخذ کرنا -	Induction.
استیثار، خودی: فرد کا اپنے مفاد کو معاشرے کے مفاد پر مقدم رکھنا -	Egoism.
اسم کلی، اسم عام ایک نوع کی کل چیزوں کا نام	General term / Generic term

اشتراکی - Socialist.

اشتراکیت - Socialism.

اشتمال - Communist,

اشتمالیت - Communism

اصطلاح کلی - General term, Generic term.

اصلاح - Reform.

اصلح - وہ فرد یا معاشرہ جو ماحول سے سازگاری کرنے کی زیادہ صلاحیت رکھتا ہو۔ The fittest.

اضطراری (فعل) Impulsive (action) وہ فعل جو بے سوچے سمجھے سرزد ہو۔

اعتبار - Credit.

اعداد و شمار - Statistics.

افادہ - Utility. کسی شئے کا انفرادی یا اجتماعی حیات کے لئے مفید ہونا۔

افادیت - Utilitarianism. یہ نظریہ کہ افادہ بہترین اخلاقی قدر ہے یعنی بہترین شئے یا بہترین عمل وہ ہے جس سے انسان کو بقائے حیات میں مدد ملے۔

افضل - The best. وہ فرد یا معاشرہ جو عمرانی حیثیت سے سب سے بہتر ہو۔

امداد باہمی - Co-operation. صنعت یا تجارت کا وہ اصول جس میں بہت سے لوگ مل کر کام کرتے ہیں اور منافع باہم تقسیم کر لیتے ہیں۔

انتخاب Selection.

انتخاب طبیعی Natural selection. قوانین فطرت کا لوگوں کو زندہ رہنے کے لئے منتخب کرنا جو طبیعی ماحول سے سازگاری رکھتے ہیں۔

انتخاب معاشرتی - Social selection. عمرانیاتی قوانین کا ان لوگوں کو زندہ رہنے یا ترقی کرنے کے لئے منتخب کرنا جو معاشرتی ماحول سے سازگاری رکھتے ہیں۔

انجمن - Association.

انصاف - Justice.

انفرادی - Individual.

انفرادیت - Individualism. (۱) یہ نظریہ کہ فرد کا مفاد معاشرے کے مفاد سے مقدم ہے۔ (۲) یہ نظریہ کہ معاشرہ کوئی مستقل

وجود نہیں رکھتا بلکہ محض افراد کا
مجموعہ ہے۔

ب

Demogogue. بازاری لیڈر

Telic. بامقصد

Systematic. بانظام

Drainage. بدر روی (آب)

Phratry. برادری (چھوٹا قبیلہ)۔

Survival. بقا
(۱) زندگی کا باقی رہنا (۲) نسلیاتی باہمی نزاع میں کسی نسل کا بچ رہنا۔

Survival of the Fittest بقائے اصلح
حیاتیات کا نظریہ کہ تنازع للحیات میں وہ فرد یا نسل باقی رہتی ہے جو طبیعی ماحول سے سازگاری کرنے کی سب سے زیادہ صلاحیت رکھتی ہے۔

Survival of the best. بقائے افضل
عمرانیات کا نظریہ کہ کشمکش حیات میں وہ فرد یا معاشرہ باقی رہتا ہے اور ترقی کرتا ہے جو عمرانی حیثیت سے سب سے بہتر ہے۔

Individual survival. بقائے انفرادی

Immortality (of the Soul) بقائے روح
یہ نظریہ کہ انسانی روح موت کے بعد بھی باقی رہتی ہے

Municipal. بلدی۔

Municipality (۱) بلدیہ

City-state / Polis (۲) شہری ریاست جیسی یونانیوں کے یہاں تھی۔

Intemperance. بے اعتدالی
کثرت شراب نوشی

Promiscuity بے قیدی۔
مرد اور عورت کے تعلقات میں کوئی قید نہ ہونا۔

پ

Complex. پیچیدہ

Production. پیدائش (دولت)

ت

Reformatory. تادیب خانہ۔

Analysis. تجزیہ، تحلیل۔

Reform. تجدید۔

Classification تقسیم	Abstraction تجرید۔ مجرد بنانا۔ مجرد تصور قائم کرنا
Imitation تقلید	Domestic Economy تدبیر منزل۔ (خانگی زندگی کا معاشی اور معاشرتی انتظام)
Conscious imitation تقلید شعوری	Composition ترتیب، ساخت۔
Unconscious imitation تقلید غیر شعوری	Structure ترکیب (۱) ساخت۔
Organization تنظیم	Synthesis (۲)
Organize تنظیم کرنا	Contrast تضاد (۱)
Civilization تمدن	Law of Opposition تضاد کا قانون۔
Culture تہذیب	Co-operation تعاون، اتحاد عمل۔

ث

Positive ثبوتی (سلبی یا منفی کا ضد)	Polygamy تعدد ازدواج، چند زنی
	Polygamous تعدد ازدواج پر عامل یا مبنی، چند زنی۔
	Polyandry تعدد شوہران
	Luxury تعیش، تعیشات۔

ج

Force جبر، تشدد	Idea تصور (۱)
	Conception (۲)
Clan جرگہ	Law of adaptation تطابق کا قانون۔
Instinct جبلت	Penitentiary تعزیر خانہ۔
Instinctive جبلی	Differentiate تفریق۔ معاشرے کا مختلف اعضا یا شعبوں میں تقسیم ہونا
Social organism جسم اجتماعی	
Organism جسم نامی	
Aesthetic جمالی، جمالیاتی	Differential Justice تفریقی انصاف ہر شخص کو اس کی حیثیت و ضرورت کے مطابق حقوق دینا۔
Community جماعت	
Combination جماعت بندی	

جمہور	Demos. People.
جمہوری حکومت	Republic.
جنسی	Sexual.
جنسی جبلت	Sexual instinct.

چ

چند زنی	Polygamous.
چند سری حکومت، عدیدیہ	Oligarchy

ح

حالت مرض	Pathological state
حرکی	Dynamic
حرکیات	Dynamies
حرکی اجتماعیات	Dynamic Sociology
حفظان صحت	Hygiene sanitation

خ

خارجی (۱) نفس انسانی کے باہر	External
(۲) طبیعی	Physical
(۳) نفس انسانی کے باہر محسوس وجود رکھنے والا	Objective
خارجی ماحول دیکھو طبیعی ماحول	
خبر رسانی	Communication
تبادل خیالات، خبر بھیجنا	
خلیّہ	Cell
خودحرکی	Automatic
خودرو	Spontaneous
خیر	Good
خیر اکبر	Greatest Good
خیرات	Charity
خیراتی ادارہ	Charitable institution

د

دائرہ بحث	Scope
دستور	Custom, institution
دستور اساسی	Constitution
دور (۱)	Cycle
(۲)	Circulation
دولت	Wealth
دولت آفرین	Productive

ر

راحت	Happiness
رسم و رواج	Custom

روایات Traditions

ریاست State

ز

زر Money

س

سابقہ Contane'

ساخت Structure, composition

سبط Gentes

سرقبیلہ Patriarch

سرقبیلی Patriarchal
(وہ طرز معاشرت جس میں معاشرہ قبیلوں میں تقسیم ہو اور ہر قبیلے کا سردار وہ شخص ہو جو سب میں معمر اور بزرگ ہے)

سرمایہ Capital

سکونی Static

سکونی عمرانیات Static Sociology

سکونیات Staties

سیرت Charachter

ش

شخصیہ Corporation
جماعت بہ حیثیت ایک شخص کے

شرکت (تجارتی کمپنی) Company

شرکت تجار Trust

شعور Consciousness

شعور اجتماعی Social consciousness

شماری Statistical

شہری Citizen

ص

صارف (دولت) Consumer

صانع Manufacturer

صرف (دولت) Consumption

صوری Formal

صوری تعریف Formal definition

صنعت Industry

صنعتی Industrial

طبعی Normal
اپنی قدرتی یا اصلی حالت پر

طبیعی Physical, natural

ع

عام	General
عامل	Agent
عدم مساوات	Inequality
عدیدیہ	Oligarchy
عقلی	Rational
علت	Cause
علم جرائم	Criminology
علم سکون وحرکت	Mechanics
علوم متعارفہ	Axioms
علمی	Scientific
عمائدی حکومت، اشرافیہ	Aristocracy
عمرانیات	Sociology
عمرانی	Social.Sociologist
عمل (۱)	Aetivity, action
(۲)	Process
عملی	Practical, applied
عملی مفروضہ	Postulate
عوام	Demos, public, people
عوامی	Public, democratic popular
عوامیہ، عوامی حکومت	Democracy
عیب	Vice
	وہ عادت جس سے معاشرے کو نقصان پہنچے، وہ فعل جو اخلاقاً برا ہو مگر قانوناً ممنوع نہ ہو

غ

غائی، بامقصد	Telic
غایت، غائی یا بامقصد ہونا	Telesis
غلام اسامی	Serf
غول پسند	Gregarious
غیر شعوری	Unconscious
غیر معاشرت پسند	Non-social
غیر متمدن، ابتدائی	Primitive

ف

فاعل مختار	Free Agent
فرد	Individual
فرض	Duty
فرضیہ	Hypothesis

ق

قانون امداد مفلسین	Poor Law
قائد	Leader
قبیلہ	Tribe
قدرت	Nature
قدرتی	Natural
قدرتی انصاف	Natural Justice

Force	قوت
Vitality	قوت حیات
Leadership	قیادت

ک

Conduct	کردار
General principle	کلیہ یا کلی اصول
General term	کلی، کلی اسم یا اصطلاح

گ

Pauperism	گداگری
Horde	گروہ (غیر متمدن)
Group	گروہ (متمدن)

م

Environment	ماحول
Physical E.	ماحول طبیعی
Social E.	ماحول معاشرتی
Publicist	ماہر سیاست مُلکی
Self-acting Automatic	متحرک بالذات، خودحرکی
Homogeneous	متحد العناصر، متحد النوع
Civilized	متمدن
Shiftlessness	سٹھاپن
Abstract	مجرد
Motive	محرک
Motive (power)	محرکہ (قوت)
Territory	محروسہ (ایک محدود خطۂ ارض)
Territorial	محروسی
Territorial Government	محروسی حکومت (جس کی فرماں روائی کسی خاص قبیلے یا نسل پر نہیں بلکہ ایک خطے یا ملک کے کل باشندوں پر ہو۔)
Concrete	محسوس
Civic, Civil	مدنی
Civil Society, Law	مدنی معاشرہ قانون
Civitas, Civil State	مدنیہ
Pathology	مرضیات
Social pathology	مرضیات اجتماعی
Well-being	مرفہ الحالی، فلاح
Nucleus, nuclei	مرکزہ
Equality	مساوات
Society	معاشرہ
Social	معاشرتی
Contract	معاہدہ

مطابقت تطابق سازگاری	Adaptation
مظہر (جمع مظاہر)	Phenomenon
(جمع)	Phenomena
مبادلہ	Exchange
مقرون	Concrete
مقصد	Aim
منظم	Systematic
	Organized
منہاج، علمی تحقیق کا طریقہ، ضابطہ	Method
موالی (وہ دوسرے قبیلے کے لوگ) جنھیں کوئی قبیلہ اپنے میں شامل کرلے۔	Adopted members
موالی بنانا	Adoption

ن

ناقص الجسم	Physical defective
ناقص الخلقت	Defective
ناقص العقل	Mental defective
نامی	Organic
نامیاتی	Bioplasm
نخزمایہ	Bioplast, Protoplasm
نراج	Anarchy
حکومت کا قائل نہ ہونا معاشرتی زندگی کے لئے حکومت کی ضرورت نہ سمجھنا	
نراجی جو حکومت کا قائل نہ ہو	Anarchist
نسل	Race
نسیج (معاشرے کی شاخوں اور شعبوں کا نظام)	Tissue
نفسی	Psychichal
نفس اجتماعی	Social mind
نفس انفرادی / نفس ذاتی	Individual mind
نقل وحمل	Transport
نظم	Administration, order,
نظم اجتماعی	Social order,
نظم وضبط	Control,
نظام (۱) منظم حکومت وغیرہ (۲) منظم علمی خیالات وغیرہ	System

و

وجود بقا	Existence
واحدہ (وحدت)	Unit (Unity)

واضع قوانین	Legislator Law-giver
وراثت	Heridity
وضع، صورت	Form
وضع قوانین	Legislation
وضع قوانین کا	Legislative
وسائل نقل و حمل	Means of transport
وفاق	Federation
وفاقی حکومت	Federal Government
وفاقیت	Federalism
وظیفہ معاشرے کے کسی شعبے (عضو) کا مخصوص کام	Function
ہیئت اجتماعی	Social structure

فرہنگ مصطلحات

انگریزی - اردو

A

Abstract	تجرّد
Abstraction	تجرید
Activity	عمل، جد و جہد
Adapt	مطابقت پیدا کرنا - سازگاری کرنا
Adaptation	مطابقت، سازگاری
Law of A.	قانون تطابق
Adoption	موالی بنانا
Adopted members	موالی
Aesthetic	(۱) جمالی (۲) جمالیاتی
Agency / Agent	(۱) عامل (جمع عوامل) (۲) موثر
Aggregation	اجتماع
Aim	مقصد
Altruism	ایثار
Analysis	تحلیل، تجزیہ
Anarchism	نراج
Anarchist	نراجی
Aristocracy	(۱) عمائدی حکومت، اشرافیہ (۲) اہرا
Association	(۱) اجتماع (۲) انجمن
A. for protection	اجتماع للحفظ
Automatic	خود حرکی
Axioms	علوم متعارفہ، بدیہیات

B

Bioplasm, bioplast	تخم مایہ

C

Capital	(۱) سرمایہ (۲) اصل
Cause	علّت

Cell	خلیّہ
Character	سیرت
Citizen	شہری
City-state	بلدیہ
Civic, Civil	مدنی
Civitas, Civil-state	مدنیہ
Clan	جرگہ
Collective	اجتماعی
C. Will	ارادۂ اجتماعی
Combination	جماعت بندی
Communication	خبر رسانی
Communism	اشتمالیت
Communist	اشتمالی
Community	جماعت
Company	شرکت، کمپنی
Complex	پیچیدہ
Composition	ساخت، ترتیب
Concrete	محسوس، مقرون
Concubinage	عورت کو داشتہ یا خانگی کے طور پر رکھنا
Conduct	کردار
Conscious	(۱) شعوری (۲) ذی شعور
Consciousness	شعور
Constitution	(۱) ساخت، ترکیب (۲) دستور اساسی

Consumption	صرف (دولت)
Consumer	صارف (دولت)
Contanct	سابقہ، معاملہ
Contract	معاہدہ
Control	نظم و ضبط
Co-operation	(۱) امداد باہمی (۲) تعاون، اتحاد عمل
Corporation	شخصیہ
Criminology	علم جرائم
Curia	معاشر (معشر کی جمع)

D

Deduction	استخراج
Deductive	استخراجی
Degeneration	تنزل، انحطاط
Defective	ناقص الخلقت
—Mental	ناقص العقل
—Physical	ناقص الجسم
Democracy	عمومیہ، عمومی حکومت (جمہوری حکومت)
Democratic	عمومی، (جمہوری)
Demogogue	بازاری لیڈر
Demos	عموم، جمہور
Development	نشوونما

Differential	تفریقی
D. Justice	تفریقی انصاف
Differentiation	تفریق
Domestic	گھریلو، خانگی، خاندان کے متعلق
D. Economy	تدبیر منزل
Drainage	بدرروی آب
Dynamic	حرکی
D. Sociology	حرکی عمرانیات
Dynamics	حرکیات

E

Ego	نفس انفرادی، نفس ذاتی
Egoism	استیثار، خودی
Effect	معلول
Employer	آجر
Employee	اجیر
Environment	ماحول
Equality	مساوات
Ethnic	نسلی
Ethnology	نسلیات
Evolution	ارتقا
Exchange	مبادلہ
Existence	وجود، بقا
External	خارجی

F

Federalism	(۱) وفاقیت (۲) وفاقی حکومت
Federated	وفاقی، متفقہ
Federation	(۱) وفاق (۲) وفاقی حکومت وفاقی نظام
Form	وضع، صورت، قسم
Formal	(۱) صوری (۲) باضابطہ (۳) رسمی
F. Definition	صوری تعریف
Free will	اختیار
Free agent	فاعل مختار
Force	(۱) قوت (۲) تشدد و جبر
Function	وظیفہ

G

General	(۱) کلّی، عام (۲) اجتماعی
G. Principle	کلی اصول، کلیہ
G. Term	کلی اصطلاح، عام اصطلاح، اسم عام، اسم کلی
G. Will	ارادۂ اجتماعی

Generic term	عام یا کلی اصطلاح، اسم عام، اسم کلی
Generalization	تعمیم کلیہ قائم کرلینا
Gentes	سبط
Good	خیر
Greatest G.	خیر اکبر
Group	(متمدن) گروہ

H

Happiness	راحت
Hedonism	لذتیت
Heridity	وراثت
Heriditary	(۱) ارثی، موروثی (۲) متوارث
Heterogenity	(۱) مختلف النوع ہونا (۲) مختلف العناصر ہونا، تنوع
Heterogenous	(۱) مختلف النوع (۲) مختلف العناصر
Homogeneity	متحد النوع ہونا (۲) متحد العناصر ہونا
Homogeneous	(۱) متحد النوع (۲) متحد العناصر
Horde	غیر متمدن گروہ
Hypothesis	فرضیہ

I

Idea	تصور، خیال
Ideal	(۱) خیالی، ذہنی (۲) عینی (۲) نصب العین، مطمح نظر
I. Standard	عینی معیار
Idealistic	عینی
Imitation	تقلید
Immortality	بقائے روح
Impulsive	اضطراری
Individual	(۱) فرد (۲) انفرادی
I. Survival	بقائے انفرادی
Individualisn	انفرادیت
Indolence	سستی، آرام طلبی
Induction	استقرا
Industry	(۱) صنعت وحرفت (۲) ملک کی مجموعی صنعت اور تجارت (۳) پیشہ
Industrial	صنعتی
Inequality	عدم مساوات
Instinct	جبلت
Instinctive	جبلی
Institution	(۱) ادارہ (۲) رسم وآئین ودستور
Integration	اجتماع
Intemprance	بے اعتدالی، کثرت شراب نوشی

Investigation تحقیق

J

Judgement قوت فیصلہ

Justice انصاف

K

Kinship رشتہ داری

L

Labour (۱) محنت (۲) مزدور پیشہ جماعت

Land tenure قبضۂ اراضی

Law-giver (۱) واضع قوانین، مقنن (۲) شارع

Leader قائد

Leadership قیادت

Legislation وضع قوانین

Legislative وضع قوانین کی، مقننہ

Luxury (۱) تعیش (۲) تعیشات

M

Machinery of Government (۱) نظم حکومت، انتظام حکومت، اداراتِ حکومت

Manufacturer صانع

Mechanics علم سکون و حرکت

Method منہاج، علمی تحقیق کا طریقہ

Monogamic (family) یک زوجی (خاندان) یک زنی ایضاً

Motive محرک

M. Power قوت محرکہ

Municipality بلدیہ

Municipal بلدیے کے متعلق

N

Nature (۱) قدرت، عالم طبیعی، فطرت

Natural قدرتی، فطری

N. Races غیر متمدن نسلیں

N. Justice قدرتی انصاف

Non-social غیر معاشرت پسند

Normal طبعی

Nucleus مرکزہ

Nuclei جمع

O

Objetive خارجی
Ochlocracy حکومت انبوہ
Oligarchy عدیدیہ، چند سری حکومت
Opposition (Law of) تضاد، (کا قانون)
Organic (۱) نامی (۲) نامیاتی
اجسام نامیہ کے متعلق
Organization (۱) تنظیم (۲) ادارہ
Organism جسم نامی (جسم حیوانی یا نباتی)
—Social جسم اجتماعی
Organ عضو
Organize تنظیم کرنا، منظم ہونا

P

Pathotical State حالت مرض
Pathology مرضیانہ
Patriarch سرقبیلہ
Patriarchal سرقبیلی
Pauperism گداگری
Penitentiary تعزیر خانہ
People عوام، جمہور، لوگ
Personality (۱) شخصیہ
(corporation) (۲) شخصیت
Phenomenon مظہر (جمع مظاہر)
(Phenomena (جمع

Philanthrophy (۱) محبت بنی نوع
(۲) خدمت بنی نوع (۳) خیرات
Phratry برادری
Pbysical (۱) طبیعی (۲) جسمانی
P. Environment طبیعی ماحول
Polis (City-state بلدیہ، شہری ریاست
Polyandry تعدد شوہراں
Polygamic چند زوجی، چند زنی
Polygamy تعدد ازواج
Poor law قانون امداد مفلسین
Positive ثبوتی ۔
Postulate عملی مفروضہ
Poverty افلاس
Primitive ابتدائی، غیر متمدن
Production پیدائش دولت
Productive دولت آفریں
Promiscuity بے قیدی
(عورت مرد کے تعلقات میں)
Property ملکیت
Protoplasm تخم مایہ
(protoplasmic germ)
Psychic نفسی
Public (۱) عوام، جمہور (۲) عمومی
Public spirit (۱) روح اجتماعی
(۲) خدمت قومی کا جذبہ

Publicist (۱) ماہر سیاست ملل

R

Race نسل

Rational عقلی، معقول

Reform اصلاح، تجدید

Reformatory تادیب خانہ

Repitition (Law of) (قانون) معاودت

Regulation (۱) نظم و ضبط (۲) ضابطہ

Restraint (۱) ضبط نفس

S

Sanitation حفظان صحت

Science علم صحیح، سائنس

Scientific علمی، علمی اصول پر مبنی

Scope دائرۂ بحث

Selection انتخاب

—Natural طبیعی انتخاب

—Social معاشرتی انتخاب

Self-acting متحرک بالذات، خود حرکی

Self-assertion اثبات خودی

Serf غلام اسامی

Sex جنس

Sexual جنسی

S. Instinct جنسی جبلت

Social (۱) اجتماعی، معاشرتی (۲) عمرانیاتی

S. Consciousness شعور اجتماعی

S. Mind نفس اجتماعی

S. Order نظم اجتماعی

S. Pathology مرضیات اجتماعی / مرضیات معاشرتی

S. Science, (s) علوم اجتماعی / علم اجتماعی

S. Structure (۱) ہیئت اجتماعی (۲) معاشرے کی ساخت

Society (۱) معاشرہ

Socialism اشتراکیت

Socialist اشتراکی

Socialistic اشتراکی۔ اشتراکیت کا

Socialization تعمیر معاشرہ

Soeiology عمرانیات

Sociologist عمرانی، عالم عمرانیات

Sociological عمرانیاتی، عمرانی

Shiftlessness نکماپن

Spontaneous خودرو

State ریاست

Static — سکونی، ساکن
S. Sociology — سکونی عمرانیات
Statics — سکونیات
Statistics — اعداد و شمار
Statistical (method) — (۱) شماری (منہاج)
Structure — (۱) ترکیب ساخت، (۲) ہیئت اجتماعی
Struggle for existence — تنازع للبقاء
Sumptuary (laws) — قوانین مصارف
Survival — بقاء
S. of the fittest — بقائے اصلح
S. of the best — بقائے افضل
Sympathy — ہمدردی
System — نظام
Systematic — منظم بانتظام۔

T

Telic — غائی، بامقصد
Telesis — (۱) غایت، (غائی ہونا) بامقصد ہونا
Territory — محروسہ
Territorial — محروسی
T. Government — محروسی حکومت
Tissue — نسیج
Trade — تجارت
Traditions — روایات
Transport — نقل و حمل
—Means of — وسائل نقل و حمل
Tribe — قبیلہ
Trust — شرکت تجار

U

Undervitalization — قوت حیات کی کمی
Unit — واحدہ
Unity — وحدت
Utility — افادہ
Utilitarianism — افادیت

V

Value — قدر
Vice — عیب
Visible — مرئی
Vitality — قوت حیات

W

مرفہ الحالی، فلاح	Well-being
عالم فطرت، عالم طبیعی	World of nature
ریاست کے زیر نگرانی اشخاص	Ward of the state
دولت	Wealth

صحت نامہ

مبادی عمرانیات

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴	۱	۲	۳	۴
۹	۲۵	پنا	اپنا	۱۴۴	۴	آگے چلکر ایک دوسرے سے حاصل ہوتا ہے	×
۱۹	۱۸	اتنیار	اختیار	"	۱۷	ہے	ہیں
۲۷	۲۵	سمجھے	سمجھیے	۱۵۳	۷	بھی	تھی
۳۱	۲۲	صل	اصل	۱۶۹	۲۵	ہوتی ہیں	ہوتے ہیں
۳۲	۱	برقی	برتی	۱۷۲	۱	ہی	ہے
۴۰	۲۴	پچھے	پچھلے	۱۹۴	۲۵	ڈالر	چند ڈالر
۴۲	۱	ہوتی	ہوئی	"	"	ہوٹے چھوٹے	موٹے چھوٹے
۴۵	۹	س امر	اس امر	۱۹۸	۱۶	تنازع البقا	تنازع للبقا
۹۴	۱۲	ترییب	تربیت	۲۰۵	۱۷	اسی	اس
۹۷	۶	ند	زر	۲۰۶	۲۵	چیزوں	چیزیں
۱۰۲	۱۵	تنازع اللبقا	تنازع للبقا	۲۷۶	۲	قائدہ	فائدہ
۱۰۴	۳	فرض تھا	فرض تھا کہ	۲۹۰	۱۴	کے	×
"	۵	نشو ونما	نشو و نما	۳۰۴	"	لی	کی
۱۰۵	۱	اس کا	اس کے	۳۲۷	۱۵	ڈکیتی	ڈکیتی
"	۸	حل کر	چل کر	۳۳۰	۳	قیدوں	قیدیوں
۱۰۸	۵	نتظام	انتظام	۳۳۱	۳	الینوالس	الینوائس
۱۲۱	۱۳	وقت نظر	وقّتِ نظر	۳۷۲	۱۸	کی آغاز	کے آغاز